

سودی مصائب اور ان کا حل

طبیعی قوانین اور تاریخ کی روشنی میں سود اور کاغذی زر پر ایک تحقیقی پیش کش

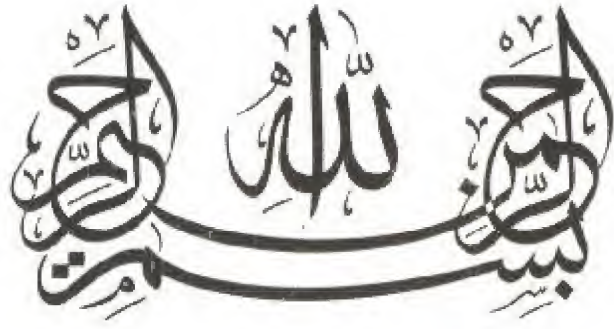
مصنف: —

طارق الدیوانی

مترجم: —

ڈاکٹر منیر احمد





سودی مصائب اور ان کا حل

طبعی توازن اور تاریخ کی روشنی میں سود اور کاغذی زر پر ایک تحقیقی پیش کش

سودی مصائب اور ان کا حل

طبیعی قوانین اور تاریخ کی روشنی میں سود اور کاغذی زر پر ایک تحقیقی پیش کش

مصنف —
طارق الدیوانی

مترجم —
ڈاکٹر منیر احمد

جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ ہیں

| | | |
|---------------|---|---------------------------------------|
| نام کتاب | : | سودی مصائب اور ان کا حل |
| ترجمہ از کتاب | : | The Problem with Interest |
| مصنف | : | طارق الدیوانی |
| مترجم | : | ڈاکٹر منیر احمد |
| طبع اول | : | شعبان 1432ھ بمطابق جولائی 2011ء |
| تعداد | : | 500 |
| ناشر | : | ڈاکٹر منیر احمد |
| | | 6B-1۔ ایجوکیشن ٹاؤن۔ وحدت روڈ۔ لاہور۔ |
| | | فون: 042-3541 7278 |

حاصل رابطہ : 042-3543 4909 - 0333-4568718

قیمت : 295 روپے

توتیل

| | | |
|------|-----------------------------|---|
| vii | تقریظ | |
| ix | عرض مترجم | |
| xi | اظہار تشکر | |
| xiii | دیباچہ | |
| 1 | سود اور طبعی نظام | 1 |
| 39 | زر کی پیداوار | 2 |
| 85 | کرنی کا کھیل | 3 |
| 113 | تخلیق دولت اور انتقال دولت | 4 |
| 137 | قدری تخمینے | 5 |
| 155 | تجارت یا سود | 6 |
| 199 | اسلام کے تحت بینکاری اور زر | 7 |
| 221 | حاصل کلام | 8 |



تقریظ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ الصُّطَفَى

آمَّا بَعْدُ!

ماہر معاشیات طارق الدیوانی صاحب کی کتاب "The Problem With Interest" کا اردو ترجمہ ڈاکٹر منیر احمد صاحب نے جس محنت اور کاوش سے کیا ہے وہ واقعی قابل رشک ہے۔ میں نے کتاب کے کچھ صفحات کو دیکھا۔ ماشاء اللہ خوب نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ خصوصاً کائنات کے فطری نظام سے سود کے کراؤ کو اجاگر کرنے کا انداز اپنی مثال آپ ہے۔ طلائی زر کی ضرورت اور اہمیت کو اظہر من الشمس واضح کیا گیا ہے۔

دعا ہے کہ پ تعالیٰ اس کاوش کو نافع اور مفید بنائیں، آمین۔



مولانا مفتی محمد خالد برہان
استاذ التفسیر والحدیث
دارالعلوم مدنیہ۔ ملتان روڈ۔ لاہور

۸ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
۱۱ جون ۲۰۱۱ء

”سودی مصائب اور ان کا حل“ ایک مفید کتاب ہے۔ روایتی بینکوں نے کیسے جنم لیا اور سود نے کاغذی زر پیدا کرنے میں کیا کردار ادا کیا اس حقیقت کو بڑے شفاف اور موثر طریقے سے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ معاشیات کے طالب علم کو کاغذی زر کی قباحتوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی فائدہ مند ہوگا۔ نیز سودی نظام کی بیچ در بیچ مکارانہ پالیسیوں کو سمجھنے اور ان سے ملکی معیشت کو باہر نکالنے میں مدد ملے گی۔

مفتی شاہد عبید
جامعہ اشرفیہ۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور
۱۱ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ

عرض مترجم

چند سال ہوئے میں امریکہ میں مقیم تھا۔ وہاں انٹرنیٹ کے ذریعے انگلینڈ سے شائع کردہ انگریزی میں لکھی گئی کتاب "The Problem with Interest" کا تعارف ہوا۔ تعارفی نوٹ میں کتاب کی دیگر خصوصیات کے علاوہ یہ بھی درج تھا کہ مصنف کاغذی زر کے بجائے طلائی زر کے حامی ہیں۔ یہ میرے دل کی آواز تھی چنانچہ میں نے انہیں ای میل بھیجی جس میں میں نے لکھا کہ مجھے آپ کی کتاب پڑھنے کا شوق ہے آپ مجھے اس کا ایک عدد نسخہ میرے پاکستان کے ایڈریس پر ارسال کر کے مشکور فرمائیں۔ انہوں نے نہایت شفقت سے مجھے ایک عدد نسخہ تحفۃً ارسال کر دیا۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ مصنف جدید معیشت اور اسلامی معاشیات دونوں کا عمیق علم رکھتے ہیں۔ انہوں نے قدیم طلائی زر سے لے کر آج کل کے کاغذی زر کی مختلف اقسام تک کے تمام ارتقائی مراحل پر سیر حاصل تبصرہ کر کے بہت واضح انداز میں قارئین تک یہ پیغام پہنچایا ہے کہ رائج الوقت حقیقی قدر سے خالی کاغذی زر کی تمام تر قباحتوں کی پشت پر سود ہی کا عنصر کا فرمایا ہے۔ اگر طلائی زر کو رائج کیا جائے تو ایک طرف بینکاری کا سود غائب ہو جائے گا اور دوسری طرف معیشت میں انسان کا پیدا کردہ اتار چڑھاؤ ختم ہو جائیگا۔ کتاب کے آخر میں غیر سودی بینکاری کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ اسلامی بینکاری کے رائج کردہ طریقوں اور کاروائیوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رائج الوقت اسلامی بینکاری کے بعض طریقے اور کاروائیاں روایتی بینکاری کے طریقوں اور کاروائیوں سے مشابہہ ہیں۔ اگرچہ تکنیکی چکروں میں ڈال کر انہیں اسلامی بنانے کی کوشش تو کی جاتی ہے مگر درحقیقت وہ اسلام کی روح کے منافی ہیں۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت یہ ضمانت دینا کہ مصنف کے خیالات کی مکمل طور پر ترجمانی کر دی گئی ہے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میری کوشش تھی کہ کتاب کا اردو زبان

میں ایسا ترجمہ پیش کر دوں کہ اگر کوئی اس کا واپس انگریزی میں ترجمہ کرے تو اصل کتاب جیسی نہیں تو کم از کم اس سے ملتی جلتی کتاب سامنے آ سکے۔ یہ کتاب چونکہ معیشت کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کرتی ہے مجھے پڑھ کر یہ شوق پیدا ہوا کہ اس کے اردو ترجمہ کے ذریعہ مصنف کے خیالات اردو پڑھنے والے ان مسلمان بھائیوں تک پہنچاؤں جو انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ میری سعی قبول فرمائیں، آمین۔

قارئین کے ہاتھوں میں یہ تحریر مذکورہ بالا کتاب کے 2003ء کے ایڈیشن کا اردو ترجمہ ہے۔
www.theproblemwithinterest.com پر انٹرنیٹ کے ذریعے کتاب کی اصل معلومات کے لئے رجوع کر سکتے ہیں۔

پوری احتیاط کے باوجود ترجمے کا اغلاط سے مکمل طور پر پاک ہونے کا میں دعویٰ نہیں کرتا۔
 قارئین کی طرف سے ان کی نشاندہی باعث مسرت ہوگی۔ کتاب میں جملہ خوبیاں مصنف سے منسوب کریں اور ترجمہ کی تمام خامیوں کی نسبت احقر کی طرف کریں۔



اظہار تشکر

اس ترجمہ پر جناب پروفیسر محمد ایوب منیر صاحب نے ابتدائی نظر ثانی فرما کر اس میں اردو کی بعض غلطیوں کی درستی فرمائی۔ اُس کے بعد ماہر معاشیات جناب ڈاکٹر سلمان خان صاحب نے مکمل مسودے کا بغور جائزہ لے کر اپنے نہایت ہی مفید مشوروں سے نوازا۔ شبیر احمد صاحب نے کمپوزنگ کا کام مکمل کیا اور مبشر مختار صاحب نے پروف ریڈنگ میں میری مدد کی۔ میں ان سب حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو اس کی افادیت میں اضافے کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

ڈاکٹر منیر احمد

042 - 3541 7278

دیباچہ

ایک زمانہ تھا کہ جب یورپی اطباء مایٹو لیا کے مریضوں کیلئے پارہ تجویز کیا کرتے تھے۔ دوسرے امراض میں جونک کا استعمال، مریض کو غیر ہوا دار کمرے میں مجبوس کرنا اور زخموں کو پیشاب کیساتھ دھونا شامل تھے۔ اس دوران آتشک لا علاج رہا، دانت سیاہ ہو جاتے، بخار خراب تر ہو جاتا، معذور بستر پر لیٹے لیٹے پھوڑا سا بن جاتے اور جلد پیشاب کی دھلائی سے بدبو چھوڑ دیتی۔ مصائب کا ایک جھنگھا تھا جو عوطائی ڈاکٹروں (Quacks) کے جھر مٹ نے مزید تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ ان اطباء نے اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لیے تاویلات کی ایسی سائنس بنا رکھی تھی جس پر عام آدمی بحث کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا اور اس طرح قدامت پسندانہ طریقہ علاج جاری رہا۔ ہسپتالوں میں صاف مرہم پٹی تجویز کرنے پر اس متکبرانہ نام نہاد دانشورانہ نظام نے پاسبچر (Pasteur) کا مذاق اڑایا۔ اخبارات میں ایسے کارٹون چھاپے گئے جس میں اسے ہوا میں جراثیم کش پھوار چھڑکتے دکھایا گیا۔ جب کوپرنیکس (Copernicus) اور گلیلیو (Galileo) نے اپنے وقت کی سائنس پر اعتراضات کئے تو انہیں بھی رائج الوقت آراء سے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ جب کلیسا کو اپنی غلط رائے سے رجوع کیلئے کہا گیا تو اس نے اپنی من پسند آراء اور حقیقت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو اگرچہ نظر انداز تو کر دیا مگر زمین کے گول ہونے اور کائنات کے مرکز سے دور ہونے کا تصور بڑھتا ہی گیا۔

قدامت پسندانہ تصورات اکثر غلط مگر قابل نفوذ ثابت ہوئے ہیں اور رائج شدہ تصورات حقائق کے برعکس ہوتے ہوئے بھی قائم رہنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ میری رائے میں یورپی معاشیات پر مباحث کی حالت بھی یہی ہے۔ کبھی طالب علم یہ سوال کیا کرتا تھا کہ ”کیا سود کی شرح بڑھانے سے افراط زر کم ہوتی ہے؟“ اب وہ یہ پوچھتا ہے کہ ”افراط زر کو کم کرنے کے لئے سود کی شرح کتنی بڑھانی چاہیے؟“۔ یہ ہیں رائج شدہ جدید معاشیات کے اپنے تئیں خوش کن مفروضے۔

بہت سی ترقی پذیر اقوام اس علاج کی طرف گامزن ہیں جو آج کل متفقہ طور پر تجویز کیا جاتا ہے۔ مگر جھٹکوں سے علاج کا طریقہ اور آئی ایم ایف (IMF) کے کڑے نسخے عطائی ڈاکٹروں کے علاج کی تکلیف دہ یاد تازہ کرتے ہیں جن میں ضمنی نقصانات شدید اور فوائد مشکوک ہیں۔ بعض اوقات تو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اگر ان کے علاوہ کسی اور معاشی نظام کو اپنایا گیا تو حالات بدتر ہوں گے جبکہ ایسے یقین کو جانچنا ممکن ہی نہیں کیونکہ ماضی کے ساتھ ان کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔ دریں اثناء ان کے الوقت معاشیات اپنی گرفت بڑھاتی جا رہی ہے اور معاشرہ آلودگی، کاروباری مکررات (Business Cycles)، افراط زر اور دولت کی تقسیم میں عدم توازن کو معاشی زندگی کے ناگزیر حقائق تسلیم کرنے پر تیزی سے آمادہ ہو رہا ہے۔

اس کتاب کی مرکزی توجہ سود اور انسانیت کے اوپر اسکے مرتب کردہ اثرات پر ہے۔ یہ وہ اثرات ہیں جو دائن (Lender) اور مدیون (Borrower) کے مابین تعلق سے زیادہ گہرے ہیں جن کو مالی پیمانوں سے جانچنا ممکن ہے۔ اگلے صفحات میں یہ دلائل دیئے جائیں گے کہ دنیا سود کے زیر بار آچکی ہے اور ایسے لوگوں کی غلامی قبول کر چکی ہے جو اس کا جواز پیش کر کے اور دنیا کو گمراہ کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سود کے موضوع پر پہلے سے موجود حقائق کے انبار میں اضافہ کرنا رقم الحروف (مصنف) کا کام نہیں۔ ایسے انبار کو پڑھنے کے لئے تو پوری زندگی درکار ہے۔ ضرورت یہ نہیں کہ مزید حقائق کا سراغ لگایا جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ معلوم شدہ حقائق کو مزید سمجھا جائے۔

ایک مسئلہ جو جدید ماہر معاشیات کو درپیش ہے وہ اس نظام کی گونا گوں پیچیدگی ہے جس نظام کو وہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہ پیچیدگی نظام کا ماڈل (Model) یعنی نمونہ پیش کرنے کی کوشش کو انتہائی مشکل بنادیتی ہے۔ اور بغیر کسی نمونے کے اس کے متعلق پیشگوئی کی باضابطہ کوشش نہیں کی جاسکتی۔ معاشی ماڈل تیار کرنے کے لئے ماہر معاشیات کو معاشی نظام کے ان تمام متغیرات (Variables) کی ابتدائی مقداروں اور ان کا آپس میں تعلق معلوم کرنا لازمی ہے جن پر نظام مبنی ہوتا ہے۔ ماہر موسمیات ایسے کام کی پیچیدگی کو جانتا ہے۔ ماہر موسمیات کا تعلق تو صحیح صحیح قابل پیمائش طبیعی قوانین کے ساتھ ہے جبکہ ماہر معاشیات کا تعلق غیر یقینی اور ناقابل پیمائش مجوزات کے ساتھ ہے اور ماہر موسمیات تو ایک ہفتہ سے زیادہ موسمی

تبدیلیوں کی پشتگونی میں بھی تردد کرتا ہے مگر ماہر معاشیات اپنا دائرہ نظر کئی سالوں تک لے جانے کی جسارت کر لیتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات چھوٹے دورانیے کی معاشی پشتگونیاں کافی حد تک درست نکلتی ہیں مگر زیادہ عرصہ کی پشتگونیاں تو اکثر غلط ہوتی ہیں۔

ماہر معاشیات کے لئے بد نظمی کے شکار نظام کو سمجھنا بہت پیچیدہ ہے چہ جائیکہ اس کا کمپیوٹر ماڈل تیار کیا جائے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی اگر معاشی پشتگونی کرنے والے معاشی تبدیلی کی مقدار تو کیا صرف اس کی قابل اعتبار سمت کا ہی صحیح تعین کر سکیں۔ جبکہ ماہر طبیعیات، ڈاکٹر اور کیمیادان اپنے اپنے دائرہ کار میں ہونے والے واقعات کی پشتگونی کچھ کامیابی کیساتھ کر سکتے ہیں کوئی بھی ایسا ماہر معاشیات نہیں جس کی معاشی ماڈل تیار کرنے کی مساعی قابل اعتبار ہوں۔ میں (مصنف) معاشی پشتگونی کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ان میں کافی لوگ نہایت قابل بھی ہیں۔ میں ان کی مساعی میں کامیابی کیلئے دعا گو ہوں۔ میں صرف اپنی سمت میں دلائل دینے کے لئے آگے بڑھوں گا۔

اکثر ہم سنتے رہتے ہیں کہ مذہب کو سائنس میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے مگر میں کہتا ہوں کہ سائنس کو مذہب میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خدا کہتا ہے کہ سود حرام ہے تو ہم اختلاف کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ یہ بھی درست نہیں کہ مسلمان جدید معاشیات میں دخل انداز نہ ہوں کیونکہ دوسرے مذاہب والے واضح طور پر پہلے ہی ایسا کر چکے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ لوگ رکارڈو (Ricardo) مارکس (Marx) کینز (Keynes) اور فریڈمین (Friedman) کو یہودی ماہر معاشیات نہیں کہتے بلکہ انہیں کلاسیزم (Classicism) مارکسزم (Marxism) کینزیزم (Keynesianism) اور مانیٹریزم (Monetarism) کا نام دیتے ہیں۔ مگر ہم تو اپنے شعبے میں جو کچھ ہم ہیں وہی کہلائیں گے اور واضح طور بتلائیں گے کہ ہم دنیا کے لئے کیا کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں پہلے چار ابواب میں رائج الوقت معاشیات کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ آخری تین ابواب اسلامی نکتہ نگاہ سے اصول و ضوابط کی مباحث کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اسلام کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جب ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی کی اساس انصاف پر قائم ہوگی تو ویسے ہی ان کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے اثرات سامنے آئیں گے۔ بیشک ہم ان

نتائج سے مطمئن نہ ہوں مگر وہ نتائج کم از کم دوسرے نظام ہائے کار سے بہتر ہوں گے۔

میرے (مصنف) کے خیال میں اسلامی مذہب کی معاشیات غالباً آزاد سرمایہ دارانہ نظام کیلئے آخری اہم چیلنج ہے۔ اگرچہ اسلامی دنیا اس حالت میں نہیں کہ مغرب کو اس بات کا لیکچر دے سکے کہ معاشی کامیابی کیسے ممکن ہے تاہم میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اپنی معلومات پیش کر کے کافی حد تک ایک اہم تحریر ثبت کر رہا ہوں۔

طارق الدیوانی

(Tarek El Diwany)



سود اور طبعی نظام (Interest and the Physical System)

اینٹراپی کا لفظ کسی طبعی نظام میں بد نظمی کی مقدار بیان کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ارد گرد کی دنیا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسکے طبعی نظام بگاڑ کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر ان کی بہتر حالت برقرار رکھنے کیلئے توانائی صرف نہ کی جائے تو پھل گل سڑ جاتا ہے اور عمارت شکستہ ہو جاتی ہے۔ طبعی دنیا کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ مرکب تخفیف (Compound Decrement) کا راستہ اختیار کرتی ہے مگر کبھی صفر تک نہیں پہنچتی جبکہ سودی قرضے اکثر اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ وہ لا انتہایت کی طرف مرکب اضافے (Compound Increment) کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس باب میں سود اور اینٹراپی کا موازنہ کیا گیا ہے اور سود کے قوانین اور فطرت کے قوانین کا تضاد اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ صنعت کی سرمایہ کاری میں سود کے استعمال سے قلیل نظری (Short-Termism)، آلودگی اور وسائل کی معدومیت کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

اینٹراپی کی اہمیت (The Importance of Entropy)

جب ماہرین طبیعیات کہتے ہیں کہ اینٹراپی بڑھ رہی ہے تو وہ طبعی نظاموں کے غیر معمولی بگاڑ کا رجحان بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ فریڈرک سوڈی (Frederick Soddy) نے 1926 میں طبیعیات کے قانون (جو تھر موڈائی نامکس (Thermodynamics) کے قوانین کی اساس ہے) کو دولت کے طبعی

طولی و عرض (Physical Dimension) کیلئے اپنی تحریر ”دولت، مجازی دولت اور قرض“ (Wealth, Virtual Wealth and Debt) میں استعمال کیا اور دوسروں نے خصوصاً نکولس جارجیسکو روجن (Nicolas Georgescu-Roegen) نے اس کو اپنی تحریر ”The Entrophy and the Economic Process, 1971“ میں تفصیل تک پہنچایا۔ یہ تجزیے معاشیات میں کافی معنی خیز ہیں۔

تھرموڈائنامکس کے پہلے قانون کے مطابق کسی تھرموڈائنامک نظام کی کل توانائی کی مقدار کی سطح برقرار رہتی ہے اگرچہ اسکی شکل ایک سے دوسری صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ توانائی کے بقائے دوام کا قانون (Principle of Conservation of Energy) ہے۔ تھرموڈائنامکس کے دوسرے قانون کے مطابق حرارت خود بخود کم ٹمپرچر یعنی کم گرمائی والے جسم سے زیادہ گرمائی والے جسم کی طرف کبھی منتقل نہیں ہو سکتی۔ تھرموڈائنامکس کے ان دونوں قوانین کو اکٹھا کرنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی بند نظام میں کل توانائی کی مقدار وقت گزرنے کیساتھ ساتھ اپنی سطح پر قائم رہتی ہے صرف اس کی تقسیم زیادہ یکساں ہو جاتی ہے۔ یہ ہے مختصر طور پر اینٹراپی کا نظام۔

اس کی آسان مثال دھات کے ایک ڈبے سے دی جاسکتی ہے جو کمرے کی گرمائی پر ہو اور اس میں ایک دھات کا سودر بے سینٹی گریڈ کی گرمائی کا گرم ٹکڑا ڈال دیا جائے اور اگر ڈبے کی بیرونی ماحول سے غیر موصل کاری (Insulate) کر دی جائے تو کچھ وقت بعد ڈبے اور اندرونی ٹکڑے کی اوسط گرمائی تو اپنی پہلی سطح پر برقرار ہوگی لیکن دونوں کی گرمائی میں فرق کم ہو جائے گا۔ آخر کار دونوں کی گرمائی کا فرق بالکل مٹ جائے گا۔ دھات کا ٹکڑا جو اتنا گرم تھا کہ پانی کو ابال سکے اب اس قابل نہیں رہا۔ اس کی صلاحیت عمل (مثلاً پانی گرم کرنے کی صلاحیت) کم ہو گئی ہے اگرچہ ڈبے اور ٹکڑے پر مشتمل نظام کی کل توانائی کی مقدار تبدیل نہیں ہوئی۔ کام کرنے کی صلاحیت میں کمی اینٹراپی سلسلے (Entropy Process) کی بنیادی خصوصیت ہے۔

تھرموڈائنامکس کے قوانین کی حدود کے اندر اینٹراپی سلسلے کو کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی بہت آزادی ہے۔ اینٹراپی میں اضافہ مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اینٹراپی سلسلے کو غیر معین (Indeterminate) کہا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ اینٹراپی بڑھتی ہے۔ یہ ناقابل امتناع

یا ناقابل تنسیخ (Irrevocable) سلسلہ ہے یعنی اس کو روکا نہیں جاسکتا اور یہ زوال یا بوسیدگی (Decay) کو ظاہر کرتا ہے۔

اینٹراپی کے اضافے کو روکا نہ جاسکنے کا مطلب یہ نہیں کہ اینٹراپی کے اثرات کو پلٹا (Reverse) نہیں جاسکتا۔ ایک آزاد طبعی نظام میں اینٹراپی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو سکتی ہے۔ مثلاً پودے ایک آزاد نظام ہیں۔ یہ بیرونی طبعی نظام (جو کہ ارد گرد کا ماحول ہے) سے توانائی اور غذا پا کر اسے جذب (صرف) کر لیتے ہیں اور اس سے اعلیٰ درجے کا نظام یعنی پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح سے عمارات کی دیکھ بھال کرنے والا عملہ توانائی اور میٹریل استعمال کر کے عمارات کو اچھی حالت میں رکھتا ہے۔ تاہم بیرونی نظام سے توانائی اور میٹریل کے استعمال کرنے سے بیرونی طبعی نظام کی اینٹراپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اندرونی اور بیرونی نظاموں کو ملا کر دیکھا جائے تو حاصل شدہ اینٹراپی کی مقدار بڑھتی ہی جائے گی۔ لہذا اینٹراپی کا قانون اپنی جگہ درست ہے۔

اگرچہ اینٹراپی ہمیشہ بڑھتی ہے لیکن اس میں اضافے کی شرح مختلف نظاموں میں مختلف ہوتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں میں اینٹراپی میں اضافے کی شرح بمقابلہ عمارات زیادہ ہے جبکہ عمارات میں یہ شرح زمین پر پائے جانے والی معدنیات کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پھل چند دنوں میں ہی گل مڑ جاتے ہیں جبکہ عمارات کی دیکھ بھال نہ بھی کی جائے پھر بھی کئی سال بعد بوسیدہ ہوتی ہیں زمین پر معدنیات میں ہزاروں بعد تک بھی بہت کم ہوتا ہے۔

پہلی بار شرودنگر (Schrodinger) نے تجویز کیا کہ زندگی کی حامل اشیاء اپنے ارد گرد کے کم اینٹراپی والے ماحول سے اینٹراپی صرف کر کے اپنی اصلی حالت کو برقرار رکھتی ہیں اور اس ماحول کی کم اینٹراپی کو زیادہ اینٹراپی میں تبدیل کرتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ طبعی نظام میں اوسط اینٹراپی ہمیشہ بڑھتی ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی افعال کے نتیجے میں طبعی ماحول کے اندر کچھ اجزاء کی اینٹراپی کی سطح کم رکھنے کیلئے دوسرے اجزاء کی اینٹراپی میں لازمی طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ 25 مارچ 1995ء کے روزنامہ گارڈین (Guardian) کے پہلے صفحے پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے۔

”عالمی حرارتی اضافہ (Global Warming) اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کس تیزی سے اپنے وسائل فضول ضائع کر رہی ہے

اور نتیجتاً ماحولیاتی توازن جولاہوں پر سے قائم تھا کس تیزی سے بگڑ رہا ہے۔ سمجھدگی سے کوئی بھی افکار نہیں کر سکتا کہ جس شرح سے توانائی صرف ہو رہی ہے انسان پہلے کبھی اس شرح تک نہیں پہنچا۔ سوال صرف یہ ہے اور یہ بہت اہم سوال ہے کہ کیا اسے روکا جاسکتا ہے اور کیسے؟“

جار جیسکو روجن (Georgescu-Roegen) ہمیں بتلاتا ہے کہ اینٹراپی کا عمل معاشیاتی عمل کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اپنے معاشیاتی تجزیوں میں اگر ہم اسے نظر انداز کر دیتے ہیں تو ہم ابتدا سے قبل ہی ناکامی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہمارے معاشی افعال ایک بند نظام کے اندر ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ عالمی سطح پر بھی دیکھا جائے تو ہم روزانہ سورج سے کم اینٹراپی والی توانائی اور وہ بھی مفت حاصل کرتے ہیں۔ اس حقیقت نے ہماری زمین کو قیمتی، زرخیز اور رہنے کے قابل بنایا ہے مگر یہ ہمارے معاشی ماڈلوں میں شامل نہیں۔

ابتدائی طبیعیات کے روایتی ماڈل، جونیوٹن (Newton) نے تیار کئے اور مشینی دنیا اور مشینی نظاموں میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہوئے، وہ ماڈل ماہرین معاشیات کے اپنے شعبہ میں مشینی طرز کی وضاحتیں ڈھونڈنے کا محرک بنے۔ آج کل یہ مشینی تصورات معاشیاتی تجزیوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن مشینی افعال تو فطری طور پر قابلِ امتناع (Revocable) ہیں۔ جبکہ اینٹراپی کے قانون کے مطابق اینٹراپی کا ناقابلِ امتناع (Irrevocable) بہاؤ کم اینٹراپی والے وسائل سے زیادہ اینٹراپی والے فضلہ (Waste) کی طرف ہوتا ہے۔ یہ یکطرفہ بہاؤ معاشی سلسلوں کے قابلِ امتناع (Revocable) ہونے کے تصور سے اختلاف رکھتا ہے اور چند جدید ماہرین معاشیات کے ’مالی وسائل کے گردش بہاؤ‘ (Circular Flow of Funds) جیسے ماڈلوں سے نمایاں طور پر متصادم ہے۔ معاشیاتی نظام کو جدید اندازِ فکر بحیثیت ایک مشینی نظام دیکھتی ہے جس میں تبدیلیاں قابلِ امتناع ہوتی ہیں یا کسی فارمولے کے مطابق ہوتی ہیں جہاں سلسلہ معین (Determinate) طور پر چلتا ہے۔ اس اندازِ فکر پر تنقید کرتے ہوئے جار جیسکو روجن (Georgescu-Roegen) ہمیں الفرید مارشل (Alfred Marshall) کا تبصرہ یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنی تحریر معاشیاتی ضوابط (Principles of Economics) میں کیا ہے کہ میکانکس (Mechanics) کے بجائے ماہرین معاشیات کا درست قبلہ علم حیات ہے۔

یورپ میں تھر موڈائی نامکس (Thermodynamics) کے تصورات غالباً سٹیم انجن کی استعدادی قوت (Efficiency) میں کارنو (Carnot) کی بحث کے بعد نمودار ہوئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مشینی دور تھا اس بات پر حیرانی نہ ہوگی کہ چند سالوں میں تھر موڈائی نامکس کے نئے نظریات کی ترجمانی اس وقت کے میکاکی نظریات (Mechanical Theories) کی مدد سے شماریات (Statistics) کی شکل میں کی گئی۔ جارجیسکو روجن اس نقطہ نظر اور اس کے خالق لڈوگ بولٹز مین (Ludwig Boltzman) کا بھی ناقد ہے۔ بولٹز مین کی شماریاتی تھر موڈائی نامکس (Statistical Thermodynamics) کی توجہ اینٹراپی کی باریکیوں پر مرکوز ہے۔ جب کوئی نظام ایسی حالت میں چلا جاتا ہے جہاں اینٹراپی میں تبدیلی نہیں ہوتی تو اسے ”اس اینٹراپک“ (Isentropic) کہتے ہیں۔ یہ حالت ایسے توازن کو ظاہر کرتی ہے جس حالت میں بگاڑ اپنی بلند ترین سطح پر ہوتا ہے اور بولٹز مین کے مطابق یہ حالت ذرات (Molecules) کی ایسی تقسیم ظاہر کرتی ہے جس کا امکان سب سے زیادہ ہو۔

اگر امکان (Probability) کا اینٹراپی کے سلسلے میں دخل ہو تو ہر وقت یہ امکان کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوگا کہ اینٹراپی میں کمی آئے گی۔ اس امکانی نظریے کے تحت بولٹز مین کی تشریح کے مطابق نامیاتی اجسام (Living Organisms) کی پیدائش و افزائش کا عمل کم از کم ابتدا میں باوجود بگاڑ کی طرف رجحان کے محض امکان کی وجہ سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں نظم میں اضافہ قانون امکانیت (Law of Probability) کے تحت ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

لیکن مشاہدہ کے مطابق کیا حقیقت یہ نہیں کہ نامیاتی اشیاء کا عمل ایک مقصد کے تحت اپنے ماحول کے نظم کو بڑھاتا ہے؟ کیا انسان کارہنے کے لئے آرام دہ مکان بنانا محض اتفاقی امر ہے۔ اینٹراپی کی اس بحث پر جارجیسکو روجن یوں تبصرہ کرتا ہے:

”شماریاتی تھر موڈائی نامکس (Statistical Thermodynamics) کسی بامقصد عمل کے امکان کی مکمل نفی کرتی ہے کیونکہ اس کے مطابق ہر کام میکس کے قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔“

(Georgescu-Roegen, N., "The Entropy Law of Economic Process", 1971 -P-194)

زندگی کے حامل اجسام چونکہ اپنا نظم قائم رکھنے یا اسے بڑھانے کیلئے کسی مقصد کے تحت توانائی صرف کرتے ہیں اس لئے یہ ایک فطری سوال ابھرتا ہے کہ یہ مقصد کس طرح پیدا ہوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نظم

میں اضافہ اینٹراپی میں اضافہ کے قانون کے ذریعہ پیدا ہو گیا ہو جو بالعموم بگاڑ کا تقاضہ کرتا ہے۔ زندگی کا گردشی نظریہ کہتا ہے کہ زندگی کا وجود اسے اپنے آپ کو بار بار پیدا کرنے کی وجہ سے ہے۔ مگر بہت سے ایسے لوگ جو اس نظریہ سے مطمئن نہیں ان کے لئے صرف خدا کا تصور ہی پھر مذکورہ بالا مقصد کے سوال کا قطعی جواب دیتا ہے۔ جارحیسکو روجن کے خیال میں دنیاوی سطح پر انسان کا مقصد صرف ایسی اشیاء کی تخلیق ہے جن سے وہ زندگی کا لطف اٹھا سکے۔ ایسی اشیاء کو ہم بالعموم دولت کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ اشیاء ہیں جو ذخیرہ کی جاسکیں جب تک کہ بڑھتی ہوئی اینٹراپی ان کی قدر کم نہ کر دے (مقابلہ اس لطف کے جو ذخیرہ شدہ دولت سے حاصل ہوتا ہے جو بذات خود ذخیرہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے گرم پانی تو ٹینکی میں ذخیرہ کیا جاسکتا ہے مگر اس کے ذریعہ گرم گرم غسل کا لطف کہیں ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مگر شاید صرف یادوں میں!)

انسان کم اینٹراپی والے قابل حصول وسائل سے کئی شکلوں میں دولت مرتب کر سکتا ہے مگر جارحیسکو روجن کہتا ہے کہ ایسے وسائل کو صرف کرنے کی قیمت اکثر انتہائی ناخوشگوار ہوتی ہے چونکہ انسان کے معاشیاتی عمل سے زندگی کے لطف کے حصول کے ساتھ ساتھ کم اینٹراپی والے وسائل زیادہ اینٹراپی والے فضلہ (Waste) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان دلائل کی روشنی میں جدید انسان (Modern Man) کیلئے ماحولیاتی انتخاب کی صحیح حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔

زمین پر سورج کی روشنی کے اثر کو لیجئے۔ سادہ الفاظ میں یہ بلا قیمت توانائی کسی نہ کسی شکل میں زندگی کی لطف اندوزی کو برقرار رکھنے کیلئے صرف ہوتی ہے۔ مثلاً یہ پچھلے ہزاروں برس کے سورج کی روشنی ہے جس کی وجہ سے کوئلہ بنا جس کو جلا کر انسان لطف اندوز ہو رہا ہے اور یہ حال کے سورج کی روشنی ہے جس کی وجہ سے وہ فصلیں اگاتا ہے اور موسم بدلتے ہیں۔ اگر انسانی معاشرہ اپنے لطف کی سطح کو بلند کرنا چاہے تو وہ یا تو ماضی کے سورج کی روشنی زیادہ مقدار میں صرف کر سکتا ہے یا آج کے سورج کی روشنی کو زیادہ موثر طریقے سے استعمال کر سکتا ہے۔ جو بھی طریقہ استعمال کیا جائے اینٹراپی بڑھتی ہی جائے گی اور اس کے اثرات مختلف جگہوں پر پائے جائیں گے۔ سورج ہائیڈروجن کو جو ہیلیم (Helium) میں تبدیل کر رہا ہے اس کی فکر تو زمین والے کم ہی کر رہے ہیں مگر زیادہ کو فکر عالمی حرارتی

اضافہ کی ہے جو ہمارے برقی اسٹیشنوں میں کوئلہ جلنے سے ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی انتخاب جو ہم نے کرنا ہے وہ انتخاب پائیدار اور ناپائیدار ترقیوں کے درمیان، قابل تجدید (Renewable) اور ناقابل تجدید (Non-Renewable) وسائل کے درمیان ہے۔

ماضی قریب میں زیادہ تر کوشش اس طرف رہی ہے کہ آزاد مارکیٹ (Free Market) کی بنیاد پر ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے ماحولیاتی اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشیاتی عمل جاری رہ سکے۔ مثلاً امریکہ میں ماحولیاتی آلودگی کے پیش نظر قابل فروخت پرمٹ (Tradable Permits) جاری کئے گئے۔ ان کا مقصد صنعت (Industry) سے ماحول کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی قیمت ادا کرنے پر صنعت کو آمادہ کرنا تھا۔ (معاشی نظام جس کی بنیاد صرف نفع پر ہو اس کے ضمنی برے اثرات کو بیان کرنے کے لئے ماہرین معاشیات ”خارجیات“ (Externalities) کا لفظ استعمال کرتے ہیں)۔ پرمٹ کی قیمت آلودگی کی وہ مقدار مقرر کرتی ہے جو خریدار ماحول میں پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرمٹ کی یہ قیمت کیسے مقرر کی جائے۔ تازہ ہوا یا کسی خوبصورت منظر کی قیمت بھلا کیسے لگ سکتی ہے۔

دولت کی کچھ ایسی ضروری شکلیں جو زری نقطہ نظر سے بلا قیمت ہیں ان کا اندازہ لگانا بھلا کیسے ممکن ہے۔ اس کے لئے ہمیں یہ مد نظر رکھنا چاہیے کہ ”قدر“ (Value) اور ”قیمت“ (Price) میں فرق ہے۔ ایک خوبصورت منظر کی قدر تو بہت زیادہ ہوتی ہے جس کو دیکھ کر کوئی شخص لطف اندوز ہوتا ہے مگر اس کی قیمت اکثر کچھ نہیں ہوتی۔ دو ایک جیسے مکان ہوں جن میں ایک خوبصورت منظر پیش کرتا ہو جبکہ دوسرا نہ کرتا ہو تو ان کے فرق سے ماہر معاشیات اندازہ لگا سکتا ہے کہ انسان خوبصورت مناظر پر بالعموم کتنا خرچ کرنے کو تیار ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ایسی مارکیٹ جس کے اندر مقابل یا حریف خریدار (Competing Buyers) اور فروخت کنندہ ہوں صرف وہی آلود کاروں کی آلودگی کی قیمت لگانے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

چونکہ قدرتی وسائل کا صرف ہو کر کم ہوتے جانا بقائے انسانی کیلئے ایک بڑھتا ہوا خطرہ ہے اس لئے خارجیات کی قدر کو جانچنے کا ذریعہ معلوم کرنا پبلک میں بحث کا ایک موضوع بن سکتا ہے۔ اس بحث

ہیں یہ ماننا پڑے گا کہ دولت کی کچھ شکلیں جن کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی اور جن کو ہماری دولت کے روایتی پیمانوں سے نہیں جانچا جاسکتا ان کا شمار نہیں ہوتا رہا۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ معاشرے کی ضروریات میں تازہ ہوا شفاف دریا اور پرسکون فضا بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں مگر معاشرے کو ان کی قدر اس وقت تک معلوم نہ ہوگی جب تک وہ ہمیشہ کیلئے ختم نہ ہو جائیں۔ اگر ہم اس تاریک انجام تک جا پہنچے تو اس کی ایک وجہ یہ ہوگی کہ انسان زندگی کے لطف کی ضروریات پورا کرنے کیلئے سورج کی حال کی روشنی کی توانائی کے بہاؤ کو کافی سمجھ رہا ہے اور اس سے زائد توانائی استعمال کر رہا ہے۔ جیسے جیسے دہائیاں گزرتی جائیں گی اس لالچ کے نتیجے میں اینٹراپی کے اثرات نکھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ یہ اثرات انیسویں اور بیسویں صدی کی تکنیکی ایجادات کی پیدوار ہیں جبکہ ارضی اینٹراپی جس کو ہماری کارروائیاں پیدا کر رہی ہیں اس کا مقابلہ کرنے کیلئے تکنیکی علم بذات خود استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر سورج کی روشنی کے گزشتہ ذخیرے سے توانائی حاصل کرنا ضروری نہیں کیونکہ موجودہ سورج کی روشنی کی توانائی کو زیادہ استعدادی لحاظ سے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا طریقہ نکل آئے جس سے کوئلہ جلانے والے پاور اسٹیشن سے پیدا شدہ ارضی اینٹراپی کی قیمت لگائی جاسکے تو شاید شمسی (Solar) توانائی، بادی توانائی (Wind Energy) یا ارضی حرارت (Geothermal) کی توانائی تقابلی (Competitive) مارکیٹ میں اہمیت حاصل کر سکیں۔ مگر جب تک ارضی اینٹراپی کو حساب میں نہیں لایا جاتا ہے ہم اپنے اجتماعی مسکن کی فضائی قدر کو حقیر ہی سمجھتے رہیں گے۔

اب میں (مصنف) اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میرے خیال میں ہمارے موجودہ مالی نظام کا ڈھانچہ اینٹراپی کے قدرتی نظام کے مخالف ہے۔ اینٹراپی کے قانون کے برعکس جدید مالی نظریے کے قوانین مکمل طور پر انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔

سود اور اینٹراپی

(Interest and Entropy)

سادہ مبادی معیشت (Barter Economy) میں ایک فرد اپنی فاضل دولت مادی اثاثے

(Physical Assets) کی شکل میں جمع کرتا ہے۔ فاضل دولت کو ذخیرہ کرنے کیلئے شاید اسے کسی قسم کی قیمت ذخیرہ کاری (Storage Cost) بھی ادا کرنی پڑے۔ وقت کیساتھ ساتھ کوئی اور قیمت بھی شامل ہو سکتی ہے کیونکہ اینٹراپی کے اضافہ کی وجہ سے ذخیرہ شدہ اثاثے کی کوالٹی متاثر ہوگی۔ اس لئے اثاثے کی نوعیت کے مطابق ذخیرہ کرنے والے کو اکثر کچھ ناگزیر قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔

کوئی شخص اپنی فاضل دولت ذخیرہ کرنے کے بجائے کسی کو ادھار بھی تو دے سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ادھار دیا گیا تو قیمت ذخیرہ کاری کا کیا بنا؟ یہ سوال شاید بیل ادھار لینے والے کے ذہن میں فوری طور پر پیدا نہ ہو جو بیل چلا کر نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ واپسی کے وقت وہ کس قسم کا بیل واپس کرے گا۔ کیا یہ وہی بیل ہوگا جو اس نے شروع میں لیا تھا یا یہ کوئی اور بیل ہوگا جس کی عمر اور صحت بالکل اسی بیل جیسی ہو جو اس بیل کی تھی جس کو دینے والے نے شروع میں ادھار کے لیے دیا تھا؟

جیسے سود پہ مئی جدید معیشت میں ادھار لئے گئے 100 پونڈ واپسی کے وقت سود کے اضافہ کیساتھ ادا کئے جاتے ہیں ویسے مالی کاروبار مرتب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ واپسی کے وقت ایسا بیل واپس کیا جائے جو لیتے وقت کی طرح کے اصل بیل کی عمر اور صحت میں ایک جیسا ہو اور ساتھ کچھ سود بھی ادا کیا جائے۔ اس طرح کے کاروبار کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ادھار دینے والا وہ قیمت بھی ادھار لینے والے کے سر پر ڈال دیتا ہے جو بیل کو رکھنے کے لئے اسے خود خرچ کرنی پڑتی۔ سود پر دیئے گئے 100 پونڈ کے زر پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا جس کا اطلاق 100 پونڈ سے خریدے گئے مادی اثاثوں پر ہوتا ہے۔ سود مرکب ہونے کی صورت میں زر لا انتہایت کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس کے برعکس فریڈرک سوڈی (Frederick Soddy) کے مطابق مادی دولت تخفیف مرکب (Compound Decrement) کے راستہ پر صفر کی طرف چل پڑتی ہے مگر صفر تک نہیں پہنچ پاتی۔ دوسری طرف مبادی معیشت میں سرمایہ کار جب اپنے اثاثے ذخیرہ کرتا ہے تو کچھ عرصہ بعد دیکھتا ہے کہ ان کی حالت پہلے سے ابتر ہے جب کہ وہی اثاثے ادھار دینے کی صورت میں غیر ابتری پذیر سمجھے جاتے ہیں۔

سوڈی (Soddy) کہتا ہے:

”اس زمانے کا اندازہ یہ ہے کہ دولت کو قرض میں بدل دیا جائے تاکہ مستقبل میں اس سے مستقل آمدنی ملتی رہے۔ یہ قابل فدا دولت کو قابل بقا میں بدل دیتا ہے۔ ایسا قرض جو نہ تو بوسیدہ ہو، جسے برقرار رکھنے پر کچھ خرچ بھی نہ ہو اور دائی سود بھی ملتا رہے۔“

(Soddy, F., "Money Versus Man," 1933, Quoted by Daly H., in Kaufman, G.B., 1986)

اگر زر کو قرضے پر لاگو ہونے والے سود مرکب کی شرائط کا اطلاق مادی سرمایہ (Physical Capital) پر کیا جائے تو تصور یہ ہوگا کہ مادی سرمایہ ادھار کی مدت تک اپنی اصلی حالت برقرار رکھے گا اور ساتھ ساتھ نئی دولت بھی پیدا کرتا رہے گا اور پھر یہ نئی دولت گھٹنے کے بجائے جانے پہچانے مرکب سلسلہ کے ذریعے مزید نئی دولت پیدا کرتی رہے گی۔ اگر یہ حالات قابل حصول ہوں تو حیرت انگیز کامیابی کا باعث ہوں گے۔ مگر اینٹراپی کے قانون کے مطابق ایسا نہیں ہوتا۔ اگر تھر موڈائی ٹاکس کے قوانین درست ہیں تو پھر ایک غیر بوسیدگی پذیر زر سے بھی مسلسل تخلیق دولت ناممکن ہے۔

جدید سرمایہ کاری کے مختلف معاہدوں میں اکثر اوقات سادہ اور مرکب سود میں فرق کیا جاتا ہے۔ سادہ سود کے معاہدے میں صرف اصل قرض پر سود لگتا ہے۔ سود مرکب میں اصل قرض اور سود پر بھی سود لگتا ہے۔ یہ سلسلہ ایسا ہے کہ جس میں ہر طے شدہ وقفہ پر اس وقت کا قابل ادا سود اس وقت کے قابل ادا میزان کو اصل (Principal) سمجھ کر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی مرکب (Compound) ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ سود مرکب کیسے کام کرتا ہے سوڈی کی مثال لیجئے اور تصور کیجئے کہ ایک شخص نے 20ء میں 100 روٹیاں کسی کو قرض دیں۔ دائن کو اعتبار تھا کہ قرضدار معاہدے کی شرائط پوری کرے گا جس کے مطابق ہر سال بعد 5 فیصد شرح سے سود مرکب ہوتا جائے گا۔ ایک سال بعد یعنی 21ء میں قابل ادا میزان سود کی 5 روٹیاں اصل کے ساتھ ملا کر 105 روٹیاں ہو جائیگا۔ اگر قرض اس وقت واپس ادا نہیں کیا جاتا تو 5 فیصد سود اصل کے ساتھ مرکب ہو کر نیا قرض 105 روٹیاں ہو جائے گا۔ اب اگلے سال اس نئے قرض کو اصل سمجھ کر اسکا 5 فیصد سود لیا جائے گا۔ 22ء میں قابل ادا میزان 110.25 روٹیاں ہوگا۔

مقابلتاً سادہ سود کی صورت میں 21ء میں 5 فیصد سود کی شرح سے قابل ادا میزان 105 روٹیاں ہوگا اور 22ء میں 110 روٹیاں ہوگا۔ کیونکہ دوسرے سال میں پہلے سال کے سود پر سود نہیں لگے گا۔

دوسرے الفاظ میں سود کو مرکب نہیں کیا جائے گا۔

$$\begin{aligned} F &= P(1+rt) \\ &= 100(1+0.05 \times 2) \\ &= 110 \end{aligned}$$

سادہ سود کے تحت واپسی کی ادائیگی

$$\begin{aligned} F &= P(1+r)^t \\ &= 100(1+0.05)^2 \\ &= 110.25 \end{aligned}$$

مرکب سود کے تحت واپسی کی ادائیگی

جبکہ سادہ سود اور مرکب سود دونوں کے فارمولوں میں:

$$\begin{aligned} F &= \text{سود کے وقفہ کے اختتام پر واجب الادا} \\ P &= \text{ابتدا کا اصل قرض} \\ r &= \text{ہر وقفہ (جو ادائیگی پر والی مثالوں میں ایک سال ہے) میں سود کی شرح} \\ t &= \text{وقفوں کی تعداد} \end{aligned}$$

مندرجہ بالا فارمولے مالیاتی ریاضی (Financial Mathematics) کی بنیاد ہیں جسے مذکورہ

مثال میں روٹیوں سے بیان کیا گیا ہے۔ "P" کو اکثر اوقات "F" کی موجود قیمت (Present Value) اور "F" کو "P" کی مستقبل کی قیمت (Future Value) کہتے ہیں۔ اس لئے اگر سود کی شرح 5 فیصد ہو تو سود مرکب کے تحت دو سال بعد اگر کسی کو 110.25 پونڈ قابل ادا ہوں تو اس کی موجودہ قیمت 100 پونڈ ہوگی۔ اسی طرح سے اگر کسی کو اس وقت 100 پونڈ دیئے جائیں تو اسکی دو سال بعد مستقبل کی قیمت 110.25 پونڈ ہوگی۔ دونوں طرح دیکھا جائے تو کسی کی نظر میں آج 100 پونڈ وصول کرنا دو سال کے بعد 110.25 پونڈ وصول کرنا ایک جیسا ہے۔

اس وقت کے 100 پونڈ اور دو سال بعد کے 110.25 پونڈ ایک جیسے اس لئے ہیں کیونکہ آج

100 پونڈ 5 فیصد سود مرکب کی شرح سے اگر قرض دیے جائیں تو دو سالوں میں 110.25 پونڈ بن جاتے ہیں۔ اس لئے آج کا 100 پونڈ کا ترسیل زر (Cash Flow) اور دو سال بعد 110.25 پونڈ کا ترسیل زر برابر ہیں۔

مذکورہ بالا ریاضی کے مطابق کسی چیز کی دو قسم کی قیمتیں سامنے آتی ہیں۔ ”تاخیری قیمت“ (Forward Price) اور ”فوری قیمت“ (Spot Value)۔ تاخیری قیمت وہ قیمت ہے جو بائع اور مشتری کے درمیان باہمی رضامندی سے طے پاتی ہے جو مستقبل میں کسی مقررہ وقت پر واجب الادا ہوگی۔ یوں کہئے کہ آج اگر سونا خرید کر وصول کر لیا جائے اور آج ہی اس کی قیمت ادا کی جائے جو کہ 400 پونڈ فی اونس ہو تو یہ فوری قیمت کہلائے گی۔ اگر خریدار چاہے کہ سونا ایک سال بعد وصول کیا جائے اور قیمت بھی اسی وقت ادا ہو تو ایک سال کی تاخیری قیمت زیادہ تر اس سے منسلک سود کی شرح سے طے ہوگی۔ منصفانہ (Fair) تاخیری قیمت معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ آج کی سونے کی قیمت کیا ہے اور اسے ایک سال تک ذخیرہ کر کے خریدار تک پہنچانے کی کیا لاگت آئے گی۔ چنانچہ اگر سود کی شرح 5 فیصد سالانہ ہو اور ذخیرہ کرنے کی لاگت 1 پونڈ فی اونس ہو تو خریدار کو 400 پونڈ فی اونس قیمت خرید، 20 پونڈ سود اور 1 پونڈ ذخیرہ کرنے کی لاگت ادا کرنی پڑے گی۔ دوسرے الفاظ میں سونے کی ایک سال کی منصفانہ تاخیری قیمت 421 پونڈ فی اونس ہوگی۔ شاید بائع اس میں اپنا نفع بھی مزید شامل کر دے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر سود کی شرح بڑھ کر 10 فیصد ہو جائے تو مذکورہ بالا مثال میں تاخیری قیمت 441 پونڈ فی اونس ہوگی۔

چلئے واپس مرکب سود اور سوڈی کی مثال کی طرف آئیے۔ جو لوگ اس سلسلے کو سمجھتے ہیں انہیں ایک بہت لمبے عرصے پر مبنی حساب کے نتائج دیکھ کر حیرت ہی نہ ہوگی بلکہ ہنسی آئے گی۔ مذکورہ مثال کے مفروضات کے مطابق 1995ء میں ادھار کی واپسی $7 \times 10^{42} = 100(1+0.05)^{1975}$ کے برابر ہوگی جو کہ ہزاروں کروڑوں کھرب روٹیوں سے بھی متجاوز ہے۔ اس قرض کی واپسی کے حجم کے متعلق قابل غور مگر مضحکہ خیز حقیقت یہ ہے کہ اگر جب سے ہر انسان پیدا ہوا ہے روزانہ ہزاروں لاکھوں روٹیاں پکا کر ذخیرہ کرتا رہتا تو پھر بھی مذکورہ بالا ادائیگی پوری نہ ہو پاتی۔ اگر سود کی شرح قدرے آسان

کر کے اڑھائی فیصد بھی کی گئی ہوتی تب بھی مذکورہ بالا ادائیگی کا حجم پورا نہ ہو پاتا۔

مذکورہ بالا مثال میں ایک عجب حقیقت کا فرما ہے وہ یہ کہ ریاضی جو استعمال کی گئی ہے وہ طبعی دنیا کے حقائق سے متصادم ہے۔ روٹیاں وقت کے ساتھ گل سڑ جاتی ہیں جبکہ سودی قرضے ایسا نہیں کرتے۔ ماحولیاتی اعتبار سے یہ تضاد نہایت مضر ہے۔

ہم نے دیکھا اگر انسان طبعی نظام میں نظم پیدا کرنا چاہتا ہے تو بیرونی توانائی صرف کر کے اُسے اینٹراپی کے سلسلے کو پلٹانا پڑے گا۔ جب بارش، کھاد، بیج، سورج کی روشنی اور انسانی محنت صحیح طریقے سے اکٹھی ہوں گی تو روٹی پیدا ہوگی۔ چنانچہ روٹی کی پیدائش کے نظام میں اینٹراپی کی کمی دوسرے طبعی نظاموں کی اینٹراپی میں اضافے سے حاصل ہوگی۔ اس مثال میں جن اجزاء نے روٹی پیدا کرنے میں حصہ لیا اُن میں جزوی طور پر بگاڑ پیدا ہوا۔ کاشتکاری کا سامان فرسودہ ہوا اور زمین کی زرخیزی بھی تھوڑی بہت کم ہوئی۔ نتیجتاً مجموعی نظم میں اینٹراپی کے قانون کے مطابق کمی آئی۔

روٹی کے اُدھار کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ جوں جوں سود کی شرح میں اضافہ ہوگا روٹی کی واپسی کے حجم میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب سود کی شرح میں اضافہ ہوگا تو اینٹراپی میں بھی اضافے کا رجحان ہوگا۔ اسکی وجہ قرضدار کو قرض لوٹانے کے لئے زیادہ روٹیاں پیدا کرنا ہے۔ جتنی سود کی شرح زیادہ ہوگی اتنا ہی زمین کی ماحولیاتی خرابی کا امکان زیادہ ہوگا۔ اینٹراپی میں اضافہ کہاں پر ہوتا ہے؟ شمسی روشنی سے قوت حاصل کرنے والے قابل تجدید وسائل اگر توانائی بہم پہنچانے کے لیے استعمال کئے جائیں تو اینٹراپی کم ہوگی۔ اس کے برعکس شمسی روشنی کے گزشتہ ذخیرے استعمال کئے جائیں تو ارضی اینٹراپی زیادہ ہوگی۔ سورج تو چمکتا رہے گا اور اس کی اینٹراپی بڑھتی ہی جائے گی چاہے ہم اُس کی روشنی کو بروئے کار لائیں یا نہ لائیں۔ مگر زمین سے حاصل شدہ تیل سے چلنے والے کاشتکاری کے ساز و سامان کے استعمال سے زمین کی اینٹراپی میں اضافہ ہوگا جو بصورت دیگر نہ ہوتا۔

یہ دلیل محض قیاس پر مبنی نہیں جیسا کہ بادی النظر سے محسوس ہوتا ہے۔ بیرون ملکی واجب الادا قرضوں کے لحاظ سے برازیل، انڈونیشیا اور میکسیکو دنیا کی سب سے زیادہ مقروض قوموں میں سے ہیں۔

یہ ممالک دنیا کے سب سے بڑے جنگلات کو ختم کرنے والے بھی ہیں۔ برازیل کے بارشی جنگلات ہمارے سیارے (زمین) کی 40 فی صد آکسیجن کا ذریعہ ہیں۔ موجودہ رجحان کے پیش نظر یہ جنگلات دو انسانی عمروں کی مدت میں ختم ہو جائیں گے۔ مگر بھوکوں اور فاقہ زدوں کے لئے زندگی کی بقا بارشی جنگلات کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے۔ لکڑی کو راکھ میں تبدیل کرنے میں (جس سے ماحولیاتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے) کچھ لوگوں کی زندگی کی تو بقاء ہے جبکہ برازیل کے بارشی جنگلات کا ضیاع ہم سب کے لئے نقصان دہ ہے۔

| ملک کا نام | 1981 سے 1990 تک جنگلات کی اوسط ناپیدگی (مربع کلومیٹر سالانہ) | 1992 میں بیرون ملکی واجب الادا قرض (GDP کا فیصد) | 1992 میں قرض کی واپسی (ایکسپورٹ کی مقدار کی قدر کا فیصد) |
|------------|--|--|--|
| برازیل | 36,710 | 31.3 | 24.4 |
| انڈونیشیا | 12,120 | 67.4 | 32.1 |
| زائیر | 7,320 | 111.5 | 34.8 |
| میکسیکو | 6,780 | 35.2 | 44.4 |
| بولیویا | 6,250 | 83.6 | 39.1 |
| وینزویلا | 5,990 | 62.5 | 19.5 |
| تھائی لینڈ | 5,150 | 36.3 | 13.1 |
| سوڈان | 4,820 | 220.7 | نامعلوم |
| تنزانیہ | 4,380 | 268.4 | 32.5 |

جنگلات کی ناپیدگی اور بیرون ملکی قرض

(ماخذ: Pocket World in Figures, The Economist Books, 1994)

مندرجہ بالا جدول بظاہر شاید اتفاقیہ معلوم ہو لیکن پیش کردہ شماریات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اب تک بیان کیا گیا سود اور اینٹراپی کے درمیان تضاد ایک حقیقت ہے۔ "The Discounting and Value, 1994" میں کولن پرائس (Colin Price) ہمیں ملر (Miller) کی تحقیق کی یاد دلاتا ہے جو

اس نے "Environment: Debt the Converging Crises, 1991" میں پیش کی جس میں قدرتی وسائل کے خاتمے کا تعلق بین الاقوامی قرضوں پر سود کی ادائیگی کے ساتھ واضح طور پر بتلایا گیا ہے۔ کیا یہ واقعی کسی لحاظ سے مالیاتی اور طبعی نظاموں کے درمیان تضاد یا بیرون ملکی قرضوں کی ادائیگی کے تقاضے اور مفلس معیشت کی حالت کے درمیان تضاد کے ساتھ تعلق رکھتی ہے؟ یا کیا جنگلات کی ناپیدگی معاشی ترقی کا محض ایک مظہر ہیں؟ ان سوالوں کے تسلی بخش جواب کے لئے اب ہمیں معیشت پر سود کے اثر کی گہرائی کو جانچنا ہوگا۔

ڈسکاؤنٹنگ (Discounting) یعنی عمل تخفیف

مندرجہ ذیل طریقہ یونیورسٹی آف سسکس کے مائیکل لیپٹن (Micheal Lipton at University of Sussex) کے نظریہ سے ماخذ ہے۔ فرض کیجئے ایک کاشتکار زمین کا ٹکڑا خرید کر کاشتکاری کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی قیمت خرید اور کاشتکاری کے مکمل خرچے قرض کے سرمائے سے ادا ہوں گے۔ زمین کو دو طریقوں سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک طریقے میں کسی اعلیٰ تکنیکی عمل کے ذریعے پندرہ سال تک زمین سے 150 پونڈ سالانہ نفع حاصل کیا جاسکتا ہے مگر اس کے بعد زمین کو بے کار چھوڑنا پڑے گا۔ دوسرے طریقے میں 100 پونڈ سالانہ نفع حاصل ہوگا مگر زمین ہمیشہ کے لئے قابل کاشت اور کارآمد رہے گی۔

ڈسکاؤنٹنگ (Discounting) یعنی عمل تخفیف کے ذریعے ترسیل زر (Cash-Flow) کا تجزیہ کر کے جدید کاشتکار دونوں طریقوں کے ترسیل زر کا موازنہ کر کے زیادہ نفع بخش طریقہ معلوم کر سکتا ہے۔ ہر سودی شرح کے لئے ترسیل زر کی موجودہ قیمت (Present Value) اس باب میں بتلائے گئے فارمولوں کو استعمال کر کے معلوم کی جاسکتی ہے۔ اور پھر دونوں طریقوں میں سے جو ترسیل زر کی سب سے زیادہ موجودہ قیمت بہم پہنچائے اس طریقے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل جداول دونوں طریقوں کا حساب پیش کرتی ہیں جن میں 1 پہلے سال کو ظاہر کرتا ہے 2 دوسرے سال کو وغیرہ وغیرہ۔ مندرجہ ذیل حساب صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ 5 فیصد سودی شرح سے پہلا طریقہ 1556.82 پونڈ

اور دوسرا طریقہ 2,000 پونڈ موجودہ قیمت مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ دوسرے طریقے کے تحت زیادہ موجودہ قیمت (2,000 پونڈ) 5 فیصد کی شرح سے حاصل ہوگی۔ اس کے برعکس 10 فیصد سودی شرح سے پہلا طریقہ 1140.79 پونڈ اور دوسرا طریقہ 1,000 پونڈ موجودہ قیمت مہیا کرتا ہے۔ لہذا اگر پہلا طریقہ استعمال کیا جائے تو زیادہ قیمت (1140.79 پونڈ) 10 فیصد کی شرح سے حاصل ہوگی۔

| سال | سالانہ نفع | 5 فیصد شرح سے نفع کی موجودہ قیمت | 10 فیصد شرح سے نفع کی موجودہ قیمت |
|-----------------------------|------------|----------------------------------|-----------------------------------|
| t1 | 150 | 142.85 | 136.36 |
| t2 | 150 | 136.05 | 123.96 |
| t3 | 150 | 129.57 | 112.69 |
| t4 | 150 | 123.40 | 102.45 |
| t5 | 150 | 117.52 | 93.13 |
| t6 | 150 | 111.93 | 84.66 |
| t7 | 150 | 106.59 | 76.96 |
| t8 | 150 | 101.52 | 69.96 |
| t9 | 150 | 96.68 | 63.61 |
| t10 | 150 | 92.07 | 57.82 |
| t11 | 150 | 87.69 | 52.56 |
| t12 | 150 | 83.51 | 47.79 |
| t13 | 150 | 79.54 | 43.44 |
| t14 | 150 | 75.75 | 39.49 |
| t15 | 150 | 72.15 | 35.91 |
| بعد والے سال Infinity تک | 0 | 0 | 0 |
| میزان | 2250 | 1556.82 | 1140.79 |

ڈسکاؤنٹنگ کے ساتھ ترسیل زر کا تجزیہ (زیادہ سالانہ نفع والی کاشتکاری)
(15 سال تک 150 پونڈ سالانہ ترسیل زر بعد میں زمین بیکار)

| سال | سالانہ نفع | 5 فیصد شرح سے نفع موجودہ قیمت | 10 فیصد شرح سے نفع کی موجودہ قیمت |
|-----------------------------|------------|----------------------------------|--------------------------------------|
| t1 | 100 | 95.24 | 90.90 |
| t2 | 100 | 90.70 | 82.64 |
| t3 | 100 | 86.38 | 75.13 |
| t4 | 100 | 82.27 | 68.30 |
| t5 | 100 | 78.35 | 62.09 |
| t6 | 100 | 74.62 | 56.45 |
| t7 | 100 | 71.06 | 51.31 |
| t8 | 100 | 67.68 | 46.65 |
| t9 | 100 | 64.46 | 42.40 |
| t10 | 100 | 61.39 | 38.55 |
| t11 | 100 | 58.46 | 35.04 |
| t12 | 100 | 55.68 | 31.86 |
| t13 | 100 | 53.03 | 28.96 |
| t14 | 100 | 50.50 | 26.33 |
| t15 | 100 | 48.10 | 23.94 |
| بعد والے سال Infinity تک | 100 | کم ہو کر 0 کے قریب ہو جائے گا | کم ہو کر 0 کے قریب ہو جائے گا |
| میزان | Infinity | 2000.00 | 1000.00 |

ڈسکاؤنٹنگ کے ساتھ ترسیل زر کا تجزیہ (کم سالانہ نفع والی کاشتکاری)
(ہمیشہ کے لئے 100 پونڈ سالانہ ترسیل زر)

تو معلوم ہوا کہ سود کی شرح میں اضافہ زیادہ سالانہ نفع دینے والی کاشتکاری کی طرف زیادہ ترغیب دیتا ہے جس میں زمین کو آخر میں بے کار چھوڑنا پڑے گا۔ اس بُرے نتیجے کی وجہ ڈسکاؤنٹنگ کا وہ عمل ہے جس کی وجہ سے آئندہ سالوں کی پیداوار کی موجودہ قیمت بتدریج صفر کی طرف رواں دواں ہے۔ 10 فیصد سود کی شرح سے مستقبل کے پچاسویں سال کے حاصل شدہ 100 پونڈ نفع کی موجودہ قیمت

0.85 پونڈ ہے اس لئے تجزیہ کار جو ترسیل زر کی ڈسکاؤنٹنگ پہ انحصار کرتا ہے اسے آج سے پچاسویں سال بعد زمین کی پیداوار سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس وقت زمین کی کاشت کی جائے یا نہ کی جائے دونوں برابر ہیں کیونکہ اس وقت کے فائدے کی موجودہ قیمت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیپٹن کہتا ہے:

”1977 سے 1979 کے دوران سودی شرح میں حیران کن اضافہ خاندانوں، بیوپاریوں اور حکومتوں کے لیے اس بات کا محرک بنا ہے کہ قدرتی وسائل کو ابھی صرف کر لیا جائے اور بعد کے نتائج کی پرواہ نہ کی جائے۔ جو حکومتیں قدرتی وسائل کے بچاؤ (Conservation) کے لیے مالی امداد دینا چاہتی تھیں ان کی مالی استعداد کو بڑھتی ہوئی سودی شرح نے غرق کر دیا۔ 1972ء کے دوران جیل سے محروم ممالک میں اندرون ملک اور بیرون ملک سرکاری اخراجات پر سودی شرح 5.6 فیصد تھی جو کہ 1988 میں 18.7 فیصد ہو گئی۔ ریو (Rio) کانفرنس میں شرکت کرنے والوں نے آنے والے وقت میں قحط، مہنگائی اور وسائل کے خاتمے کے متعلق متنبہ کیا کہ سودی شرح میں تیزی ہمارے لئے ایک تاریک مستقبل کی طرف پیش رفت ہے۔“

(Micheal Lipton, "The Spectre at the Fast in Financial Times", 24 June 1992)

حسابی تخمینوں سے قطع نظر یہ خیال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ قلیل الوقت نفع کے لئے زمین کا دیوالیہ نکال دینا کوئی عقلمندی نہیں۔ ایک لافانی بطن جو ہر ہفتے ایک سونے کا انڈا دیتی ہے کی لافانیت کو ہفتہ میں دو انڈے لیکر ختم نہیں کر دینا چاہیے۔ تاہم ایسے لگتا ہے کہ ترسیل زر کی ڈسکاؤنٹنگ کو دیکھ کر کچھ قدرتی اثاثوں کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ اصول وہی ہے جو بیان کیا گیا کہ چاہے تو ایسی قربانی زمینوں کو ناقابل کاشت بنا کر چھوڑ دینے کی شکل میں ہو یا بعض جاندار نسلوں کے خاتمے کی صورت میں ہو یا ایٹمی توانائی سے چلنے والے پاور اسٹیشنوں سے پیدا شدہ دیرپا تباہ کن آلودگی کی شکل میں ہو، سودی مرکب ایسے نتائج کو صفر کی حیثیت دیتا ہے جن کو حال کی کارروائی مستقبل میں پیدا کرے گی۔ مگر مسائل تو آئندہ نسلوں کیلئے پیدا ہوں گے۔

کولن پرائس (Colin Price) کا اصرار ہے کہ ضمیمہ دنیا غیر سرعت پذیر عوامل (Non-Exponential Functions) کی دولت مہیا کرتی ہے اس میں ”یکساں سرعت پذیر منفی ڈسکاؤنٹنگ“ (Uniform Exponential Negative Discounting) تقریباً ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔

”ہم ڈسکاؤنٹنگ کو قبول کرنے کیلئے اس لئے تیار ہیں کہ اسے چھوڑ کر ہمارے مفاد کی اہمیت کم ہو جائیگی۔ ایسا نہ کرنے سے ہماری حالیہ شرمناک لافانی پرزدہ پڑتی ہے جو ہم مستقبل بعید سے روادار کہتے ہیں۔“

(Price, C., "Time Discounting and Value", 1994, p.346)

مستقبل بعید کا خیال اگر نہ بھی کیا جائے پھر بھی ڈسکاؤنٹنگ زمانہ حال میں وسائل کو صرف کرنے کے ایسے طور طریقوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو قابل اعتراض ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اور تجربے میں ڈسکاؤنٹنگ کا استعمال دیکھئے۔ تعطیلات کے دو منصوبوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا مقصود ہے۔ پہلے منصوبے میں پہلے دس سالوں میں کوئی چھٹی نہیں لی جائے گی۔ اس کے بعد آنے والے بیس سالوں میں ہر سال ایک چھٹی ملے گی۔ دوسرے میں پہلے دس سالوں میں ہر سال ایک چھٹی لی جائے گی مگر بعد میں کوئی چھٹی نہیں ملے گی۔ چھٹی کی موجودہ قیمت 1000 پونڈ ہے جو بعد میں بھی اتنی ہی رہے گی۔

مندرجہ بالا مثال کا تجربہ یہ مندرجہ ذیل جدول میں دیا گیا ہے۔ جن سالوں میں چھٹی نہیں ملے گی ان سالوں میں چھٹی کی قیمت صفر لگائی گئی ہے۔ تجربہ کا دورانیہ 30 سال ہے اور ڈسکاؤنٹنگ کی شرح ہر منصوبے کی چھٹی کے لئے 10 فیصد استعمال کی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل ڈسکاؤنٹنگ کے تجربے کے مطابق پہلے دس سالہ تعطیلات کی ترسیل کے منصوبے کا انتخاب کرنا چاہیے چونکہ اس میں موجودہ قیمت (جو کہ 6141 پونڈ ہے) زیادہ ہے بہ نسبت بعد والی تعطیلات کی ترسیل کے منصوبے کے جس میں موجودہ قیمت (جو کہ 3282 پونڈ ہے) کم ہے۔ کیا چھٹیوں کو صرف کرنے کا ایسا منصوبہ ان لوگوں کیلئے قابل ترجیح ہے جو حال کی لطف اندوزی بعد کے صلہ پر قربان کرنا چاہتے ہیں۔ کتنے لوگ ہوں گے جو ایک ہی جیسی بعد والی 20 چھٹیوں کے عوض حال میں 10 چھٹیاں لینا پسند کریں گے؟ جس شخص کو بہت جلد مرنے کا خطرہ ہو وہ تو چاہے گا کہ جلد از جلد جتنی چھٹیاں ہو سکے لے لے۔ مگر زیادہ لوگوں کیلئے عقل مندی کا انتخاب یہ ہوگا کہ بعد میں زیادہ چھٹیاں لیں۔ بد قسمتی سے ڈسکاؤنٹنگ ہمیں یہاں ایسے انتخاب کا موقع ہی نہیں دیتی۔ قیمتوں، افراط زر اور زندگی کی طوالت کے متعلق مفروضے درست ہوں یا نہ ہوں ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مفروضے کچھ بھی ہوں ڈسکاؤنٹنگ کے استعمال سے ہمارے انتخاب محض اس حساب کے تحت ہی ہوں گے جو ہمیں شدت کے ساتھ قلیل نظری (Short Termism) کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ جوں جوں سودی شرح بڑھتی جائے گی توں توں بے صبری کی طرف ترغیب بھی بڑھتی جائے گی۔

| سال | پہلے 10 سال | 10% ڈسکاؤنٹ | پہلے 10 سال | 10% ڈسکاؤنٹ |
|----------|---------------|------------------|---------------|------------------|
| | 0 چھٹی فی سال | شرح سے چھٹی کی | 1 چھٹی فی سال | شرح سے چھٹی کی |
| | اگلے 20 سال | موجودہ مالی قیمت | اگلے 20 سال | موجودہ مالی قیمت |
| | 1 چھٹی فی سال | (پونڈ) | 0 چھٹی فی سال | (پونڈ) |
| | (پونڈ) | | (پونڈ) | |
| t1 | 0 | 0 | 1000 | 909 |
| t2 | 0 | 0 | 1000 | 826 |
| t3 | 0 | 0 | 1000 | 751 |
| t4 | 0 | 0 | 1000 | 683 |
| t5 | 0 | 0 | 1000 | 620 |
| t6 | 0 | 0 | 1000 | 564 |
| t7 | 0 | 0 | 1000 | 513 |
| t8 | 0 | 0 | 1000 | 466 |
| t9 | 0 | 0 | 1000 | 424 |
| t10 | 0 | 0 | 1000 | 385 |
| t11 | 1000 | 350 | 0 | 0 |
| t12 | 1000 | 318 | 0 | 0 |
| t13 | 1000 | 289 | 0 | 0 |
| بعد والا | 1000 | بعد والے | 0 | 0 |
| ہر سال | | ہر سال کے لیے | | |
| t30 تک | | ڈسکاؤنٹ سے نکالی | | |
| | | گنی مختلف قیمتیں | | |
| میزان | 20,000 | 3,282 | 10,000 | 6,141 |

دو طرح کی تعطیلات کی ترسیل کے منصوبوں کا ڈسکاؤنٹنگ سے تجزیہ

عالمی فضائی حرارتی اضافے (Global Warming) کی بحث ہمیں ڈسکاؤنٹنگ کی قلیل نظری کی طرف ترغیب دینے کی بہترین ماحولیاتی مثال مہیا کرتی ہے۔ موسمیات کے ماہرین اس پر متفق ہیں کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین جیسی گیسوں کے فضا میں اخراج سے وقت کے ساتھ عالمی سطح پر

فضا کے اوسط درجہ حرارت میں اضافہ ہوگا۔ اسے عام طور پر سبزہ گھراثر (Green House Effect) کہتے ہیں کیونکہ زمین کی فضا سبزہ گھر کے شیشے کی مانند ہے جو موجِ قلیل (Short Wave) شمسی شعاعوں کو اندر تو آنے دیتا ہے مگر زمین سے منعکس شدہ موجِ طویل (Long Wave) شعاعوں کو باہر نہیں جانے دیتا۔

سبزہ گھر کی گیسوں (Greenhouse Gases) کی موجودہ مقدار میں بڑھتے ہوئے اخراج سے احتمال ہے کہ زمین سے منعکس شدہ شعاعیں زیادہ مقدار میں زمینی فضا کے اندر مقید ہو جائیں گی نتیجتاً زمین زیادہ گرم ہوتی جائے گی۔

1990ء میں سبزہ گھر کی گیسوں کا سالانہ اخراج تقریباً کاربن ڈائی آکسائیڈ کے 6 ارب ٹن کے برابر ہے جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے علاوہ اور گیسیں بھی شامل ہیں۔ فضائی گیسوں کے کاربن کے عنصر کا موجودہ ذخیرہ فضائی وزن کا تقریباً 0.353 فیصد ہے جو صنعتی دور سے پیشتر کے 0.285 فیصد سے بڑھ کر یہاں تک پہنچا ہے۔ موجودہ رجحان کے تحت 2025ء میں فضائی کاربن صنعتی دور سے پیشتر والی مقدار سے دگنی ہو جائے گی۔

فضائی تبدیلی پر بین الاقوامی لجنہ (Intergovernmental Panel) کے تخمینہ کے مطابق 2025ء میں فضائی گیسوں کی کاربن کے عنصر کی مقدار دگنی ہو کر صنعتی دور سے پیشتر والے اوسط فضائی درجہ حرارت کو 2.5 درجہ سنٹی گریڈ بڑھا دے گی۔ تاہم فضائی حرارت میں اضافہ کا سلسلہ وہاں رک نہیں جائے گا۔ درحقیقت فضا میں اب تک پہلے ہی کاربن کا اضافہ جو ہو چکا ہے وہ درجہ حرارت میں 2100 تک تقریباً 6 درجے سنٹی گریڈ کا اور 2275 تک 10 درجہ سنٹی گریڈ کا اضافہ کر سکتا ہے۔

عالمی فضائی حرارتی اضافے کی بحث کا ایک پہلو ایسے طریقوں کی افادیت معلوم کرنے سے تعلق رکھتا ہے جن کو بروئے کار آکر اس عمل کے آغاز سے پیشتر ہی اس کا تدارک کیا جاسکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ معلوم کرنا ہے کہ صاف ہوا کے لئے ٹیکنالوجی پر آج سرمایہ کاری کر کے عالمی فضائی حرارتی اضافے کو روکنے کیلئے سبزہ گھر کی گیسوں کے اخراج میں تخفیف کرنا کیا سودمند ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کیلئے دیکھیں ڈسکاؤنٹنگ کا تجزیہ کیا بتاتا ہے کہ آنے والے سالوں میں عالمی فضائی

حرارتی اضافے سے پیدا ہونے والے نتائج کی قیمت حالیہ حساب کے مطابق کتنی ہوگی اور ان کو روکنے کے لئے اگر سرمایہ کاری کی جائے تو وہ کتنی ہوگی؟

بین الاقوامی ادارہ معاشیات (International Institute for Economics) کے مطابق عالمی فضائی حرارتی اضافے کو روکنے کے لئے جارحانہ کوشش کی قیمت دنیا کی مجموعی نجی پیداوار (Gross Domestic Product) کا تقریباً 2.5 فیصد ہوگی۔ مگر ان کی تحقیق بتلاتی ہے کہ اگر 2275ء تک 3 فیصد یا اس سے زیادہ ڈسکاؤنٹنگ کی سالانہ شرح استعمال کی جائے تو جب تک عالمی فضائی حرارتی اضافہ بہت ہی شدید نہ ہو اسے روکنا فائدہ مند نہیں۔

ادارے کے محققین ان مشکلات کو پہچانتے تھے جو لمبے عرصہ کی ڈسکاؤنٹنگ کے اندر قدرتی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے انہوں نے 1.5 فیصد سالانہ شرح کو مناسب سمجھ کر اپنے تخمینہ کے لئے اختیار کیا ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ اس کم شرح سے جب مختلف تجزیے کئے گئے تو عالمی فضائی حرارتی اضافہ کے سدباب کے لئے ان کے نتائج فائدہ مند نظر آئے۔ لہذا ادارے کے تجزیوں کے نتائج میں ڈسکاؤنٹنگ کی شرح بہت اہم ہے۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ڈسکاؤنٹنگ کی شرح کیلئے مارکیٹ کے سود کی شرح کا انتخاب غیر مناسب ہے خاص کر جب اسے لمبے عرصے کے لئے تجزیہ میں استعمال کیا جائے۔ معاشرتی شرح ترجیح وقت ("Social Rate of Time Preference" "SRTTP") مثال ہے اس تکلیف دہ نظریاتی راستہ کی جسے اختیار کر کے ڈسکاؤنٹنگ کی متبادل شرح معلوم کی جاسکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو دی اکناکس آف گلوبل وارمنگ (1992) میں ولیم کلیمین (William Cline)۔

مستحکم حال معیشت (Steady State Economy) میں SRTTP وہ شرح ہے جو مستقبل میں صرف ہونے والی اس زاید مقدار کو بیان کرتی ہے جو حال میں قابل صرف اس مقدار کے عوض حاصل کی جاسکتی ہو جس کو حال میں صرف کرنے کے بجائے آئندہ کیلئے استعمال (invest) کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں SRTTP مستحکم حال معیشت میں سرمایہ کی هامشی پیداوار (Marginal Productivity of Capital) سے تعلق رکھتی ہے۔

مستحکم حال معیشت میں ہر نسل اپنے آنے والی نسل کو اپنے ہی جیسے معیار زندگی سے لطف اندوز ہونے کا تب موقع دے گی جب ایک نسل نہ تو زیادہ صرف کرے تاکہ مستقبل کے لئے سرمایہ کا ذخیرہ ضائع نہ ہو اور نہ ہی زیادہ سرمایہ کاری کرے تاکہ آئندہ نسل بھی کم صرف کرے اور سرمایہ کا جو ذخیرہ اسے وراثت میں ملے اسے برقرار رکھے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہر نسل میں سرمایہ کاری اور محنت کی باہمی نسبت ایک جیسی برقرار رہنی چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نسل کو پتہ چلے کہ ہسپتال میں پہلی نسل کے مقابلے میں آبادی کے لحاظ سے فی کس بستر کم ہیں تو کہا جائے گا کہ ان کا معیار زندگی کم ہو گیا ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں ماہرین نے 2.5 فیصد SRTP تجویز کیا ہے اگرچہ جہاں عملی طور پر مستحکم حالت ممکن ہو وہاں 0.5 فیصد تک کم SRTP کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ لیکن کیا SRTP کی کوئی بھی قیمت لگانے سے کسی قسم کا فرق پڑتا ہے؟ آخر صنعت SRTP پر نہیں بلکہ سود کی اس شرح پر سرمایہ ادھار لیتی ہے جو مارکیٹ میں رائج ہو اور یہ صنعت ہی ہے جو اصلاً سبزہ گھراثرات کی ذمہ دار ہے۔ اپنا پیدواری سلسلہ چلانے کیلئے صنعت کار جو سرمایہ استعمال کرتا ہے وہ سرمایہ اگر دس فیصد سود پیدا کرے تو SRTP کے برابر ڈسکاؤنٹ کی شرح استعمال کر کے سرمایہ کار بھلا کیونکر کسی متبادل سرمایہ کاری کا انتخاب کرے گا؟

درحقیقت کم ڈسکاؤنٹ کی شرح بھی زیر بحث لائی گئی مختلف صورتوں کے ناپسندیدہ نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ دراصل ڈسکاؤنٹنگ سے متعلق ہے نہ کہ ڈسکاؤنٹنگ کی شرح سے۔ یہ اندیشہ اور بھی قوی ہو جاتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ ڈسکاؤنٹنگ کے عمل کے نتائج کو قرین قیاس بنانے کیلئے ڈسکاؤنٹ ریٹ کو نیچی سطح پر دھکیلنا پڑتا ہے جس کے جواز کے لئے پیچیدہ دلائل درکار ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ڈسکاؤنٹنگ کا نظریہ قلیل مدت کے تجزیہ کیلئے قائم کیا گیا تھا اس کا اطلاق جب طویل مدت کے تجزیہ پر کیا جائے تو وہ نتائج کو ایک انتہا تک لے جاتا ہے۔ مگر قلیل مدتوں کے ایک سلسلے کے مجموعہ کے علاوہ بھلا طویل مدت ہے ہی کیا؟ اور گزشتہ دی گئی مثال میں دو مختلف تعطیلاتی ترسیل پر مبنی 30 سالہ عرصہ کیا ڈسکاؤنٹنگ کیلئے واقعی بہت لمبا ہے؟ آخر مالیاتی مارکیٹ کے

ماہرین بھی تو ڈسکاؤنٹنگ کے ذریعہ 30 سالہ سرکاری بانڈ کی قدر معلوم کر کے مطمئن نظر آتے ہیں۔
کلائن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ:

”..... آئندہ اصراف (Consumption) کو ڈسکاؤنٹ کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مستقبل کے لوگ آج کے مقابلے میں زیادہ آمدن کے ساتھ ساتھ اصراف کی کم حاشی افادیت (Lower Marginal Utility of Consumption) کے حامل ہو سکتے ہیں..... اگر کوئی مستقبل کی فی کس آمدن میں اضافہ کے متعلق ہی پر امید نہ ہو تو یہ اصراف کو سرے سے ڈسکاؤنٹ ہی نہ کرنے کا ایک فطری جواز ہے۔“

(Cline, W.R., "The Economics of Global Warming", 1992, p.257)

بین النسلی (Inter-Generational) ڈسکاؤنٹنگ کے متعلق کلائن (Cost Benefit Analysis: An Informal Introduction, 1975) سے مشان (Mishan) کا یہ اقتباس پیش کرتا ہے:

”50 سال میں 10 فیصد شرح سے ڈسکاؤنٹنگ کر کے کسی چیز کی مستقبل کی قدر معلوم کرنے کا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں جو کسی طرح بھی اسے خود وصول نہیں کر پائے گا..... جب بھی کبھی بین النسلی موازنہ کیا جائے تو ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ مختلف اوقات میں معاشرتی قدر معلوم کرنے کا کوئی تسلی بخش طریقہ نہیں۔ ایسی صورتوں میں صفر کے برابر شرح ترجیح وقت اگرچہ غیر منطقی ہے مگر لوگوں کی موجودہ مزید ترجیحی شرحوں کے مقابلہ میں یا سود کی وہ شرح جو مارکیٹ میں قرضوں پر لگتی ہے کے مقابلے میں غالباً زیادہ قابل قبول ہے“

(Cline, W.R., "The Economics of Global Warming", 1992, p.239)

کولن پرائس ایک دفعہ پھر تبصرہ کرتا ہے:

”جہاں ہر شخص کی آمدن سرعت کے ساتھ (Exponentially) یکساں شرح سے بڑھے جہاں وقت کے ساتھ ذوق تبدیل نہ ہوں اور جہاں آمدن کی حاشی افادیت (Marginal Utility of Income) میں لچک ایک ہی سطح پر برقرار رہے جہاں طلب کے اضافہ کے مطابق ہر حالات میں اشیاء و خدمات (Goods and Services) کی کثرت کی باوثوق پیشگوئی کی جاسکے تو ایسی دنیا میں ایک ہی ڈسکاؤنٹ ریٹ سے حاشی اصراف کی اکائیوں (Marginal Units of Consumption) کی بلا خوف و خطر ڈسکاؤنٹنگ کی جاسکتی ہے..... اگرچہ علامات کی فہرست حقیقی دنیا کی قابل پہچان تصویر سامنے نہیں لاتی پھر بھی نسخہ وہی ہے جو معمول کے مطابق ہی دے دیا جاتا ہے۔“

(Price, C., "Time Discounting and Value", 1994, p.227)

آئندہ کل کی قدر آج ہی معلوم کر لینا لارڈ ہینسن (Lord Hanson) کی تجارتی کارروائیوں کی فلسفیانہ بنیاد تو ہو سکتی ہے مگر ہم سر کرستوفر رین (Sir Christopher Wren) کے شکر گزار ہیں جو

ہمیں گزشتہ کل کی قدر آج استعمال کرنے کی فہمائش کرتا ہے۔ ہینسن کے خیالات اپنائیں تو بینٹ پال کی بڑی جسامت کے گرجے بہت کم بنیں گے اور آئندہ نسلوں کے لئے بڑے بڑے بنیادی ہیاکل کے پراجیکٹ بھی بہت کم ہوں گے۔ جو لوگ اپنے مالی فیصلے ڈسکاؤنٹ کی بنیاد پر کرتے ہیں ان کے لئے مستقبل کے لمبے عرصہ پر مبنی قدر معلوم کرنا بالکل ہی بیکار ہے۔

سود کے جواز

(Justifications for Interest)

ہر معقول فلسفے کا یہ ایک لازمی جزو ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے انسان کرۂ ارض کو اچھی حالت میں برقرار رکھے مگر چونکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے حقوق کی قدر و قیمت معلوم کرنا ڈسکاؤنٹنگ کے ساتھ یعنی عملی طور پر سود کے ساتھ اتنا زیادہ منسلک ہے کہ ہمارے اوپر اپنی اولادوں کے متعلق جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بحث مستقبل کی سود کے تحت صورت حال سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔

نظریاتی بنیادوں پر سود کے اوپر انگلی اٹھانا ماضی قریب ہی کی بات نہیں۔ افلاطون (Plato) اسے امیروں کے ہاتھ غریبوں کا استحصال سمجھتا تھا۔ ارسطو (Aristotle) کا ایمان تھا کہ زر کو خرید و فروخت کے لئے استعمال ہونا چاہیے نہ کہ سود کے ذریعہ اضافہ کے لئے۔ عمر وڈیلو (Umar Vadillo) اپنی تصنیف "End of Economics, 1991" میں ہمیں بتلاتا ہے کہ رومیوں میں "Seneca" اور "Cicero" نے سود کے خلاف پرجوش دلائل دیئے ہیں۔ اور قدیم عیسائیوں میں "Augustinus" "Nysennas" اور "Acquinas" بھی ایسے ہی اس کے مخالف تھے۔

سود کی حرمت تورات اور بائبل میں بھی ہے:

”اگر تم میرے بندوں میں سے کسی غریب آدمی کو پیسہ دو تو تم قرض پر سرمایہ دینے والوں کی طرح نہ کرتا۔ تم ان سے سود ہرگز نہ لینا۔“

(Revised English Bible, "Deuteronomy" 22:25)

”تم اپنے ہم وطن ساتھی کو کوئی چیز ادھار دو پیسہ ہو یا خوراک یا کوئی اور چیز جس پر سود لیا جاسکے تو تم سود مت لینا۔“

(Revised English Bible, "Deuteronomy", 23:19)

تاہم بعد کے یہود نے سود کی حرمت سے مراد صرف اس قرض پر لے لی جو ایک یہودی دوسرے یہودی کو دے نہ کہ یہودی جو کسی غیر یہودی (Gentile) کو دے۔ بائبل کی یہ شہادت بعض حلقوں میں اس تاویل کے تمسخر کا سبب بنی کہ سود بڑی بری چیز ہے اگر یہودی سے لیا جائے نہ کہ غیر یہودی سے۔

”اگر تم غیر ہم وطن کو قرض دو تو سود لے سکتے ہو مگر ہم وطن سے نہیں اور پھر خدا تمہارا خدا تمہیں ہر اس زمین پر ہر کام میں برکت دے گا جس میں تم بقعہ کرنے کے لئے داخل ہو گے۔“

(Revised English Bible, "Deuteronomy", 23:20)

325ء کے دوران "Council of Nicea" میں شاہ قسطنطین (King Constantine) کے دباؤ کے تحت کچھ بنیادی اصولوں پر سمجھوتے کے باوجود کلیسا کے نمائندے سود کے موضوع پر متحد رہے۔ پادریوں کے درمیان سود منع تھا۔ بعد کی صدیوں میں سود کے موضوع پر یورپی تاجروں اور کلیسا کے درمیان ایک بہت تلخ کشمکش چل پڑی۔

سود پر کلیسا کی ممانعت کو چکر دے کر اس سے کئی کترانے کے لئے مختلف قانونی تدبیریں ایجاد کی گئیں۔ چاؤن (Chown) بعد کی ایک ایجاد "Contractum Trinius" کو بیان کرتا ہے کہ اس کے مطابق سرمایہ کار بیک وقت کسی آجر (Entrepreneur) کے ساتھ تین قسم کے عقد کرتا۔ بطور ناظم یعنی غیر فعال حصہ دار (Sleeping Partner) کے سرمایہ کار ہونا، ہر قسم کے نقصان کے خلاف بیمہ شدہ (Insured) ہونا اور ایک مقررہ سطح سے زائد منافع ایک طے شدہ سالانہ رقم کے عوض واپس آجر کو فروخت کرنا۔

”یہ تینوں معاہدے علیحدہ علیحدہ دیکھے جائیں تو سود کی شرائط سے بچ جاتے ہیں مگر مجموعی طور پر نتیجہ سود پر قرض لینے دینے کا ہی نکلتا ہے۔“

(J. F. Chown, "A History of Money", 1994, p.121)

سود پر مذہبی مراعات کی مفصل بحث جان نون (John Noonan) نے اپنی تحریر "The Scholastic Inquiry into Usury, Harvard University Press, 1957" میں کی ہے۔ 1220ء سے کچھ عرصہ پیشتر عیسائی مفتی ہسپینس (Hispanus) نے نشاندہی کی ہے کہ سود کے بغیر جو قرض دیا جائے اس کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں قرض دار کو ایک قیمت ادا کرنا ہوگی۔ یہ قیمت اس

نقصان کی تلافی کے لئے تھی جو دائن کو قرض کا سرمایہ مقررہ میعاد کے بعد واپسی تک کے درمیانی وقفہ کے لئے اپنا سرمایہ استعمال نہ کر سکنے کی وجہ سے ہوتا۔ یہ لاطینی لفظ "Interesse" کہلاتا ہے جس کا مطلب ہے "درمیان میں"۔ بعد میں یہی تبدیل ہو کر جدید لفظ "Interest" بن گیا۔ پھر چودھویں صدی عیسوی کے دوران فیصلہ کن اختراع آ گئی۔ اس بات کے دلائل پیش کئے گئے کہ صرف قرض ادا کرنے میں تاخیر کی صورت میں نہیں بلکہ قرض پر کچھ رقم قرض کے آغاز ہی سے وصول کرنی چاہیے۔ اس کے جواز کی دودلیلیں پیش کی گئیں۔ ایک "Cessans Lucrum" یعنی اس نفع سے محرومی جو دائن کو قرضہ دے کر برداشت کرنا پڑتی ہے اور دوسری "Damnum Emergens" یعنی وہ نقصان جو حقیقت میں دائن کو سرمایہ قرض دینے سے ہوتا ہے۔

مختلف لسانی ماخذوں کے مطابق دیگر مصنفین بھی سود کو اس نقصان کی تلافی تصور کرتے ہیں جو دائن کو اپنا سرمایہ استعمال نہ کر سکنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

"لاطینی لفظ "Usura" کا مطلب ہے کسی چیز کا استعمال اور زیر بحث صورت میں اس لفظ کا اطلاق ادھار سرمایہ کے استعمال پر ہوتا ہے۔ اس لئے سود ادھار سرمایہ استعمال کرنے کی قیمت ہے۔ لاطینی لفظ "Interreo" کا مطلب ہے نقصان ہونا جو کہ "Interisse" کی بنیادی شکل ہے۔ یہ بعد میں جدید لفظ "Interest" بن گیا۔ سود کا مطلب فائدہ نہیں بلکہ نقصان تھا۔"

(S. Homer & R. Sylla; "A History of Interest Rates", 1996, p. 73)

کاروباری دنیا میں سود پہ مبنی ناقابل امتناع کاروائیوں کا جب کلیسا کو سامنا ہوا تو اس نے اپنے اصولوں پر چپ سادھ لی۔ 1545ء میں ہنری ہشتم (Henry VIII) کے زیر سایہ انگریزی قانون نے زیادہ سے زیادہ 10 فیصد بطور نفع (Interest) وصول کرنے کی اجازت دے دی جب کہ 10 فیصد سے زائد وصولی کو سود (Usury) تصور کیا گیا۔ تین صدیاں پرانی سود (Usury) کے امتناع کو کمزور کرنے والی تجاویز کی توثیق ہو گئی۔ جلد ہی سود کے حامی حلقے قلیل الامکان مقامات میں سے بھی اپنے ہم خیال دانشور ڈھونڈ نکالنے میں مصروف عمل ہو گئے۔

"دونوں لوہر (Luther) اور ڈونگی (Zwingly) جیسے مصلح عیسائی سود (Usury) کی ملامت کرتے رہے لیکن جین کیلون (Jean Calvin) پہلا مصلح تھا جس نے سود (Usury) کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ اس کے شاگرد کلاؤ سامیرک (Claude Saumairc) نے ایک صدی بعد اپنی کتاب "Concerning Usury, 1638" میں دلائل

پیش کئے کہ سود لینا نجات (Salvation) حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔“

(Umer Vadillo: "The End of Economics, 1991, p.17")

انجام کار 1917ء میں کلیسا نے رسمی طور پر آخری قدم اٹھا کر سود کو تسلیم کر ہی لیا۔ اس سال گزشتہ کلیسائی قانون کی جگہ "Codex Iuris Canonici" نے لے لی۔ سود کے متعلق اس سوچ کو ٹونن مندرجہ ذیل اقتباس میں بیان کرتا ہے۔

..... کسی ملکی (Fungible) چیز کو قرض دینے سے قانون کے مطابق نفع حاصل کرنا ناجائز نہیں جب تک کہ صاف طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ اعتدال سے بڑھ کر ہے بلکہ زیادہ نفع بھی جائز ہے اگر منصفانہ اور موزوں دستاویز موجود ہو۔“

(Codex Iuris Canonici, Rome, 1920, C.1735)

علمائے اسلام نے سود کی ہمیشہ ملامت کی ہے:

”اے لوگو جو ایمان لائے اللہ سے ڈرو اور سود میں جو کچھ بھی باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ (البقرہ: 278)

مگر بعض کے خیال میں یہاں بھی عملی راہیں نظریہ سے ہٹ گئی ہیں:

”قرآن سود لینے سے منع کرتا ہے اگرچہ اس حکم امتناعی کو چکر دے کر اس سے کئی کترانے کے مختلف طریقے ایجاد کر لئے گئے ہیں۔“ (ملاحظہ ہو) ”مستقبل میں ملتی کی جائے تو اشیاء کی قیمت اُن کی موجودہ قیمت سے زیادہ وصول کی جاسکتی ہے۔“

(Encyclopedia Britannica, 1996)

مذہبی حلقوں کے سود کے خلاف احکامات کو آج کل اکثر خفت آمیز قدامت پسندی سمجھا جاتا ہے۔ جس کا محرک شاید قدیم دامنین سے کراہت ہے۔ سود کے حامی اور چالاک ماہرین معاشیات کو اکثر اوقات مذہبی دلائل کمزور اور غیر منطقی نظر آتے ہیں۔

چنانچہ سود کا جواز پیدا کرنے کی کوشش میں اور پھر اس کی شرح کی سطح بتلانے کے لئے مختلف قسم کے بظاہر منطقی اور معقول دلائل تخلیق کئے گئے ہیں۔ جواز کے لئے جو نمایاں دلائل ہیں وہ ہیں متوقع افراط زر، مثبت ترجیح الزمن (Positive Time Preference)، نقصان کا خطرہ اور ہامشی افادیت (Marginal Utility) میں کمی۔ یہ تمام جوازات مستقبل پر حال کی فوقیت جتلاتے ہیں اور پھر مستقبل کے زر کے عوض جو آج کے زر سے دستبردار ہوتا ہے اس کی تلافی کے لئے سود کی ضرورت بیان کرتے ہیں۔

وضاحت کے لئے قابل بیان امر یہ ہے کہ روایتی نظریہ کے مطابق سود دراصل زر کی وہ قیمت ہے جو زر کی رسد اور ضرورت کی بنیاد پر مارکیٹ میں متعین کی جاتی ہے۔ کینز نے اس کے متبادل یہ دلائل پیش کئے کہ زر ایک ایسا اثاثہ ہے جس کا دوسری طرح کے اثاثوں کے ساتھ فوری مبادلہ ہو سکتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ سب سے زیادہ سیال (Liquid) اثاثہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف عوامل اس کی اس قیمت یعنی سود کی شرح کا تعین کرتے ہیں جو اس کی سیولت (Liquidity) حاصل کرنے کے لئے ادا کی جائے۔ سود کی شرح کی سطح معلوم کرنے کے طریقوں کے بجائے یہاں ہماری دلچسپی اس کے جوازات سے ہے اور اس سلسلے میں کچھ تفصیل بیان کرنا ضروری ہے۔

یہ تصور کہ سود کا عنصر کسی نہ کسی طرح سے افراط زر کے اثر کی تلافی کرنے کے لئے جائز ہے سب سے زیادہ عام ہے۔ دائن اپنے سرمایہ کی ابتدائی قوت خرید برقرار رکھنے کے لئے متوقع افراط زر کے مطابق سود کی ایک مخصوص رقم شامل کر دیتا ہے۔ اپنی پس انداز پونجی کو افراط زر سے بچانے کی خواہش بالکل قابل فہم ہے اور یہاں اس پر تنقید نہیں کی جا رہی۔ تاہم افراط زر والی دلیل متوقع افراط زر سے زائد سود وصول کرنے کی شرح کی وضاحت نہیں کرتی۔ فی الحال میں (مصنف) اپنی توجہ صرف حقیقی (Real) سود کی شرح پر مرکوز کروں گا۔ یہ وہ مقدار ہے جس کے برابر کسی مخصوص دورانیہ کے لئے بتائی گئی (quoted) سود کی شرح یعنی رسمی سود کی شرح (Nominal Rate of Interest) متوقع افراط زر کی شرح سے تجاوز کرتی ہے۔ میں بعد میں ان دلائل کو زیر بحث لاؤں گا جن سے افراط زر کو سود کا سبب بیان کیا جاتا ہے اور باب نمبر 2 میں دلائل سے واضح کروں گا کہ اکثر اوقات حقیقت بالکل اس کے برعکس ہوتی ہے۔

اپنی تحریر "Outline of the Science of Political Economy, 1836" میں انگلش ماہر معاشیات ناسو سینئر (Nassau Senior) نے سود لینے کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ دائن کو اپنا سرمایہ خرچ کرنے (Consumption) سے رکنا پڑتا ہے۔ دائن کا اپنا سرمایہ خرچ کرنے سے رکنے کا انعام سود ہے۔ سینئر کے نقاد کہتے ہیں کہ نسبتاً دائن عموماً متمول ہوتے ہیں جنہیں (قرض پر دیئے گئے زر کو) خرچ کرنے کی ضرورت ہی بالکل نہیں ہوتی۔ اس لئے جیسا اس کی زندگی کا رہن بہن قرض دینے سے پہلے

تھا اگر ویسا ہی بعد میں بھی رہتا ہے تو سوال پھر وہی ہے کہ سود کیوں؟

الفریڈ مارشل (Alfred Marshall) نے کچھ عرصہ بعد سینئر کے نظریہ میں ایک اصلاح تجویز کی۔ اس نے کہا کہ سرمایہ خرچ کرنے سے رکے رہنے نے قرض دینے والے کو سود لینے کا حق نہیں دیا بلکہ سرمایہ واپس آنے کا انتظار سود کی وجہ ہے۔ اس نظریاتی اصلاح کے مطابق قرض دے کر متمول لوگوں کے لئے بظاہر سرمایہ خرچ کرنے سے رکے رہنے کی محرومی کوئی مسئلہ نہیں لیکن بہت سے لوگ تو اس وقت بھی انتظار کرتے ہیں (دوسرے الفاظ میں بچت کرتے ہیں) جب سود کی شرح صفر ہوتی ہے۔ اس طرح کے سوالیہ ذہن کے لئے مارشل کی وضاحت بھی تسلی بخش نہیں ہے۔

1893ء میں "Eugene Bohn-Bawerk" نے (مندرجہ بالا سوال پر) اپنا جواب پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق انسان خوشگوار حالات جلد دیکھنا پسند کرتا ہے اور تکلیف دہ حالات بعد میں۔ بالفاظ دیگر انسان کی مثبت ترجیح الزمن (Positive Time Preference) رکھتا ہے۔ سود کے جواز کے لئے اسے بالعموم ایک بہت کامیاب نکتہ سمجھا گیا۔ "Bohn-Bawerk" نے کہا کہ سرمایہ کا مالک اپنی ضروریات اب پوری کرنا چاہتا ہے نہ کہ بعد میں اس لئے آج کا سرمایہ کل کے سرمائے سے بہتر ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ کئی صورتوں میں لوگ مستقبل کے لطف کو آج کے لطف پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا شخص بھی اگلے ہفتے کے ناشتوں کا پورے کا پورا لطف آج ہی اٹھا لینے پر اگلے ہفتے میں ہر روز لطف لینے کو ترجیح دے گا۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ آج سرمایہ خرچ کرنے کو کل خرچ کرنے پر ترجیح دے تو وہ ایسے سرمایہ کو کیونکر ترجیح دے گا جو کل کے خرچ کے بجائے آج کے خرچ کا ذریعہ بنے؟ مگر "Bohn-Bawerk" کہتا ہے کہ جب آج کی ضروریات پوری ہو جائیں تو پھر نفع حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کاری کل کے بجائے آج کرنا چاہیے۔ یعنی ہمیں یہ بتلایا جا رہا ہے کہ آج کا سرمایہ بہتر ہے چونکہ یہ آج ہی مزید سرمایہ پیدا کر سکتا ہے۔

سود کی کسی خاص شرح کا ایک عنصر بالعموم ممکنہ خطرہ (Risk) کی تلافی کرنا بھی مانا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دائن خیال کر سکتا ہے کہ وہ قرض کی واپسی تک زندہ نہ رہے گا اس طرح بوڑھا آدمی جوان کے مقابلہ میں خرچ کرنے کو ملتوی کرنے کا معاوضہ کافی زیادہ لینا چاہے گا۔ ویسے دائن بھی قرض

خواہوں میں امتیاز کر کے زیادہ خطرے والے قرض خواہوں کو زیادہ سود کی شرح پر قرض دیتے ہیں۔ مستقبل میں قرضے کی واپسی جتنی زیادہ غیر یقینی ہوگی اتنی ہی سود کی شرح بھی زیادہ ہوگی۔ اس لئے زیادہ پر خطر قرض میں خطرے کے معاوضے (Risk Premium) کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

خطرے کی قیمت لگانے کے لئے قرض خواہ کے ماضی بعید ماضی قریب کے واقعات کا حسابی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کیا کمپنی کے پاس وافر مقدار میں نقدی موجود ہے؟ کیا یہ پہلے کبھی قرض کی عدم ادائیگی کا شکار ہوئی ہے یا اس کے قریب کبھی آچکی ہے؟ اس قسم کی شہادت کی بنا پر "Standard & Poor's" اور "Moody's" جیسی کریڈٹ کی درجہ بندی کرنے والی ایجنسیاں ہر قرض خواہ کی اہلیت کے متعلق بیانات جاری کرتی ہیں جس میں ہر قرض خواہ کے کریڈٹ کی درجہ بندی (Credit Rating) کی جاتی ہے۔ دائن جس سود کی شرح سے قرض خواہ کو قرض دیتے ہیں اس شرح سے بھی اس کے کریڈٹ کی درجہ بندی کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے اس طرح سے سود کی شرح جو آئندہ خطرے (Risk) کے مطابق سمجھی جاتی ہے درحقیقت ماضی کے تخمینوں پر مبنی ہوتی ہے۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل کا علم کسی کو نہیں پھر بھی آج کے جدید دائن زیر غور قرض خواہ کے مطابق خطرے کے معاوضے میں تھوڑی کمی بیشی کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ (ایسی ناقابل علم چیز کے متعلق کیسا ہی درست اندازہ لگا لیتے ہیں!) پرائس (Price) تبصرہ کرتا ہے کہ کسی قرض میں سود کی ایک مقررہ مقدار شامل کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطرے کی سطح زیر غور وقت کی طوالت کے دوران متغیر نہیں جبکہ اس کا جواز تو بالکل ہی غیر واضح ہے۔ مثال کے طور پر بازار میں کسی قرض خواہ کے اچھا خاصا مستحکم ہو جانے سے اس کے خطرے میں کمی آسکتی ہے۔

بلا خطر سودی شرح (Risk-Free Rate of Interest) کے متعلق بھی تھوڑی بہت بحث ضروری ہے۔ یہ تو واضح ہو چکا کہ اکثر اوقات مادی دولت کو بغیر کوئی قیمت ادا کئے برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا اور یہ بھی واضح ہو چکا کہ ایسی دولت بغیر کسی خطرے کے ہرگز برقرار نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ کئی واقعات مادی سرمایہ کی قدر کو کم کر سکتے ہیں مثلاً چوری یا آتش زدگی۔ اس لئے مادی دنیا میں کوئی چیز خطرے سے خالی نہیں۔ درحقیقت متقاضی معیشت (Barter Economy) میں سرمایہ کار زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا

ہے کہ اپنی دولت کو ذخیرہ کرنے میں جو ممکنہ خطرات ہیں انہیں کم سے کم کرے۔ محفوظ انداز سے ذخیرہ کی گئی مادی دولت سے متوقع نفع کی حقیقی شرح اسے ذخیرہ کرنے یا برقرار رکھنے کی لاگت کی وجہ سے عموماً نفی میں ہوگی۔ اسے مقلل خطرے (Risk-Minimised) کی نفع پینی شرح کہہ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جدید مالی نظریہ کہتا ہے کہ بلا خطر سودی شرح نفع کی وہ مثبت شرح ہے جو سرمایہ کار کسی بلا خطر مالی اثاثے میں سرمایہ کاری کر کے وصول کرتا ہے۔ زر کی رقم جو حکومت کو قرض دی جائے اور سود کی رقم جو اس سے وصول کی جائے بلا خطر سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ حکومت ٹیکس لگا کر، ادھار لے کر یا مزید کرنسی چھاپ کر اپنا ادھار واپس کر دے گی۔ یہ تینوں اختیارات جدید حکومت کے پاس یقیناً ہیں تو سہی مگر چونکہ حکومت قرض لئے گئے سرمایہ کو آگے قرض دے کر بلا خطر نفع حاصل نہیں کر سکتی اس لئے مذکورہ اختیارات بالآخر بلا خطر حقیقی نظام کے دباؤ کے تحت اپنی ذمہ داری آگے دوسروں تک منتقل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔ بلا خطر سودی شرح کا وجود مالی معیشت میں گہرے اثرات رکھتا ہے۔ چونکہ حکومت بلا خطر قرض خواہ ہے اور ایک مقررہ سود کی شرح ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس لئے دائنین کسی کو بلا خطر سودی شرح سے کم شرح پر قرض دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ بلا خطر سودی شرح کم ترین شرح بنتی ہے جس پر قرض خواہ مالی قرض حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ وہ شرح ہے جو رباب اختیار حقیقی معیشت میں قابل حصول نفع کا اکثر لحاظ کئے بغیر ہی مقرر کر لیتے ہیں۔

سود کے لئے ایک متبادل اور کافی پسندیدہ جواز یوں پیش کیا جاتا ہے کہ سرمایہ کے اصراف (خرچ) کر لینے کی هامشی منفعت (Marginal Utility) گرتی جا رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سرمایہ کے اصراف کی آئندہ اکائی اصراف کی گزشتہ اکائی سے فائدہ میں کم درجہ قدر رکھتی ہے۔ چونکہ حقیقی آمدنیاں وقت کے ساتھ بڑھتی ہیں اور مستقبل کا اصراف موجودہ اصراف سے زیادہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں هامشی منفعت کم ہو رہی ہے چنانچہ مستقبل کے اصراف کی ایک زائد اکائی موجودہ اصراف کی ایک زائد اکائی سے کم منفعت بخش ہے۔ اس لئے موجودہ اور مستقبل کی منفعت کا موازنہ اس سود پر منتج ہوتا ہے جو زر کی رقم کے استعمال پر وصول کیا جاسکتا ہے۔

هامشی منفعت کے متعلق جوابی رد عمل یہ ہے کہ مستقبل کے وقفوں میں آمدن کا بڑھنا ضروری نہیں

جس کی وجہ سے مستقبل کے وقفوں میں ہامشی منفعت کا لازمی طور پر گھٹنا بھی ضروری نہیں۔ ان حالات میں حسابی تجزیہ کے لئے ڈسکاؤنٹ کا عمل ایک بالکل غیر مناسب آلہ کار ہوگا۔ درحقیقت حقیقی آمدن میں کمی واقع ہونے کی طویل داستانیں ہیں جس کا تجربہ انسان کو ہو چکا ہے۔ امریکہ میں معاشی کارگزاری کے تجزیہ کے لئے مجموعی نجی پیداوار کے زیادہ تر روایتی پیمانہ کو استعمال کرنے کے بجائے نارڈ ہاؤس اور ٹوبن (Nordhaus & Tobin) نے اپنا معاشی فلاح کا پیمانہ (Measure of Economic Welfare) استعمال کر کے ثابت کیا ہے کہ حقیقی آمدن کم ہو رہی ہے۔

جہاں اعداد و شمار یہ ثابت کر رہے ہوں کہ حقیقی آمدن بڑھ رہی ہے وہاں بھی کئی منفعتیں ایسی قسم کی ہیں جو محض زر کو خرچ کر کے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ آلودگی سے پاک فضا ان میں سے ایک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ صارف کے لئے کل کی صاف فضا کی ایک اکائی بمقابلہ آج کی صاف فضا کی ایک اکائی سے کم منفعت بخش ہے؟ دراصل اس بات کے دلائل دیئے جاسکتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر حقیقی آمدن میں مسلسل اضافہ کے مفروضہ کو درست بھی مان لیا جائے تو پھر بھی ہامشی منفعت کا انحصار اس بات پر ہے کہ آمدن میں اضافے کا حساب لگانے کے لئے مناسب طور پر کوئی آمدن کی نشاندہی کی جائے۔ کیا امیر لوگوں کی آمدن کو مد نظر رکھا جائے یا غریبوں کی آمدن کو یا قومی اوسط کو؟ پرائس (Price) یوں رقم طراز ہے:

”چنانچہ سماجی ڈسکاؤنٹ ریٹ کو اگر اوسط آمدن کے اضافہ کی شرح پر متعین کیا جائے تو امیروں کی آمدن میں بہت زیادہ اضافہ نظر آئے گا اور غریبوں کے اصراف کی تعمیر پذیراہیت میں زیادہ کمی نظر آئے گی۔ جہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جا رہے ہوں سماجی ڈسکاؤنٹ ریٹ بہت ہی زیادہ ہوگا جس سے غلط نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

(Price, C., "Time Discounting and Value", 1994, p.236)

جدید معیشت میں سود کی شرح کی سطح کو واضح کرنے کے جتنے بھی دلائل ہیں ان میں سب سے آسان وہ ہے جس میں سود کو بطور زر کی قیمت (Price of Money) تصور کیا جاتا ہے۔ اس انداز فکر کے مطابق زر ایک ایسی چیز ہے جو اشیاء و خدمات کی طرح قابل خرید و فروخت ہے۔ پھر سود کی شرح وہ ہے جس سے ادھار اور بچت برابر ہو جائیں۔ 1990ء کی "UK Budget Red Book" کے مطابق:

”.....سود کی شرح زر اور ادھار کی قیمتیں ہیں۔ زر کی رسد پر اثر انداز ہونے کا بہترین طریقہ اس کی قیمت کو تبدیل کرنا ہے۔“

باب نمبر 2 میں تفصیل کے ساتھ اس "Red Book" کے نظریہ کی تردید کی جائے گی۔ یہاں ہم اینٹراپی کے قانون کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب زر ایک دفعہ بیچ دیا جائے تو پھر فروخت کے معاملہ کے اختتام پر اسے فروخت کنندہ کو واپس کیوں کیا جائے؟ البتہ زر تو بیچا نہیں جاتا یہ تو صرف سود پر ادھار دیا جاتا ہے پھر سود زر کی قیمت کیسے ہوئی؟ اسی لئے اکثریت سود کو زر کا کرایہ تصور کرتی ہے۔ اب سود اگر زر کا کرایہ ہے تو یہ ادھار پر دی جانے والی دوسری اشیاء کی طرح نہ ہوا کیونکہ استعمال سے یہ فرسودہ نہیں ہوتا اور قرضدار کی حاصل کردہ منفعت کے ساتھ زر کے کرایہ کی ادائیگیوں کا بھی کوئی تعلق نہیں کیونکہ ممکن ہے قرضدار نے قرض پر لیا زر نفع بخش کاروبار میں نہ لگایا ہو۔ اس کے برعکس پہلے دی گئی مثال میں بیل جیسی ادھار پر دی گئی شے استعمال کرنے سے فرسودہ بھی ہوتی ہے اور استعمال کے دوران ایک معلوم شدہ منفعت بھی بہم پہنچاتی ہے۔

سب سے زیادہ سیال (Liquid) زر کی شکل میں اثاثوں کو ذخیرہ کرنے کی کینز (Keynes) تین وجوہات پیش کرتا ہے۔ ایک لین دین یعنی کاروبار کرنے کی ضرورت۔ دوسری ناگہانی واقعات سے حفظ ما تقدم کے لئے زر کو ذخیرہ کرنے کی ضرورت اور تیسری ذخیرہ کرنے والے کو مالی قیاس آرائی کا موقع بہم پہنچانے کی اہلیت۔ کینز کے مطابق جب زر کو ادھار دے دیا جائے تو اس کی سیولت ختم ہو جاتی ہے اس لئے قرض دینے والا سیولت کے فائدے سے دستبرداری کے عوض سود وصول کرتا ہے۔ یہ افکار سیولت کے ترجیحی نظریہ (Liquidity Preference Theory) کے اندر بیان کئے گئے ہیں جو معیشت میں زر کی رسد اور اسے ذخیرہ کرنے کی طلب کے مطابق سود کی شرح مقرر کرنے کا مختصر ماڈل ہے۔

پرائس (Price) سیولت کے مختلف دلائل پر یوں تنقید کرتا ہے:

”وقت کی ترجیحی بنیاد (Time Preference Sense) سے یہ واضح نہیں کہ آج کی سیولت کا کاروبار یا حفظ ما تقدم یا مالی قیاس آرائی کے محرکات کے لئے (فائدہ اٹھانے کے لئے) آئندہ سال کی اتنی ہی سیولت قربان کر کے آخر کار کوئی شخص کیسے زیادہ فائدے میں رہے گا۔ درحقیقت یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ سیولت محض زر کو جلد کہیں لگا دینے کا موقع فراہم کرتی ہے یعنی سیولت کو جلدی کھودینے کا موقع دیتی ہے۔ حالانکہ زیادہ سا زکا ر وقت پر وسائل حاصل کرنے کی اہلیت زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے یعنی ایسا وقت جب اشیاء کی قیمت کم ترین ہو یا ایسا وقت جب ان کی کوئی کچھ مخصوص ضروریات پوری کر سکے۔ مگر فائدہ جلدی حاصل کر لینے سے مستقبل کے فائدے کی نفی ہو جاتی ہے۔ نفع کی شرح میں سیولت کے عنصر کا انعام شامل کر لینے سے جلدی کی

یہ بات بھی ملاحظہ ہو کہ کینز کے مطابق معیشت میں مختلف عوامل کے نتائج روایتی فکر سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ روایتی فکر کے مطابق تو سود کی شرح میں اضافے سے بچت میں اضافہ ہوگا مگر کینز کے مطابق لوگوں کی بچت بڑھنے کا مطلب ان کے اصراف میں کمی ہے اور اشیاء و خدمات کے لئے اصراف کی کمی کے نتیجے میں کاروباری لوگ اپنے عملے کو برخاست کر دیں گے۔ چنانچہ معیشت میں مجموعی اجرتی آمدن کم ہو جانے سے مجموعی بچت میں کمی واقع ہوگی۔ اس لئے سود کی شرح میں اضافہ مجموعی بچت میں کمی کا سبب بن سکتا ہے جو روایتی مفکرین کے نظریات کے برعکس ہے۔

سودی اشراح سے قطع نظر زر قرض دینے والے کی شرائط اور جس کام کے لئے وہ سرمایہ کاری کر رہا ہے کے درمیان بہت فرق ہے۔ مثال کے طور پر قرض لئے گئے زر سے کسی منصوبے کی سرمایہ کاری کر کے جو محاصل وصول ہوں گے وہ قرض کی مدت کے دوران نہ تو مقدار میں ہر مرتبہ ایک جیسے ہوں گے اور نہ ہی پہلے سے متعین اوقات پر حاصل ہوں گے۔ چنانچہ اگر منافع باقاعدگی کے ساتھ اور متعین انداز کے مطابق حاصل نہ ہو تو سود کو مرکب کرنے کے سلسلے (Compounding Process) کی طرح قرض دار اس منافع سے باقاعدگی کے ساتھ آگے مزید سرمایہ کاری کیسے کر سکتا ہے؟ اگر نفع کی مقررہ شرح کے مطابق دوبارہ سہ بارہ سرمایہ کاری فرض کر کے ہر بار ترسیل زر ممکن بھی ہو تو پھر بھی لگائے گئے سرمایہ پر قلت پذیر ہاشمی محاصل (Diminishing Marginal Returns) کو مالی حساب کتاب کوئی چیز نہیں سمجھتا۔ مرکب سود حقیقی دنیا کے سلسلوں کو اس مفروضے کے تحت سادہ شکل دیتا ہے کہ قرض کی پوری مدت کے دوران نفع کی شرح ان سلسلوں میں غیر متغیر رہتی ہے۔

اگر کسی موقع پر کسی نفع بخش سلسلے کی پیداوار سے لطف حاصل کرنا مقصود ہو تو اس حصول لطف کو ترسیل منافعت (Flow of Utility) کہیں گے۔ ترسیل زر (Flow of Cash) کی تو دوبارہ سرمایہ کاری ہو سکتی ہے۔ ترسیل منافعت مثلاً گرم پانی سے غسل کے لطف کے لئے یہ بات ممکن نہیں۔ سود مرکب میں ہر بار سود کو اصل زر کے ساتھ ملا کر اس کی مکمل طور پر سرمایہ کاری فرض کر لی جاتی ہے جس کا لامحالہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں سودی محاصل کا اصراف نہیں ہو سکتا۔

پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ سود کو مرکب کرنا طبعی دنیا کی استعدادی حدود کا لحاظ نہیں کرتا اور سود کی وہ بلند شرح جو کاروباری اداروں پر ٹھونسی جاتی ہے اس کو پورا کرنے کے لئے کاروباری ادارے مادی سرمایہ کی پیداوار بڑھا کر وسائل بڑھانے کی شرح یا توانائی کے اصراف یا دونوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد تکنیکی پیش قدمیوں نے ترقی یافتہ معاشروں کو اگرچہ ایسا کرنے کی اہلیت تو مہیا کر دی ہے مگر ایسی پیش قدمیوں کے بُرے نتائج ناگزیر ہیں جن کو صرف ملتوی ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ اتنا کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو، جو کہ درحقیقت ہو بھی سکتا ہے، پھر بھی ہمارے سابقہ دلائل اس اینٹراپی پذیر ارضی نظام پر پیداوار میں اضافہ کے بھیاںک نتائج کی پیشنگوئی کرتے ہیں۔ آلودہ دریا، گلے سڑتے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر اور وسائل سے خالی سمندر اس قیمت کی صرف پہلی قسط ہو سکتے ہیں جو مرکب سود کی دوڑ کی وجہ سے ہم نے ادا کرنی ہے۔

روایتی مفکرین کہتے ہیں کہ اصراف کے لئے دستیاب اشیاء (Goods) کے انتخاب اور معیار بڑھانے کے لئے معاشرہ کی اہلیت کے پیش نظر روٹیوں والی مثالیں لغو ہیں۔ مگر روٹیاں ہی تو صرف ایک چیز نہیں جو انسان صرف کرتا ہے۔ 1995ء میں روٹیوں کا ادھار چکانے کے لئے 7×10^{42} روٹیاں ہم بیشک تیار نہ کر پائیں مگر ہم کاریں اور جہاز تو پیدا کر سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی ایسی صرف ایک پیداوار بھلا کتنی روٹیوں کے برابر ہے؟ 22 والے انسان کے لئے یقیناً لاتعداد!

بد قسمتی سے روایتی مفکرین کی مذکورہ بالا تنقید ایک ایسی دلیل ہے جو وقت کے ساتھ پیداوار کے بدل کو تو بیان کرتی ہے مگر روٹیوں کی مثال کے مرکزی نکتہ کو زیر بحث نہیں لاتی۔ روٹیوں کو مادی وسائل سمجھا جائے تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ روٹیاں زیر بحث ہوں یا ہوائی جہاز۔ مسئلہ یہ ہے کہ سودی حساب کتاب کے مطابق مادی دنیا میں پیداوار کا تعین کیا جائے تو وقت کے ساتھ اینٹراپی میں بتدریج زیادہ اضافے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ توانائی جہاز بنانے میں صرف ہو یا اتنی ہی توانائی روٹیاں تیار کرنے میں۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں توانائی کا اصراف بڑھتا ہے توں توں ارضی اینٹراپی بھی بڑھتی ہے۔

مستقبل کو زیادہ دلکش بنانے کے لئے ہمیں سب سے پہلے موجودہ خامیوں کی مکمل طور پر

نشاندہی کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ تک دیئے گئے دلائل اگر ہدف عقیدہ بنتے ہیں تو وجہ عاہیہ ہو سی ہے کہ ان کا انحصار زیادہ تر مادی سلسلوں پر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثالوں کے لئے مادی سلسلے ہی استعمال کئے گئے ہیں جس کے لئے میں (مصنف) کوئی معذرت خواہ نہیں ہوں۔ صنعت اور حقیقی یعنی مادی دنیا کے سلسلوں میں سرمایہ کاری نو کر ہے نہ کہ مالک۔ مالی نظریات کے اندر ہمیں چاہیے کہ اس حقیقت کو زیر بحث لائیں۔ جب تک کوئی مخالف دلیل سامنے نہیں آ جاتی ہے میرا ایمان ہے کہ مادی دنیا کے سلسلوں نے ہی ہمیں زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس لئے انہی کو اہمیت ملنی چاہیے۔ ہرمن ڈیلی (Herman Daly) سوڈی کے کام پر اپنے ایک ریویو میں یوں بہترین تبصرہ کرتا ہے:

”اگر مادی دولت کی پیداوار اور تقسیم کو تاپنے کا پیمانہ قرض اور زر ہیں تو پھر یقیناً تاپنے کے پیمانے اور ناپی جانے والی حقیقت کو علیحدہ علیحدہ قوانین کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مادی دولت کی نمو مرکب سود کی طرح نہیں ہو سکتی تو پھر قرض کو بھی ایسے نہیں بڑھنا چاہیے۔“

(H. Daly in G. B. Kaufman: Frederick Soddy 1877-1956, 1986)

جب صنعتکار اور ماہرین ماحولیات بینکاروں کے انداز فکر کی شکایت کرتے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس دنیا میں رہ کر وہ اپنا کاروبار چلا رہے ہیں اس دنیا کی حقیقت اور سرمایہ کاری کے مابین تضاد اُن کا محرک ہے؟ یا کیا دانشمندان کی کاروائیوں سے بیزاری اُن کا محرک ہے؟ ہم نے دیکھا کہ سرمایہ کاری کا جدید نظریہ معاشی کاروائیوں پر گہرا اثر اڑا ل سکتا ہے چنانچہ اب آئندہ بحث مالی نظام کے ڈھانچے پر مرکوز ہوگی۔



زر کی پیداوار (The Production of Money)

اس باب میں زر کی دو شکلوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک زر تو وہ ہے جو جدید حکومت نوٹوں اور سکوں کی شکل میں پیدا کرتی ہے اور دوسرا زر وہ ہے جو تجارتی بینک پیدا کرتے ہیں۔ یہاں جزوی زیر محفوظ کی بینکاری (Fractional Reserve Banking) کی تکنیک (Technique) کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے تحت بینک تخلیق زر (Money Creation) کرتے ہیں اور اس کے نمو کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بینکاری کو بطور ایک صنعت دیکھا گیا ہے جس کی پیداوار زر ہے۔ نجی اداروں کو تصنیع زر یعنی زر کی صنعتکاری (Manufacture) کرنے اور اسے سود پر قرض دینے کا اختیار دینے کے نتائج کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

سونے سے رسیدوں تک (From Gold to Receipts)

زر ایک سے زیادہ شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ مختلف ادوار اور مختلف مقامات پر مختلف اشیاء زر کا وظیفہ سرانجام دیتی رہی ہیں جن کی چند مثالیں نمک، کاغذ اور سونا ہیں۔ اگرچہ زر کسی خاص تعریف کے تحت نہیں آتا مگر بالعموم یوں سمجھا جاتا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو اشیاء و خدمات (Goods and Services) کے عوض آسانی سے قابل قبول ہوتی ہے۔ اس بنا پر پانچ پونڈ کا نوٹ یا ضمانت شدہ پانچ پونڈ کا چیک دونوں کا مبادلہ پانچ پونڈ کی قیمت کی اشیاء و خدمات سے کیا جاسکتا ہے لہذا دونوں ہی زر کی شکلیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نوٹ سرکار جاری کرتی ہے جب کہ چیک بک اور کریڈٹ کارڈ تجارتی بینک

جاری کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل بحث میں سرکاری زر (State Money) اور بینکی زر (Bank Money) میں تمیز کرنا نہایت اہم ہوگا۔

انگلستان میں جدید بینکاری کی ابتدا کا سراغ کم از کم ستارہویں صدی کے وسط تک ملتا ہے جس کا ماخذ صرافوں کی کاروائیاں تھیں۔ لوگوں سے صراف قیمتی دھات کے سکوں کی شکل میں امانتیں لیتا تھا جو کہ طلائی ہوتے تھے کیونکہ یہ اس وقت کا سرکاری زر تھا۔ ابتدا میں یہ صراف ہی بینک تھے جو صرف حفاظتی تحویل کے لئے تھے جن کے پاس محفوظ تجوریاں ہوتی تھیں جہاں کچھ فیس کے عوض لوگوں کی امانتیں رکھی جاتی تھیں۔ امانت وصول کر کے صراف امانت رکھوانے والے کو امانت کی مقدار کی توثیق کے لئے ایک حامل رسید (Bearer Receipt) جاری کرتا تھا۔ بعد میں امانت رکھوانے والا یا اس رسید کا حامل صراف کو وہ رسید دے کر امانت واپس لے سکتا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا صراف بینکاروں نے محسوس کیا کہ ان کے گاہک سرکاری زر کو زیادہ وقت بطور امانت ہی پڑا رہنے دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چوری سے بچنے کے لئے ایسے بینک کی تحویل میں رکھا ہو اس سرکاری زر اپنے گھر کی تحویل سے زیادہ محفوظ تصور کیا جاتا تھا اور مجموعی طور پر ایسے بینک سے جو تھوڑا بہت سرکاری زر کسی دن نکالا بھی جاتا تو اس کی کمی عموماً اسی دن نئی امانتیں پوری کر دیتی تھیں۔

ادھر صرافوں کے گاہکوں نے دیکھا کہ اشیاء و خدمات کی ادائیگی کے لئے تاجر صرافوں کی جاری شدہ رسیدیں ہی قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صرافوں کی جاری شدہ رسیدیں بینکی زر بن گئیں۔ اس لئے امانتیں رکھوانے والے صرافوں کے پاس جا کر طلائی سکے نکالوانے کے بجائے مطلوبہ رقم کے برابر تاجر کو ادائیگی کے عوض حامل رسیدیں ہی دے دیتے تھے۔ پھر صراف سے تاجر ان رسیدوں کے عوض طلائی سکوں کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ مگر اکثر اوقات وہ بھی اپنی خریداری کی ادائیگی کے لئے وہی رسیدیں استعمال کر لیتا تھا اور اس طرح کچھ عرصہ تک وہ رسیدیں ہی گردش کرتی رہتی تھیں۔

صرافوں نے جان لیا کہ ان کی رسیدیں ہی اگر زیادہ عرصہ کے لئے گردش کرتی رہتی ہیں تو ان کی تجوریوں میں پڑا سونا تو غیر مستعمل رہتا ہے۔ صاف ظاہر ہے ان غیر مستعمل سونے کے ذخیروں کا استعمال یہ تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو سود پر قرض دے دیئے جائیں جو قابل اعتبار ہوں اور قرض لینا

چاہتے ہوں۔ تاہم صراف بہت احتیاط سے کام لیتا تھا کہ کہیں طلائی سکوں کا زیادہ ذخیرہ قرض پر نہ چلا جائے۔ وہ اتنی کافی مقدار میں ذخیرہ اپنے پاس رکھتا تھا کہ ضرورت کے مطابق اپنے گاہکوں کی رسیدوں کو کیش یعنی نقد میں تبدیل کرنے کا مطالبہ پورا کر سکے۔ جاری شدہ رسیدوں کے عوض ذخیرہ شدہ سکوں کا تناسب نقد زرمحفوظ کی شرح (Cash Reserve Ratio) کہلایا۔ چونکہ کسی ایک دن میں کیش ہونے والی رسیدیں عموماً کم ہی ہوتی تھیں اس لئے اکثر حالات میں محفوظ طریقے سے اپنا کام چلانے کے لئے بینک کو صرف قلیل نقد زرمحفوظ کی شرح کی ضرورت ہوتی تھی۔

البتہ اگر ایسا کبھی ہو ہی جاتا کہ پیشگی اطلاع کے بغیر اچانک ایک بڑی مقدار میں سونا نکالنا پڑ جائے تو پھر بینک کو اپنے دروازے بند کرنے پڑتے تھے۔ ایک بینک میں رسید کیش کرنے کی ناکامی کے نتیجہ میں دوسرے بینکوں پر بھی بے اعتباری کا بحران پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ اس طرح سے لوگوں میں بینکوں کی طرف بھاگ دوڑ (Bank Runs) شروع ہو جاتی تھی۔ ہر کوئی چاہتا کہ دوسروں سے پیشتر اپنا سرکاری زرنکوالے۔ انگلستان میں خاص کر انیسویں صدی کے اوائل میں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ بعض ترقی پذیر ملکوں میں ایسا آج کل بھی ہو رہا ہے۔

رسید کی ساکھ پر اعتماد لوگوں کے اس یقین پر مبنی تھا کہ جب بھی طلب کیا جائے صراف سے رسید کے عوض سونا مل جائے گا۔ یہ جان کر کہ لوگوں کا اعتماد ہی ان کی کامیابی کی کنجی ہے بہت سے صرافوں نے لوگوں کو اس بات پہ آمادہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں کہ نئی بینکاری کا نظام ”دانشندانہ“ بھی ہے اور ”محفوظ“ بھی۔ جلد ہی ان دو وعدہ الفاظ نے بینکاری کے پیشہ میں خوب شہرت حاصل کر لی۔

کچھ عرصہ بعد یہ بحث گرم ہوئی کہ محفوظ طریقے سے کام چلانے کے لئے بینک کے اندر کتنی کم یا کتنی بڑی مقدار میں نقد سرمایہ بطور زرمحفوظ (Reserve) رکھا جائے۔ کچھ نے 100 فیصد کے حق میں رائے دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جس بینکر نے عندالطلب 100 پونڈ ادا کرنے کی رسید جاری کر رکھی ہے اسے اپنی تجوری میں 100 پونڈ ہی جمع رکھنے چاہئیں تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنا وعدہ پورا کر سکے۔ دوسروں نے کم نقد زرمحفوظ کی شرح میں غیر معمولی منفعت کے امکانات دیکھے۔ انہوں نے جاری شدہ رسیدوں کے صرف 20 یا 30 فیصد تک کا کم تناسب تجویز کیا۔ انہوں نے اپنے انداز فکر کے جواز میں یہ

دلیل پیش کی کہ بیشتر لوگ اکثر اوقات اپنا زیادہ تر طلائی سرمایہ بینک میں ہی جمع رکھنا پسند کرتے ہیں۔ بحث بہت ہی اہم ثابت ہوئی۔ مثال کے طور پر اگر محفوظ کارکردگی کے لئے 20 فیصد زر محفوظ کی شرح ہو تو پھر باقی 80 فیصد سونا سود پر قرض دیا جاسکتا ہے۔ یعنی 100 پونڈ کے سونے کو 20 فیصد زر محفوظ اور 80 فیصد قرض دینے کے لئے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جتنی زر محفوظ کی شرح کم ہوگی اتنا ہی بینک کے دیوالیہ ہو جانے کا خطرہ بھی زیادہ ہوگا مگر ساتھ ہی قرض بھی زیادہ دے کر زیادہ سود بھی حاصل ہو سکے گا۔

جوں جوں قرض دینے کا سلسلہ بڑھایہ بات واضح ہوئی کہ بینکروں کو درحقیقت تجوریوں سے نکال کر اصلی حقیقی سونا لوگوں کو قرض کے لئے پکڑانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی اپنی رسیدیں ہی لوگوں میں زر کا کام دیتی تھیں اس لئے سونے کے بجائے رسیدیں ہی بطور قرض دی جاسکتی تھیں۔ اس پالیسی کا بہت فائدہ تھا کیونکہ کاغذ کی رسیدیں تو انتہائی کم قیمت پر تیار (Manufacture) کی جاسکتی تھیں جب کہ سونا تیار نہیں ہو سکتا۔ اگر تجوری میں 100 پونڈ کے طلائی سکے ہوں اور نقد زر محفوظ کی شرح اس کا 20 فیصد ہو تو بینکر 500 پونڈ تک کی رسیدیں جاری کر سکتا تھا۔ یہاں وہ گاہک جنہوں نے ابتدا میں سکے جمع کرائے تھے انہیں 100 پونڈ کی رسیدیں مل جاتی تھیں جبکہ مزید 400 پونڈ کی رسیدیں تیار (Manufacture) کر کے انہیں سود پر دیا جاسکتا تھا۔ دریں اثناء بینکر دوسرے بینکروں سے معاہدے کر لیتا تھا کہ اگر اس کے بینک سے کبھی بہت بڑی مقدار میں سرمایہ نکالنے کی ضرورت پڑے تو وہ زائد زر محفوظ دوسرے بینکوں سے قرض لے سکے۔

اوپر بیان کئے گئے جزوی زر محفوظ کی بینکاری کے نظام (Fractional Reserve Banking System) کی کارروائی قطعی طور پر سود کے استعمال پر منحصر تھی ورنہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بینک کو تصنیع زر (Manufacture Money) کا واقعی اختیار تھا تو وہ اپنے ذاتی اصراف کے لئے رسیدیں چھاپ کر خرچ کیوں نہ کر لیتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی ہی تیار کردہ رسیدیں خرچ کرنے کا لامحالہ نتیجہ دیوالیہ پن نکلتا کیونکہ مستقبل میں جب کبھی سونا نکلوانے کے لئے ایسی خرچ کی ہوئی رسیدیں واپس آئیں تو سونا کہاں سے آتا جو سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ اس کے بجائے سود پر رسید

قرض دے کر بینکر سود بھی لے سکتا تھا اور جب قرض یعنی رسیدیں واپس آ جاتیں تو انہیں جس آسانی سے تیار (Manufacture) کیا گیا اسی آسانی سے تلف بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح سے سود کی آمدن مل جاتی اور اگر قرض طلبائی سکوں کی شکل میں واپس آتا تو انہیں زر محفوظ میں شامل کر لیا جاتا تا کہ بقایا کاغذی رسیدیں بعد میں کسی دن کیش کی جاسکیں۔

بتدریج یہ پیغام زیادہ امیر طبقے تک پہنچ گیا کہ بینکاری کی خدمات سرانجام دینا تو ہمیشہ ہی سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ہے۔ تجارتی اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس نئے کھیل سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنے اپنے بینک کھول لئے۔ اس طرح معاشی حلقوں میں بینکاری سب سے بڑا ادارہ بن گئی۔ آج کل اگرچہ مقابلہ کی وجہ سے کسی ایک بینک کے نفع کی شرح پہلے سے نسبتاً کم ہے پھر بھی کل معیشت میں بینکاری کے شعبے کا مجموعی نفع انتہائی زیادہ ہے۔ 1999ء کے دوران مارکیٹ میں فائدہ مندی کے لحاظ سے لندن شاک آپکینج میں بینکاری کا شعبہ سب سے زیادہ مفید تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے بینکروں کو اپنا کاروبار بڑھانے کے لئے عملی طور پر کافی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کوئی کم حقیقت نہ تھی کہ بینک اس زر پر سود لیتے تھے جس کی وہ خود تخلیق کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ قرض دار اس مصنع یعنی مصنوعی (Manufactured) زر کے ساتھ سود بھی کیسے واپس کرتے؟ اس کو سمجھنے کے لئے فرض کریں کہ سرکاری زرا ابتدا میں کل 100 پونڈ ہے۔ اگر بینک اپنے طور پر 400 پونڈ بینکی زر پیدا کر لیں تو زر کی کل رسد 500 پونڈ ہوگئی۔ فرض کریں کہ 400 پونڈ بینکی زر 10 فیصد سالانہ سود پر 3 سال کے لئے قرض دیا جائے تو آخر میں واجب الادا رقم 532.40 پونڈ ہو جائے گی۔ اب اگر قرض دیتے وقت زر کی کل رسد 500 پونڈ تھی تو 32.40 پونڈ کہاں سے آئیں گے؟ چونکہ 32.40 پونڈ شروع میں موجود ہی نہ تھے تو جب تک اتنا زر کسی اور جگہ سے پیدا نہ کیا جائے قرض کے ساتھ اس کی ادائیگی ناممکن ہے۔

مطلوبہ نئے زر کی رقم صرف دو جگہوں سے آ سکتی ہے۔ یا تو بینکر اپنے تخلیق شدہ زر کی رسد مزید بڑھائے یعنی مزید قرض دے یا سرکاری زر کی رسد میں اضافہ ہو۔ جزوی زر محفوظ کی بینکاری کا رواج بڑھنے سے اس ٹھوس حقیقت نے معیشت پر بہت ہی سنگین نتائج پیدا کرنے تھے۔

نئے زر کی تخلیق کے بغیر بہت سے قرض دار آخراپے قرض کی ادائیگی نہ کر پاتے۔ نئے زر کی تخلیق سے ہی عدم ادائیگی سے بچنا ممکن تھا۔ چنانچہ تاجروں اور پرائیویٹ (Private) یعنی عام افراد کا زیادہ انحصار اس بات پر ٹھہرا کہ بینکر نے مصنع یعنی مصنوعی (Manufactured) زر سے مزید قرض دینے پر آمادہ ہوں۔

پرانے قرضوں کی ادائیگی سے نااہلی معاشرے کو موسیقی کی کرسیوں (Musical Chairs) کے کھیل میں بٹھادیتی ہے۔ جو لوگ موسیقی کی کرسیوں سے واقف نہیں انہیں بتاتے چلیں کہ یہ ایک کھیل ہے جو انگلینڈ میں کھیلا جاتا ہے جس میں مثال کے طور پر گیارہ بچے موسیقی بجنے کے دوران دس کرسیوں کے گرد دوڑتے ہیں۔ موسیقی بند ہو جانے پر سب کو ایک ایک کرسی پکڑ کر اس میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ کرسیوں کی تعداد سے ایک بچہ زائد ہوتا ہے اس لئے ایک بچہ موسیقی بند ہونے پر کھڑا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ بچہ کھیل میں ہار جاتا ہے اور اسے کھیل سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ ان قرضوں کا ہے جن کی ادائیگی نہ ہو سکے۔ ان حالات میں ہر کوئی اپنا قرض ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے مگر زر کی کافی مقدار موجود نہیں ہوتی جس سے ایسا کیا جاسکے۔ کم از کم ایک شخص کو دیوالیہ پن کا شکار ہونا اور کھیل سے نکالا جانا لازمی ہے۔ زندگی ایک سخت مقابلے کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے تاکہ موسیقی کے بند ہونے پر کھڑا رہنے سے بچا جاسکے۔ حکومت کی پالیسیاں، تاجروں کی کاروائیاں اور عام انسان کی روزمرہ کی زندگی سب کی سب اس مسلسل کشمکش میں گھر کر پریشان کن طریقے سے متاثر ہوتی ہیں۔ ان حالات میں گھمبیر مالی مسائل سے نجات دلانے کے لئے سرکار کوشش کرتی ہے۔ مندی (Recession) کے حالات اس وقت وقوع پذیر ہوتے ہیں جب نئے قرضوں کی مقدار پرانے قرضوں کی ادائیگی کے لئے ناکافی ہو جائے۔ ان حالات میں سرکار بے روزگاروں کو فلاحی فائدے دینے، ٹیکس کم کرنے اور اس طرح کی اور مراعات دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ ان اخراجات کو برداشت کرنے کے لئے جس زر کی ضرورت ہوتی ہے اُس کو یا تو سرکار خود ہی تیار (Manufacture) کر لیتی ہے یا بینکوں سے بینکی زر کی شکل میں حاصل کر لیتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرکار جب بلا سود زر خود ہی تیار (Manufacture) کر سکتی ہے تو پھر بینکوں کا مصنع (Manufactured) زر کیوں سود پر قرض

لیتی ہے؟ یہ ہمارے دور کا ایک ایسا معمہ ہے جس کا جواب نہیں ملتا۔ بہر حال بیشتر اوقات دنیا کے اکثر ملکوں میں یہی ہو رہا ہے۔

چونکہ بینکاری کے نظام سے نئے زر کا سب سے بڑا حصہ آج کل قرضوں کے ذریعہ تخلیق کیا جاتا ہے اس لئے زر کی توسیع کے ساتھ ساتھ مجموعی طور سے معیشت پر قرض کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے پچھلے تیس سال کے دوران دنیا کی سات بڑی معیشتوں میں ہر ایک کے لئے کل نجی اور سرکاری (Private and Public) قرضوں کا مجموعی داخلی پیداوار (Gross Domestic Product) سے تناسب کافی حد تک بڑھا ہے۔ ہر ترقی پذیر ملک قومی قرض میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ان سب ملکوں میں نجی ادارے بہت ہی زیادہ مقروض ہیں۔ مائیکل راؤ بوٹھم (Michael Rowbotham) اپنی تحریر "The Grip of Death (1998)" میں یوں تبصرہ کرتا ہے کہ کئی دہائیوں کی شدید محنت کے باوجود آج تک کی سب سے زیادہ پیداواری صلاحیت کی حامل نیکنالوجی استعمال کر کے بھی ترقی پذیر دنیا کے معاشرے ہمیشہ سے زیادہ مقروض ہیں۔

| سال | برطانیہ | امریکہ | جاپان | ملائیشیا |
|-------|---------|--------|-------|----------|
| 1970ء | 81 | 136 | 113 | 60 |
| 1983ء | 85 | 151 | 198 | 144 |
| 1993ء | 149 | 187 | 250 | 169 |

مجموعی داخلی "Domestic" (نجی "Private" + سرکاری) قرض بطور مجموعی داخلی "Domestic" پیداوار کا فیصد۔
(ماخذ: آئی ایم ایف انٹرنیشنل فنانشل سٹینڈلکس ایربک 2000ء)

ایک طرف مسلسل قرض میں توسیع دوسری طرف وسیع پیمانے پر کاروباری اور ذاتی دیوالیہ پن میں سے ہم نے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ نیا قرض پیدا کرنے کے نتیجے میں زر کی رسد میں توسیع قیمتوں میں بالعموم اضافہ کرتی ہے مگر چونکہ آج کل ہر ترقی یافتہ معیشت اس اضافے کا شکار ہے اس لئے اسے

جدید طرز زندگی کا قابل قبول جزو سمجھ لیا گیا ہے۔

ستارھویں صدی میں جب بینکاری کی ابھی ابتدا ہی ہو رہی تھی صنعت و حرفت کی کارکردگی پر اس کے طویل المیعاد اثرات کی پیش بینی شاید ممکن نہ تھی۔ پھر بھی بینکروں اور ان کے حمایتی حلقوں کی عوام الناس کے سامنے کی گئی نمائش کے پیچھے بعض افراد نے جھانک ہی لیا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے سرکار سے بینکروں کے خلاف قانون سازی کرنے کی التجا کی کہ اکثر لوگوں کو تو محنت کر کے زر کمانا پڑتا ہے جب کہ بینکر اسے بس چھاپ لیتے ہیں مگر سرکار کے خیالات مختلف تھے۔

بینک آف انگلینڈ

(The Bank of England)

قدرتی طور پر بینکر قرضوں کے نقصانات برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ قرضوں کے نقصانات کی صورت میں تو انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے بینک نے اپنا زر خود ہی صرف کر لیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ مصنع (Manufactured) زر کے کنٹرول کا ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ اس لئے بینکروں کا نفع میں شرکت والی سرمایہ کاری سے احتراز کرنے کا عام رواج ہو گیا اور انہوں نے رہن کی پشت پناہی پہ مبنی (Supported by Collateral) سودی قرضوں پر توجہ مرکوز کی۔ قرض دار کے کاروبار کی ناکامی کی صورت میں قرض کی حفاظت کے لئے رہن (Collateral) ایک تکیے (Cushion) یعنی سہارے کا کام دیتا تھا اور اس صورت میں بینک رہن پہ قبضہ کر کے اور اسے بیچ کر قرض کی رقم کی جزوی یا مکمل ادائیگی کر لیتا تھا۔

رہن پر مبنی شرط کی وجہ سے مصنع (Manufactured) زر کو قرض پر دینے کا رجحان قدرتی طور پر امیروں کی طرف ہو گیا۔ آخر امیر ہی تو تھے جو زیادہ دولت رکھتے تھے جس کو وہ رہن میں پیش کر سکتے تھے۔ دوسرے جو رہن پیش نہ کر سکتے تھے یعنی غریب لوگ جن کے کاروباری خیالات خواہ کتنی ہی نفع مندی کی استعداد کیوں نہ رکھتے ہوں آسانی سے مطلوبہ سرمایہ حاصل نہ کر پاتے۔ دوسری طرف ٹیکس لگانے کا حق رکھنے کی وجہ سے گورنمنٹ سب سے زیادہ محفوظ قرض خواہ تھی اس لئے بینکروں کے قرض دینے کی سب سے زیادہ توجہ اسی پر مرکوز ہوئی۔

1694ء میں شاہ انگلستان ولیم سوم کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ سرمایہ اکٹھا کرنے کے لئے عام افراد سے قرضوں کی پیشکش طلب کرے جس سے فرانس کے خلاف لڑائی لڑی جاسکے۔ قرضوں پر 8 فیصد سود دیا جانا تھا جو مختلف قسم کے ٹیکسوں سے حاصل کیا جاتا۔ یہ ٹیکس زیادہ تر بیئر (Beer) اور شراب پر لگائے جانے تھے۔ قرض کی واپسی کے لیے ادائیگی بھی اسی طرح کے ٹیکسوں سے وصول کردہ سرمایہ سے کی جانی تھی۔ "The Governor and the Company of the Bank of England" قائم کرنے کے لئے ایک خاص وقت کے وقفہ کے اندر بینک کی طرف سے 1,200,000 پونڈ کی پیشگی ادائیگی کی شرط پر حکومت کی طرف سے "Tonnage Act of May 1694" کے تحت ایک آئین (Charter) دیا جانا تھا۔

چنانچہ نئے بینک کو سکے وصول کر کے کاغذی زر جاری کرنے کی اجازت دی گئی۔ بینک کی جاری کرنے کی کارروائیوں کے متعلق ایکٹ کی شرائط نسبتاً مبہم سی تھیں جن کے اندر وہ کر مختلف قسم کے کاغذات جاری کئے گئے۔ مختلف قسم کے کاغذات میں بینک کے سر بمبریل (Sealed Bank Bills) اور کیش نوٹ (Cash Notes) شامل تھے۔ کچھ عرصے بعد حامل بینک نوٹ (Bearer Bank Notes) بھی آ گئے۔ بینک کے شراکت داروں میں بہت سے آجر (Entrepreneurs) شامل تھے جو نئے اور بظاہر نہایت فائدہ مند بینکاری کے کاروبار میں قدم جمانے کے لئے بے تاب تھے مگر شاہ کو مطلوبہ زر کی رقم بینک نے بذات خود قرض پر دی۔ 720,000 پونڈ نقد دیئے گئے اور باقی 480,000 پونڈ بینک کے سر بمبریل کی شکل میں تھے جن کو بینک نے اس مقصد کے لئے تخلیق کیا تھا۔ (مکمل تفصیل کے لئے

ملاحظہ ہو: Feaveryear, A. E., "The Pound Sterling," Clarendon Press

Oxford, 1931

سرکار کو قرض دی گئی بینک کی رقم کی شہادت کے طور پر بینک کو سرکار اپنی قرض کی ذمہ داریاں تحریری طور پر جاری کرتی تھی جن کو شروع میں "Tallies" اور بعد میں شاک یا فنڈز کا نام دیا گیا۔ (اس ضمن میں شاک اور بانڈ ہم معنی ہیں جو قابل خرید و فروخت ہوتے تھے اور جن پر قرض خواہ یعنی بانڈ کو جاری کرنے والا اور جو اسے خریدتا تھا یعنی بانڈ ہولڈر کے مابین شرائط درج ہوتی تھیں)۔ اکثر اوقات یہ

جو بانڈ تھے ان کو بینک فوری طور پر کچھ نفع لے کر چھوٹے سرمایہ کاروں کے ہاتھوں فروخت کر دیتا تھا۔ اس طرح ان کی ملکیت سے دستبردار ہو کر بینک اس نقصان کے خطرے کو کم کر لیتا جو ان کی بازاری قیمت (Market Value) میں غیر متوقع کمی کی صورت میں ہو سکتا تھا۔

جزوی طور پر اپنے اخراجات کو سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے گورنمنٹ کا بینک آف انگلینڈ سے قرض پر زر لینے کا حصول بڑھتا ہی گیا۔ خوش قسمتی سے بینک ضرورت کے وقت گورنمنٹ کی مدد کرنے کے قابل تھا۔ اس کو پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ سے استحقاق ملا ہوا تھا جس کے تحت اسے تمسکات (Promissory Notes) کی تصنیع (Manufacture) کا اختیار حاصل تھا جو زیادہ تر بطور زر استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے بینک مزید تمسکات چھاپ کر گورنمنٹ کی قرض لینے کی ضروریات پوری کرنے کے قابل تھا۔ اس طرح سے زر کی رسد اور گورنمنٹ کا قرض دونوں اکٹھے ہی بڑھتے گئے۔ ولیم کو بیٹ (William Cobbett) کی تحریر "Paper Against Gold, 1812" کے مطابق واجب الادا بانڈ اور دوسرے قرضوں پر مشتمل مجموعی قومی قرض 1701ء میں 16,394,702 پونڈ سے بڑھ کر 1727ء میں 52,092,235 پونڈ اور پھر 1784ء میں 257,213,043 پونڈ ہو گیا۔ 1810ء میں یہ 811,899,032 پونڈ ہو چکا تھا۔ سرکار کے واجب الادا قرضے تیزی سے بے قابو ہونے شروع ہو گئے۔

ہاں البتہ ایک ضروری سطح تک طلائی سکوں کی مقدار بطور زر محفوظ رکھے بغیر بینک کاغذی نوٹ نہیں چھاپ سکتا تھا۔ اس لئے وقت کے ساتھ لوگوں سے مزید سکے وصول کر کے یہ اپنی تجویزوں میں جمع شدہ طلائی سکے بڑھاتا گیا۔ 1755ء تک 20 پونڈ سے کم مالیت کے نوٹ جاری نہیں کئے جاتے تھے۔ 1756ء میں سات سالہ جنگ پھوٹ پڑنے سے قرض لینے کی سرکاری ضروریات کافی حد تک بڑھ گئیں تو اب بینک آف انگلینڈ نے 10 پونڈ کی مالیت کے نوٹ جاری کرنا شروع کر دیئے۔ جب 1793ء میں انگلینڈ پر فرانس نے اعلان جنگ کر دیا تو کھاتہ داروں سے سونا حاصل کرنے کی کوششیں مزید تیز کرنے کے لئے 5 پونڈ مالیت کے نوٹ جاری کرنے پڑے۔ اس طرح سرکار اور نجی قرض خواہوں کو کاغذی زر کے قرض دینے میں توسیع کے لیے بینک جتنا زر محفوظ کا تناسب (Reserve Ratio) دانشمندانہ خیال کرتا اسے برقرار رکھ لیتا تھا۔

بینک آف انگلینڈ کے تصنیع زر (Manufacture Money) کرنے کی کارروائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بیک وقت تمسکات کو کیش کرانے کے لئے زر محفوظ (Reserve) کے اثاثے کم پڑ گئے۔ چنانچہ فروری 1797ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعہ بینک کو تمسکات کے عوض سونا دینے سے رک جانے کی اجازت مل گئی۔ سونے میں ادائیگیوں کی اس معطلی کے بعد 2 اور ایک پونڈ کے نوٹوں کے اجراء سے کاغذی زر مزید بڑھ گیا۔ 1805ء میں ارل آف لورپول (Earl of Liverpool) نے شاہ کو ایک خط لکھا جس میں یوں تبصرہ کیا:

”جب 1797ء کے دوران بینک آف انگلینڈ کی صورت حال پارلیمنٹ کے دو ایوانوں میں زیر غور تھی تو اس وقت میری اور کئی دوسرے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ جس حد تک کاغذی کرنسی کے نظام کو لے جایا جا چکا ہے یہ ان بہت سی مشکلات کا پہلا اور بنیادی سبب ہے جن میں یہ ادارہ اس وقت اور وقتاً فوقتاً پچھلے سالوں میں ڈالا جا چکا ہے تاکہ بادشاہت کے کاروبار کے لئے نقدی مہیا ہو سکے۔“

1810ء کی بلین کمیٹی (Bullion Committee) نے پارلیمنٹ کو رپورٹ دی کہ بینک آف انگلینڈ کو معطلی کی وجہ سے بہت بڑی مقدار میں ایسا کاغذی زر چھاپنے کا موقع مل گیا ہے جس کے پیچھے سونے کی کوئی تائید نہیں اور اس طرح سے اس نے بہت زیادہ نفع کمایا ہے۔ کمیٹی کو تشویش تھی کہ زر تخلیق کرنے والوں کا منافع تو اتنا زیادہ ہے جبکہ سرکار کو عوام کے لئے اس سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے پارلیمنٹ کو خاص کر اس بات کی ترغیب دی گئی کہ بینک آف انگلینڈ کو مجبور کیا جائے کہ وہ جتنے نوٹ جاری کرے اتنی ہی پوری مالیت کا سونا اپنے پاس محفوظ رکھے۔

دریں اثنا بینک نے اس مسئلہ سے لاعلمی سادھ کر "Real Bills" کے عقیدے کی تشہیر کی جس کے مطابق بے بنیاد زر کی تصنیع معیشت کے لئے نقصان دہ نہیں اگر وہ حقیقی تجارت کی سرمایہ کاری کے لئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ صنعت کار اپنی تجارت کے لئے حسب معمول مبادلہ بل (Bills of Exchange) جاری کرتے اور بینک ان بلوں کو نئے تخلیق کردہ زر سے خریدتا تھا۔

بلین کمیٹی نے بینک کی دلیل کو مسترد کر دیا کیونکہ اسے خوب علم تھا کہ اصل مسئلہ تخلیق زر کا ہے نہ کہ نئے تخلیق شدہ زر کے استعمال کا۔ صنعتکاروں کی نقدی حاصل کی ضرورت تو لامحدود تھی۔ ان کی ضرورت کو تخلیق زر پر حد لگانے کا ایک ذریعہ سمجھنا غلط پالیسی تھی۔ وقت گزرنے پر پارلیمنٹ نے بینک سے

یہ مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ بینک اپنے جاری کردہ نوٹ سونے کے عوض پھر کیش کرنا شروع کر دیں اور 1816ء کے بعد یہ کام بتدریج کیا گیا۔ کو بیٹ (Cobbett) نے کہا کاغذی زر (Paper Money) کے نظام سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں ان کا یہ علاج بالکل نہیں۔ اپنی تحریر "Paper Against Gold" میں وہ بینک کے زرعی اغراض پر غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ وہ قومی قرض اور افراط زر کو کاغذی زر کے نظام کے بچے کہتا ہے اور اپنے وقت کے زرعی (Monetary) حالات سے ہمیں یوں آگاہ کرتا ہے۔

”ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں کاغذی زر کی ریل بیل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کی جیب اس سے بھری پڑی ہے۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ یہ ایک عجیب چیز اور بہت بڑی برائی ہے۔ مگر ہم کبھی یہ سوال نہیں کرتے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ آپ میں ایسا کوئی نہیں جس کو وہ وقت یاد نہ ہو جب تاجروں اور حراڑوں کے ہاتھ میں بینک نوٹ شاذ ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ اگر آپ ماضی میں جھانکیں اور سوچنے پر کچھ وقت صرف کریں تو آپ کو کاغذی زر اور اسی قسم کے زر میں بتدریج اضافہ اور سونے چاندی کے زر میں بتدریج کمی نظر آئے گی۔“

(Cobbett, W., "Paper Against Gold", 1828, P. 5)

اگرچہ بین الاقوامی تجارت میں برطانیہ کا غالب مقام اور سونے کی عالمی پیداوار میں اضافے طلائی سکوں کی گردش کو سہارا دے سکتے تھے تاہم معطلی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی بینکاری کا نظام بحران کا سامنا کرتا رہا۔

”طریقہ ہائے کارکنی اقسام کے تھے اور بہت سے بینک دیوالیہ ہو گئے صرف 1814ء اور 1817ء کے درمیان ہی 89 بینک تباہ ہوئے اگرچہ ان میں اکثر بینک چھوٹے ہی تھے جن کے شراکت دار پندرہ سے بھی کم تھے۔“

(Thomes., "An Unfinished History of the World," 1981, P. 467)

چونکہ بینک آف انگلینڈ کے نوٹ محفوظ زر سمجھے جاتے تھے اس لئے نام نہاد ”ملکی بینک“ (Country Banks) یعنی وہ بینک جو لندن سے باہر تھے انہیں جزوی طور پر اپنے زر محفوظ (Reserves) کے اثاثوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس طرح سے زر کی رسد کے پھیلاؤ کے دوہرے مخروطی مینار پیدا ہو گئے۔ مثلاً یہ تصور میں لائیں کہ اگر ہر ایک طلائی پونڈ، جو کہ بینک آف انگلینڈ کے پاس ہے، کے بدلے میں 3 عدد بینک آف انگلینڈ کے کاغذی پونڈ پیدا کئے گئے ہوں اور اگر بینک آف انگلینڈ کے ہر کاغذی پونڈ، جو کہ ”ملکی بینک“ میں بطور زر محفوظ (Reserve) رکھا گیا ہے، کے عوض ”ملکی بینک“ 3 کاغذی پونڈ جاری کرے تو ہر طلائی پونڈ جو کہ بینک آف انگلینڈ کے پاس ہے کے عوض 9 پونڈ کا بینکی زر گردش میں آ گیا۔

1825ء کا بحران اس مسئلہ کی مثال ہے جو ایسے حالات میں درپیش ہو سکتا ہے جب کہ بینکاری کے نظام میں زرِ محفوظ کے اثاثوں (Reserves) کی کمی ہو۔ ہوا یوں کہ اس وقت بہت سے کھاتہ دار ”ملکی بینکوں“ کے تمسکات کو کیش کرانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور ان کے عوض صرف طلائی سکے یا بینک آف انگلینڈ کے نوٹ ہی قبول کرتے تھے۔ چنانچہ ”ملکی بینکوں“ کے نمائندے آگے بینک آف انگلینڈ کے پاس طلائی سکے یا بینک آف انگلینڈ کے نوٹ لینے کے لئے آ رہے تھے تاکہ ”ملکی بینک“ اپنے کھاتہ داروں کے سرمایہ نکلوانے کے مطالبات پورا کر سکیں۔ اس طرح دوہرے مخروطی مینار اب الٹ سمت میں چل پڑے تھے۔

بینک آف انگلینڈ ”ملکی بینکوں“ اور دوسروں کو ضروری کیش مہیا کرنے پر مجبور تھا۔ طلب اتنی زیادہ تھی کہ نکسال کو دن رات سونے کی اینٹوں (Gold Bullion) کو سکوں میں تبدیل کرنے کا کام کرنا پڑا اور چھاپہ خانوں نے بھی جتنا ہو سکا تیزی سے بینک آف انگلینڈ کے نوٹ چھاپے۔ دسمبر 1825ء میں 61 عدد لندن کے بینکوں اور ”ملکی بینکوں“ نے سونے میں ادائیگیاں بند کر دیں۔ چاؤن (Chown) اس زمانے کے حالات کلیپ ہیم (Clapham) کے الفاظ میں یوں پیش کرتا ہے۔

”عوام بینک آف انگلینڈ کے نوٹوں یا سونے کے سکوں کے لئے شور مچا رہے تھے مگر نہ تو نوٹ اور نہ ہی طلائی پونڈ اتنی تیزی سے بنائے جاسکے..... سترہ تاریخ کو ہفتہ کی شام تک بینک آف انگلینڈ کے 5 اور 10 پونڈ کے نوٹ ختم ہو چکے تھے۔ تاہم اتوار کی صبح چھاپہ خانوں سے سپلائی آ گئی۔“

(Chown, J.F, "A History of Money," 1994, P.153)

چنانچہ ایک طرف بینکاری کے بحران اور زرِ محفوظ (Reserves) کی کمی اور دوسری طرف جزوی زرِ محفوظ کی بینکاری کی نفع بخش کارگزاری کے درمیان یہ نظام ڈگمگا گیا۔

رسیدوں سے چیکوں تک

(From Receipts to Cheques)

آخر کار ارباب اختیار اُن خطرات کے خلاف عمل پیرا ہوئے جو معیشت کی صحت کو درپیش تھے اور جن کے پیچھے کاغذی زر کے نجی جاری کنندگان کا فرما تھا۔ اپریل کے 1844ء کے بینک چارٹر ایکٹ (Peel's 1844 Bank Charter Act) کے تحت بیشتر اقسام کے نوٹ جاری کرنے کا حق

بینک آف انگلینڈ تک محدود کیا گیا اور اسے نوٹ کیش کرتے وقت یعنی نقد میں تبدیل کرتے وقت بدلے میں سونا دینے کا پابند کیا گیا۔ یہ خیال کیا گیا کہ اس سے بینکاری کا نظام اپنی گزشتہ بیماریوں سے شفا حاصل کر لے گا مگر جدید بینکاری کے فن نے چیک اور کھاتہ نامے کے نظام (Cheque and Account Statement) کی صورت میں جلد ہی اس قانون سازی کو غیر موثر کر دیا۔

پہلے کے ایکٹ کے وقت ”ملکی بینکوں“ نے کسی بڑی حد تک ادائیگیاں کرنے کے لئے چیک کا نظام اختیار نہیں کیا تھا۔ جب ان کا نوٹ چھانپنے کا حق سلب ہوا تو ”ملکی بینکوں“ نے یہ نظام اپنانے میں دیر نہ کی۔ ایک دفعہ پھر اس نئے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے عوامی اعتماد لازمی تھا۔ جہاں کبھی عوام اس بات پر یقین رکھا کرتے تھے کہ وہ اپنی رسیدیں سونے میں تبدیل کر سکیں گے اب انہیں اس بات پہ آمادہ کرنا تھا کہ ان کے کھاتہ نامے (Account Statement) میں درج اعداد و شمار بھی اسی طرح قابل تبادلہ ہیں۔

آئیے اب ہم چیک اور کھاتہ نامے کے نظام کا جائزہ لیتے ہیں۔ فرض کیجئے پوری معیشت میں صرف ایک ہی بینک ہے۔ اس بینک کے بہت سے کھاتہ دار (Account Holder) ہیں جن میں دو کھاتہ دار ”الف“ اور ”ب“ ہیں۔ دونوں ”الف“ اور ”ب“ اپنے جاری کھاتے (Current Account) صفر میزانیے (Balance) سے شروع کرتے ہیں۔ ”الف“ کچھ مال کے بدلے ”ب“ کو 100 پونڈ کا چیک دیتا ہے۔ ”ب“ وہ چیک بینک میں اپنے کھاتے (Account) کے اندر جمع کراتا ہے۔ بینکر ”ب“ کے کھاتے میں 100 پونڈ کی آمد یا وصولی جسے کریڈٹ (Credit) کہتے ہیں کر دیتا ہے اور ”الف“ کے اکاؤنٹ سے اتنا ہی اخراج جسے ڈیبٹ (Debit) کہتے ہیں کر دیتا ہے۔ ”ب“ کے کھاتے میں اب 100 پونڈ کی مجرائی رقم (Credit) ہے اور ”الف“ نے اتنا ہی بینکی قرض لے لیا ہے جسے اوور ڈرافٹ (Overdraft) کہتے ہیں اور خرید و فروخت والے مال کی ادائیگی ہو گئی ہے۔ اب 100 پونڈ کا نیا بینکی زرو وجود میں آ گیا ہے جو کل ”ب“ کے کھاتہ میں ہے۔

مندرجہ بالا مثال سے سیدھے سادھے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کھاتہ داروں کا ایک گروہ ہمیشہ ہی اتنا مقروض ہوگا جتنی بینک کے پاس زر کی رسد ہے۔ دوسرا یہ کہ ”الف“ اگر اپنا اوور ڈرافٹ

ختم کرنے کے لئے ”ب“ کے کھاتے کا 100 پونڈ کا چیک بینک میں جمع کراتا ہے تو بینک کا زر ”ب“ سے ”الف“ کی طرف منتقل ہو کر بینکی زر غائب ہو جائے گا۔ بینکی زر سرکاری زر کے بالکل برعکس ہے کیونکہ سرکاری زر کے طوائف سکے قرض کی ادائیگی کرنے سے کبھی غائب نہیں ہوتے۔

مذکورہ بالا معاملات کے سمجھنے میں مشکل پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ بینکاری کا نظام بظاہر زر جمع کرانے والوں اور قرض لینے والوں کے درمیان محض ایک واسطہ سمجھا جاتا ہے جو صرف قرض داروں سے لئے گئے سود کی شرح اور بچت کرنے والوں کو دیئے گئے سود کی شرح کے فرق کے برابر نفع حاصل کرتا ہے۔ مگر پوری بینکاری کے نظام کو اگر ایک ہی بہت بڑا بینک تصور کر لیا جائے تو وہ صرف بچت کرنے والوں اور قرض خواہوں کے درمیان واسطے ہی کی نہیں بلکہ زر کو تخلیق کرنے کی بھی استعداد رکھتا ہے۔ اس نظام میں تخلیق زر کا کام صرف تجارتی بینک ہی نہیں کرتے بلکہ ودیعی یعنی ڈیپازٹ (Deposit) لینے والے دیگر ادارے مثلاً بلڈنگ سوسائٹیاں بھی تخلیق زر میں اپنا اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل بحث کے زمرے میں تمام ڈیپازٹ لینے والے ادارے شامل ہیں لیکن ہم اپنی توجہ صرف تجارتی بینکوں پر مرکوز کریں گے۔

مندرجہ ذیل تجزیہ معاشیات کی اکثر معیاری نصابی کتابوں (Text Books) میں درج شدہ ودیعی مضاعف (Deposit Multiplier) کے موضوع کے تحت کئے گئے تجزیہ سے مشابہ ہے۔ فرض کیجئے ایک معیشت میں تین بینک ”الف“ ”ب“ اور ”ج“ ہیں۔ ہر ایک 20 فیصد زر محفوظ کی شرح (Reserve Ratio) سے کاروبار چلاتا ہے۔ ابتدا میں 100 پونڈ کا جدید سرکاری زر جو سکوں اور نوٹوں پر مشتمل ہے گردش پذیر ہے اور اس میں سے کچھ بھی کسی تجارتی بینک میں جمع شدہ نہیں۔ اب اگر اس زر کے مالکان سارے کا سارا زر بینک ”الف“ میں جمع کر دیتے ہیں تو بینک کا تحتہ توازن یعنی بیلینس شیٹ (Balance Sheet) یوں ہوگی۔

| | | |
|----------------------|-----------------|----------|
| اثاثے (Assets) | نقد | 100 پونڈ |
| واجبات (Liabilities) | ودائع (ڈیپازٹس) | 100 پونڈ |

اب زرمحفوظ کی شرائط کے تحت بینک ”الف“ 20 پونڈ اپنے پاس محفوظ کر کے باقی 80 پونڈ قرض دے دیتا ہے۔ ایسا کرنے کے بعد بینک الف کی بیلنس شیٹ یوں ہوگی۔

| | | |
|----------------|-------|----------|
| اثاثے (Assets) | نقد | 20 پونڈ |
| | قرض | 80 پونڈ |
| واجبات: | ودائع | 100 پونڈ |

80 پونڈ قرض لینے والا اب اسے خرچ کرتا ہے اور جس کو وہ 80 پونڈ ملے وہ انہیں اپنے بینک ”ب“ میں جمع کر دیتا ہے۔ بینک ”ب“ بھی 20 فیصد زرمحفوظ کی شرح برقرار رکھتے ہوئے 80 پونڈ میں سے 64 پونڈ آگے ادھار دے دیتا ہے۔ تو اس کی بیلنس شیٹ یوں ہوگی۔

| | | |
|----------------|-------|---------|
| اثاثے (Assets) | نقد | 16 پونڈ |
| | قرض | 64 پونڈ |
| واجبات: | ودائع | 80 پونڈ |

64 پونڈ کا قرض دار اسے خرچ کر دیتا ہے اور جس کو یہ 64 پونڈ ملے وہ اسے اپنے بینک ”ج“ میں جمع کراتا ہے۔ اب بینک ”ج“ کی بیلنس شیٹ یوں ہوگی۔

| | | |
|---------|-------|---------|
| اثاثے | نقد | 64 پونڈ |
| واجبات: | ودائع | 64 پونڈ |

اس مثال میں بینک ”الف“ ”ب“ اور ”ج“ کے مجموعی واجب الادا وودائع اب 244 پونڈ ہیں۔ اس سادہ سی معیشت میں یہ ہے زرب کی کل رسد۔ چونکہ یہ وہ رقم ہے جو بینک کے کھاتہ دار خرید و فروخت کے لئے بذریعہ چیک استعمال کر سکتے ہیں۔ بینکوں میں بار بار جمع کرانے کا اوپر دکھایا گیا سلسلہ کثیر التعداد توسیع وودائع (Multiple Deposit Expansion) کہلاتا ہے۔ جس کی حد اوپر والی

مثال میں 500 پونڈ تک جائے گی۔ ابتدا میں جمع کرائے گئے سرکاری زر کو زر محفوظ کی شرح (Reserve Ratio) سے تقسیم کر کے یہ حد معلوم کی جاتی ہے (100 پونڈ تقسیم 0.2 = 500)۔ یہاں ودیہ مضاعف کی قیمت 5 ہے۔ یہاں کثیر التعداد تو وسیع ودائع کا سلسلہ شروع ہونے سے پیشتر یعنی مالی نظام کے اندر بینکوں کا درمیانی واسطہ بننے سے پہلے زر کی رسد 100 پونڈ تھی جو مکمل طور پر سرکاری زر پر مشتمل تھی۔

بینکر کہتے ہیں کہ کھاتہ دار جو ودائع جمع کراتے ہیں انہیں ایک ہی دن میں نہیں نکلوا لیا جاتا۔ اگر ان کی یہ بات غلط ہو جائے تو تمام کے تمام بینک ہی دیوالیہ ہو جائیں۔ اگر کسی ایک دن بینکوں سے سرکاری زر کی شکل میں نکلوانے والی کل رقم ان کے مجموعی زر محفوظ سے زیادہ نہ ہو تو پھر اس دن بینک دیوالیہ ہو جانے سے بچے رہیں گے۔ اس قسم کی بینکاری کا نظام خاص کر ایسے وقت میں بحران کا شکار ہو کر غیر مستحکم ہو جاتا ہے جب بہت سے کھاتہ دار سرکاری زر نکلوانے کا ارادہ کر لیں۔ ان حالات کے پیش نظر صرافوں کی طرح جدید بینک بھی ایسے انتظامات کر لیتے ہیں جن کے ذریعہ زیادہ رقم نکلوانے کی صورت میں وہ کہیں سے سرکاری زر پہ مشتمل نیاز زر محفوظ لا سکیں۔

جدید مالی نظام میں مرکزی بینک اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ تجارتی بینکوں کو لا محدود سرکاری زر قرض پر دے دے گا۔ اسے آخری حربے کے طور پر استعمال ہونے والا دائن (Lender of the Last Resort) کہتے ہیں جس کا مذکورہ وظیفہ جدید معیشت کے استحکام کے لئے ضروری ہے تاکہ لوگوں کی بینک کی طرف دوڑ بھاگ کو روکے رکھے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ چونکہ سرکار نے بھی سرکاری زر کے لئے کاغذ ہی کو بنیاد بنالیا ہے اسی لئے ایسی ضمانت دینا ممکن ہے۔ اگر سرکاری زر قیمتی دھات سے بنتا تو ایسی کوئی ضمانت بھی پوری طرح قابل اعتماد نہ ہوتی کیونکہ سرکار کی رسائی بھی تو لا محدود ہونے اور چاندی کی رسد تک نہیں ہو سکتی۔

سیولت اور بینکاری کا نظام (Liquidity and the Banking System)

بینکاری کے نظام کو ناکامی سے بچانے کے لئے مرکزی بینک بطور "Lender of the Last

"Resort" جو وظیفہ سرانجام دیتا ہے وہ بنیادی طور پر صرف ایک ہی آخری دفاع ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ دوسرے طریقوں کا بھی جائزہ لیں گے جن کو جدید بینک سرکاری زر کے حصول کے لئے وقتاً فوقتاً استعمال کر سکتے ہیں۔

جب بینک کی کسی برانچ میں زر محفوظ (Reserve) ختم ہو جائے تو ایسی صورت میں بینک اپنی دوسری برانچوں سے ضرورت کے مطابق اُن کا فاضل زر محفوظ اس برانچ میں منتقل کر دیتا ہے۔ اکثر تجارتی بینک اپنے کھاتہ داروں سے بڑی رقم نکوانے کے لئے کم از کم ایک دن کا نوٹس مانگتے ہیں۔ یہ شرط انہیں اتنا وقت مہیا کر دیتی ہے جس میں وہ ضرورت کے مطابق اثاثے حاصل کر سکیں۔ اگر اپنی برانچوں سے نہ ہو سکیں تو دوسرے وسائل سے ہی سہی جو ذیل میں بیان کئے جا رہے ہیں۔

اشیاء و خدمات کی خرید و فروخت کے لئے سرکاری زر نکوانے کے بجائے لوگ مثلاً چیک یا ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) کے استعمال کو بھی ترجیح دے سکتے ہیں۔ جہاں ادائیگی اس طرح سے ہو اور وہ بھی ایک ہی بینک کے کھاتہ داروں کے درمیان ہو تو اس صورت میں بینک ان کے کھاتوں کے بیلنس (Balance) یعنی میزانیے میں محض اس طرح کی تبدیلیاں کر دیتا ہے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ بصورت دیگر اگر ادائیگی ایسے شخص کو کرنی پڑے جس کا کھاتہ کسی دوسرے بینک میں ہو تو ادائیگی کرنے والے بینک کو ادائیگی وصول کرنے والے بینک میں سرکاری زر پہ مشتمل زر محفوظ منتقل کرنا پڑتا ہے۔

ایک سے دوسرے بینک میں سرکاری زر پہ مشتمل زر محفوظ منتقل کرنے کے لئے مرکزی بینک میں ہر تجارتی بینک کا کھاتہ ہوتا ہے۔ جس کے بیلنس یعنی میزانیے کو فعال ودیہ (Operational Deposit) کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر فعال وادع ہوتے ہیں جو نکلائے نہیں جاسکتے۔ انہیں مرکزی بینک اس لئے اپنے پاس رکھتا ہے تاکہ زر پالیسی میں تبدیلیاں کر سکے۔ مرکزی بینک کے اندر فعال کھاتوں میں سرکاری زر پہ مشتمل فعال ودیہ کا سرمایہ ایک تجارتی بینک کے کھاتے سے دوسرے تجارتی بینک کے کھاتے میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ کسی ایک تجارتی دن میں بینکوں کے درمیان چیکوں کی ادائیگیاں کرنے کا یہ حسب معمول طریقہ ہے۔ جس کی ذمہ داری ایک مرکزی کلیئرنگ ہاؤس (Clearing House) پر ہوتی ہے۔ بینک فعال کھاتے کا بیلنس سرکاری زر کی شکل میں بھی نکلا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے

مرکزی بینک علاقائی ذخیری مراکز (Regional Storage Centres) قائم کرتا ہے جہاں ضرورت کے مطابق تقسیم کرنے کے لئے سرکاری زرمجم رہتا ہے۔

چونکہ تجارتی بینکوں کے درمیان کی گئی ادائیگیاں ایک دوسری کو منسوخ کرتی ہیں جس طرح ہماری شروع کی مثال میں صراف کے پاس جمع کئے گئے اور نکلوائے گئے طلائی سکے ایک دوسرے کو منسوخ کر دیتے تھے اس لئے مرکزی بینک کے اندر تجارتی بینکوں کو تھوڑا سا ہی بیلنس برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم اگر کبھی کچھ ادائیگیاں کرنے کے لئے فعال کھاتے میں جمع سرکاری زرم پڑ جائے تو بینک کو اس میں مزید رقم جمع کرانی پڑتی ہے یا اوورڈرافٹ (Overdraft) کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے بینکوں سے رقم بذریعہ بین البینکی تھوک زری مارکیٹ (Wholesale Interbank Money Market) جس کو UK یعنی برطانیہ میں متوازی مارکیٹ یعنی "Parallel Market" کہتے ہیں کیونکہ یہ ذیل میں بیان کی گئی ڈسکاؤنٹ مارکیٹ (Discount Market) کے ساتھ ساتھ کام کرتی ہے قرض لے کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسا بینک جس کے پاس فاضل زرم محفوظ کا سرمایہ ہو وہ سود لینے کے لئے اس غیر مستعمل سرمائے سے قرض دے سکتا ہے اور ساتھ ہی قرض لینے والا بینک اپنے زرم محفوظ کی کمی دور کر سکتا ہے۔ بین البینکی زری مارکیٹ اب ہر ترقی یافتہ معیشت کے اندر موجود ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ برطانیہ میں تجارتی بینک ڈسکاؤنٹ مارکیٹ سے نئے سرے سے سرکاری زر حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ کار سمجھنے کے لئے موضوع سے ذرا ہٹنا پڑے گا۔

برطانیہ میں بین البینکی تھوک زری مارکیٹ سے ڈسکاؤنٹ مارکیٹ علیحدہ ہے اور اس کے مرکزی ادارے ڈسکاؤنٹ ہاؤس (Discount House) کہلاتے ہیں۔ ڈسکاؤنٹ کی اصطلاح ان اداروں کی اس بنیادی کارروائی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے جس سے وہ قلیل المیعاد بل اس کی ظاہری قدر سے کم (ڈسکاؤنٹ) پر خرید کر زرم قرض پر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سہ ماہی کا سرکاری بل ایک دستاویز ہے جس میں حامل دستاویز کو اجرا کی تاریخ سے تین ماہ بعد حکومت وہ قیمت ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے جو اس پر لکھی گئی (ظاہری قیمت) ہے۔ حامل دستاویز کو نقد ادا کر کے اگر کوئی خریدار تاریخ اجرا کے دن اسے اس کی ظاہری قیمت کے 95 فیصد پر خرید لیتا ہے تو کہا جائے گا کہ اس نے 5 فیصد پر

بل کو ڈسکاؤنٹ کیا (یا سالانہ 20 فیصد پر ڈسکاؤنٹ کیا)۔

مالی مارکیٹ کے منتظمین ڈسکاؤنٹ کی سطح کی بغور نگرانی کرتے رہتے ہیں چونکہ یہ پوری معیشت میں قلیل المیعا سود کی شرح کے رجحان کی علامت ہے۔ (اس ڈسکاؤنٹ ریٹ کو اس ڈسکاؤنٹ ریٹ کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے جو باب نمبر 1 میں بیان کیا گیا) یہ بھی یاد رہے کہ یہ ڈسکاؤنٹ ریٹ وہ نہیں جس کو سود کی شرح کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس بل کے لئے جس نے تین ماہ بعد 100 پونڈ واپس کرنے ہیں 95 پونڈ ادا کرتا ہے تو ڈسکاؤنٹ ریٹ تو 5 فیصد ہے مگر سود کی شرح 5.26 فیصد (یعنی 5 تقسیم 0.95) ہے۔

مناسب اوقات پر سرکاری زر کو ڈسکاؤنٹ مارکیٹ میں ڈال کر یا نکلوا کر مرکزی بینک ڈسکاؤنٹ ریٹ پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ سرکاری زر دو طریقوں سے ڈالا جاتا ہے۔ ایک تو استعدادی بل (Eligible Bills) خرید کر اور دوسرے سرکاری زر براہ راست قرض دے کر۔ دوسری طرف مرکزی بینک جب استعدادی بل کو ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کے ہاتھ بیچتا ہے تو سرکاری زر وصول کرنے سے ڈسکاؤنٹ مارکیٹ سے سرکاری زر نکل جاتا ہے۔ (استعدادی بل وہ سرکاری بل یا بڑی بڑی کمپنیوں کے نام نہاد تجارتی بل ہیں جن کو بینک آف انگلینڈ خریدنے کے لئے تیار ہوتا ہے)۔

ڈسکاؤنٹ ہاؤس تجارتی اور مرکزی دونوں بینکوں سے قرض لے بھی سکتے ہیں اور انہیں قرض دے بھی سکتے ہیں۔ تجارتی بینکوں سے قرض پر لئے ہوئے زر سے ڈسکاؤنٹ ہاؤس سرکاری بل خرید سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سرکار کو قرض دے سکتے ہیں۔ مرکزی بینک سے قرض لئے ہوئے سرکاری زر سے ڈسکاؤنٹ ہاؤس آگے تجارتی بینکوں کو ان کے بل خرید کر قرض دے سکتے ہیں۔ ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کے اندر یہ مفاہمت ہوتی ہے کہ ضرورت پڑنے پر مرکزی بینک ضرورت کے مطابق ہمیشہ ڈسکاؤنٹ ہاؤس کو قرض دے گا اور ڈسکاؤنٹ ہاؤس ہمیشہ جب بھی ضرورت پڑے مرکزی بینک یا تجارتی بینک کو اس کی ضرورت کے مطابق قرض دے گا۔ یہ انتظامات اس امکان کی تائید کرتے ہیں کہ مرکزی بینک ڈسکاؤنٹ ہاؤس کو جتنا قرض دیتا ہے بعد میں اتنا قرض واپس بھی لے لیتا ہے۔

ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کو تجارتی بینک جو زیادہ تر قرض دیتے ہیں وہ قرض فوری طور پر یا بہت کم

عرصہ کی پیشگی اطلاع پر اگر چاہیں تو واپس بھی لے سکتے ہیں اور اسے ”طلبی زر“ (Money at Call) کہا جاتا ہے۔ سرکاری زر کی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے تجارتی بینک سب سے پہلے یہی زر نکلاتے ہیں۔ اگر ایسے زر کی رقم ضرورت پوری نہ کرے تو پھر تجارتی بینکوں کو مکمل اور واضح طور پر ڈسکاؤنٹ مارکیٹ سے قرض لے کر ان کا قرض دار بننا پڑتا ہے۔ تجارتی بینکوں کے قرض لینے سے ڈسکاؤنٹ ہاؤس آگے مرکزی بینک سے قرض لینے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سے قرض لیے گئے زر کو تجارتی بینک آگے مرکزی بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور اپنے زر محفوظ کی کمی پوری کر لیتے ہیں۔

چونکہ مرکزی بینک اس بات پر رضامند ہے کہ اسے ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کو جتنا بھی سرکاری زر چاہیے قرض دینا ہوگا اس لئے ضروری نہیں کہ مرکزی بینک سرکاری زر کی موجود رسد کو کنٹرول کر سکے۔ یہ جانتے ہوئے کہ مرکزی بینک جتنی بھی رقم تجارتی بینکوں کو ضرورت ہوگی مہیا کر دے گا جزوی زر محفوظ کی بینکاری پر مکمل عمل درآمد کے لئے مؤثر حفاظتی بند سزاؤں کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ ہر ملک کے اندر بینکوں نے یہ کامیاب کوشش کی ہے کہ مرکزی بینک بینکاری کے نظام کی نگرانی کرے۔ لوگوں کی بینکوں کی طرف بھاگ دوڑ کے متعلق بینکوں کو مرکزی بینک کی موجودگی میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ آسانی سے مرکزی بینک سے جتنا بھی ضرورت ہو زر مانگ سکتے ہیں تاکہ لوگوں کے رقوم نکلوانے کے مطالبے پورے کر سکیں۔

تجارتی بینک اپنے اثاثوں کو سہارا دینے کے لئے اپنی سرمایہ کاری کی بچتوں کو بھی بیچ سکتے ہیں یا اپنے ہی نئے بانڈ اور شیئرز سرمایہ کاروں کے آگے فروخت کرنے کے لئے جاری بھی کر سکتے ہیں۔ سیولت کی کمی کی واضح نشانی عوام کو اس وقت نظر آتی ہے جب تجارتی بینک اپنی زر محفوظ کی شرح کو بہتر کرنے کے لئے اوور ڈرافٹ (Overdraft) کرتا ہے یا دوسری قسم کے قرض لیتا ہے۔

سبکدستی تنظیم زر

(The Manipulation of Money)

جدید سرکاری زر کے لئے ایک اصطلاح حکمی زر (Fiat Money) ہے۔ یہ وہ زر ہے جس کی قدر اشیاء و خدمات کے مبادلہ کے لئے محض حکمی ہے یعنی سرکاری حکم کی وجہ سے ہے۔ ایسا زر پیدا

کرنے کی قیمت (Cost of Production) سے اس کی زائد مبادلی قدر "Seignorage" کہلاتی ہے۔ مثال کے طور پر فرض کریں 0.01 پاؤنڈ خرچ کر کے سرکار 100 پونڈ کا نوٹ چھاپتی ہے تو یہ سرکار کا حکمی زر ہے جس کی مبادلی قیمت یعنی قوت خرید 100 پونڈ ہے اور 99.99 پونڈ "Seignorage" ہے۔ جتنی حکمی زر کے پیدا کرنے کی قیمت زیادہ ہوگی اتنی اس کی "Seignorage" کم ہوگی۔ چنانچہ مالی شکل کا زر (Commodity Money) مثلاً سونا بمقابلہ کاغذی زر کے کم "Seignorage" رکھتا ہے چونکہ سونا حاصل کرنے اور اسے سکوں میں ڈھالنے کی قیمت کاغذی نوٹ چھاپنے سے زیادہ ہے۔ ان دونوں شکلوں کے زر میں مشترک بات ان کی ظاہری قیمت (Face Value) ہے جو اشیاء و خدمات کے مبادلہ کے لئے استعمال ہوتی ہے چاہے یہ حکمی (By Fiat) ہو یا نہ ہو۔

جدید حکمی زر اور "IOU" (جو I Owe You کا مخفف ہے) کئی لحاظ سے مشابہہ ہیں۔ "IOU" دستاویزی ثبوت ہوتا ہے اس قرض کا جو بائع سے موصول شدہ اشیاء و خدمات کی قیمت کے عوض مشتری کے ذمہ ہوتا ہے۔ اگر بائع کو یقین ہو کہ مشتری ادائیگی کے وقت "IOU" کا احترام کرے گا تو بائع "IOU" قبول کر کے اس سے لین دین کا معاملہ طے کر لیتا ہے۔ "IOU" جاری کرنے والا اتنی قیمت کی اشیاء و خدمات حاصل کرتا ہے جتنی "IOU" کے پیدا کرنے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کی معیشت جس میں "IOU" ہی مبادلے کا ذریعہ تھے "IOU" کا میزان اس مجموعی قرض کو ظاہر کرتا تھا جو بائع کا مشتری کے ذمہ ہوتا تھا۔ یہ زر کی وہ مقدار ہے جس کو سوڈی (Soddy) معاشرے کی ظلی دولت (Virtual Wealth) کہتا ہے۔ یہ اس دولت کے برابر ہے جس سے معاشرے کے کچھ افراد ان افراد کے حق میں دستبردار ہو جاتے ہیں جو بعد میں ادائیگی کا وعدہ کریں۔

جدید دور کے نقد والے لین دین میں بائع کو اسی قسم کا کاغذی ٹکڑا ملتا ہے جس کی اپنی ذاتی (Intrinsic) کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ امتیازی فرق یہ ہے کہ سرکاری زر اشیاء و خدمات کی حتمی (Final) ادائیگی کے طور پر وصول کیا جاتا ہے جب کہ کسی پرائیویٹ فرد کا دیا گیا "IOU" بعد میں حتمی ادائیگی کرنے کا صرف ایک وعدہ ہے۔ سرکاری کاغذ کا ٹکڑا جو زر ہے اسے ہم زر اس لئے کہتے ہیں چونکہ سرکار اسے زر کہتی ہے یا چونکہ ہم سرکار کے قوانین کے پابند ہیں۔ کبھی ایک زمانہ تھا جب کاغذی نوٹ

کو سرکاری خزانے سے حقیقی زر (یعنی سونے اور چاندی کے سکوں) کی عندالطلب ادائیگی کا ایک سرکاری وعدہ تسلیم کیا جاتا تھا اور اس پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ اب سرکاری خزانے سے کاغذی نوٹ کے عوض حقیقی زر کے بجائے صرف کاغذی زر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ دیکھیں حالات کیسے بدل گئے ہیں!

سرکاری زر اور "IOU" کے اجرا میں سود کی کہیں بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یقیناً سونا اپنے وجود کے لئے سود کا محتاج نہیں۔ اس کا بس اپنا وجود ہے۔ اس کو وجود میں لانے کے لیے اسے قرض لینے کی ضرورت نہیں۔ سرکار کے کاغذی زر کا وجود بھی سود کا محتاج نہیں۔ اس کی تخلیق کے لیے بھی کوئی قرض لینا دینا نہیں پڑتا۔ تاہم بینکی زر قرض کے لین دین کے بغیر تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے اس کے وجود کے لئے سود ایک لازمی شرط ہے۔

اس پیش کردہ تحریر میں جو قارئین کے ہاتھ میں ہے پہلی تجویز یہ ہے کہ زر کا نظام ایسا ہونا چاہئے جس میں زر کی رسد سود مہیا کرنے کی بنیاد پر نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زر سے کسی قسم کا نفع کمانے کی امید سے سرمایہ کاری ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ زر جاری کرنے والا اس کے استعمال کی وجہ سے کوئی قیمت یا کرایہ یا کسی اور قسم کی اجرت حاصل نہ کرے۔

فریڈرک سوڈی (Frederiek Soddy) لکھتا ہے:

"پرائیویٹ کمپنیوں کو سرنگانے کی اجازت دینے سے پارلیمنٹ نے جمہوریت کو بنیادی طور پر اور شاید ناقابل تلافی طور پر گمراہ کیا ہے۔ پہلی عالمی جنگ سے پیشتر باعزت ماہرین معاشیات میں یہ رواج تھا کہ وہ اس طرح تخلیق کردہ غیر مرئی زر (Invisible Money) اور کاغذی نوٹوں کے درمیان بال کی کھال جیسا بھی باریک سابدیاتی کافر قیاس نکال لیتے تھے۔ کاغذی نوٹ تو درحقیقت زر تھا مگر غیر مرئی زر درحقیقت زر نہیں تھا۔ دراصل اس موضوع پر ان کی تحریریں پڑھ کر قاری خود ہی ان کی مشتبہ باتیں محسوس کر لیتا تھا۔ سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ متوقع جواز اور خصوصی دلائل کے سائے میں نئے زر کی تخلیق ٹھپ جاتی ہے۔"

(Soddy, F. "The Role of Money." 1934, P. 30)

بینکاری کے حمایت کاروں نے اس قسم کی تنقید کو انتہا پسندی یا غیر متوازن ذہن کی سوچ کا لیبل لگانے کی انتھک کوشش کی ہے۔ مگر جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے اتنا ہی زیادہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تنقید کتنی ہمہ گیر تھی۔ ٹامس جیفرسن (Thomas Jefferson) نے ایک خط میں جان ویلز ایپس (John Wayles Eppes) کو 24 جون 1813ء کے دن لکھا جو "Writing" (1984ء) میں "New York Literary

"Classics of the United States" نے شائع کیا:

"بینک کے لائحہ و کاغذ (یعنی کاغذی زر) نے انگلینڈ کے سکوں کو جلاوطن کر دیا ہے اور اب اس کی قدر میں کمی جس کو ملکی مدد یوں نے بھی تسلیم کیا ہے ملک کو یو ایہ پن کی طرف لیجا رہی ہے جس طرح اس نے فرانس میں کیا..... موجودہ (زر کی) گردش کی حالت میں پرائیویٹ لوگوں کی قسمت ان خود ساختہ دائین کے رحم و کرم پر ہے اور وہ زر (Nominal Money) کے سیلاب میں ان کے لالچ کی وجہ سے بہہ کر اوندھے منہ گری ہوئی ہے۔"

مذکورہ بالا تحریر میں ٹامس جیفرسن نے ایک اور خط 28 مئی 1816ء کو جان ٹیلر (John Taylor) کے نام لکھا:

"اور میں سنجیدگی سے یقین کرتا ہوں کہ بینکاری کے محکمے اس فوج سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جو مقابلے کے لئے سامنے کھڑی ہو۔ اور سرمایہ کاری کے نام پر زر کے اصراف کا یہ اصول بڑے پیمانے پر مستقبل کو دھوکہ دیتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس کی ادائیگی کریں گی۔"

صدر جیکسن نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"بینک آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس نے لوگوں سے اپنے مطالبات مجبوراً پورے کرانے کے لئے جب ایک قسم کی جنگ شروع کی تو رنج اور خوف نے جس طرح پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ بے رحمی اور نہ بخشنے والے رویہ کے ساتھ جب پورے شہروں اور بستیوں پر جبر ہوا، جب افراد کو نکال اور تباہ ہوئے اور جب آنے والی نسلوں کی خوشحالی کا منظر اچانک ظلمت اور مایوسی میں بدل گیا تو اس کے امن نفوس امریکا کے لوگوں کی یادوں میں یقیناً ثبت ہوئے ہوں گے۔ اگر امن کے زمانے میں اس کی طاقت یہ تھی تو زمانہ جنگ میں اس کی کیفیت کیا ہوگی جب دشمن تمہاری دہلیز پر کھڑا ہو؟ سوائے امریکہ کے آزاد لوگوں کے کوئی قوم ایسی نہیں ہوگی جو اس مقابلہ میں کامیاب ہوئی ہو۔ ہاں اگر تم نے فتح حاصل نہ کی ہوتی تو گورنمنٹ اکثریت سے اقلیت کی طرف جا چکی ہوتی اور سرمایہ کی اس منظم طاقت والی پوشیدہ جمعیت نے اوپر والے افسروں کی مرضی مسلط کر کے تمہیں امن یا جنگ جو بھی ان کے بہتر مفاد میں ہوتی کی طرف دھکیل دیا ہوتا۔"

(President Andrew Jackson, Address to the American People, 4 March 1837, recorded in "Richardson's Messages," Volume 4, P. 1532)

"اپنی قوت اصراف اور لوگوں کی قوت خرید کی ضروریات پوری کرنے کے لئے گورنمنٹ کو چاہیے کہ تمام کرنسی اور کریڈٹ خود مختص کر کے اسے جاری کرے اور گردش میں لائے۔ زر کو تخلیق کرنے اور اجرا کرنے کا نہ صرف حق ہی گورنمنٹ کو ہے بلکہ اس کے لئے ایسا کرنے کا موقع بھی ہے۔ ان اصولوں کو اپنانے سے مبادلے کے ایک یکساں ذریعے کی ضرورت پوری ہوگی جس کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس لئے ٹیکس گزارسود کی بہت بھاری رقوم اور ڈسکاؤنٹ سے بچ جائیں گے۔ زر کا ایک آقا کے کردار کے بجائے انسانیت کے لئے ایک خادم کی حیثیت ہوگی اور قوت زر کے مقابلہ میں جمہوریت کو برتری حاصل ہوگی۔"

(President Abraham Lincoln, "Senate Document 23, 1865)

ریجی نالڈ مکینا (Reginald Mckenna)، جو ایک وقت میں برطانوی خزانے کا چانسلر تھا

اور بعد میں مڈلینڈ بینک (Midland Bank) کا چیئرمین تعینات ہوا، لکھتا ہے:

”میرا خیال ہے عام شہری یہ سننا پسند نہیں کریں گے کہ بینک آف انگلینڈ یا کوئی اور بینک زر کو تخلیق بھی کر سکتے ہیں اور ضائع بھی کر سکتے ہیں۔“

(Mckenna, R., "Postwar Banking Policy," 1928, P.93)

جیفرسن (Jefferson) کے تبصرے کے تقریباً دو سو سال بعد شاید یہ خیال ہوتا کہ معاشرہ اپنے

آپ کو زر کے لالچی تخلیق کاروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جزوی زر محفوظ کی بینکاری کے پھیلاؤ سے زر کی تخلیق کا حجم ڈرامائی طور پر بڑھ ہی گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر ممالک میں بینکاری دوسرے تجارتی کاروباروں سے کہیں زیادہ فائدہ بخش ہے۔

| ملک | بینکاری سے حاصل کردہ نفع | بینکاری علاوہ حاصل کردہ نفع |
|---------|--------------------------|-----------------------------|
| برطانیہ | 20.62 | -0.97 |
| فرانس | 7.99 | -2.41 |
| سپین | 4.79 | 4.13 |

2001ء میں بینکاری کے علاوہ بڑے کاروباری اداروں اور بینکاری کے کل منافع کا موازنہ
(ارب امریکی ڈالروں میں)

(ماخذ: "Fortune Magazine", Vol.146, No.2, Europe, August 2002)

وقتاً فوقتاً مرکزی بینک آزاد منڈی (Open Market) سے آلات مالیہ (Financial

Instruements) کی خرید و فروخت کرتا رہتا ہے۔ نام نہاد آزاد منڈی کی کاروائیاں (Open

Market Operations) سرکار کے قرض اتارنے یا لینے کی وجہ سے عمل میں نہیں لائی جاتیں بلکہ یہ

اس لئے کیا جاتا ہے کہ معیشت میں یا تو بہت زیادہ زر گردش کر رہا ہے یا بہت کم۔ جب نئے زر کے

اجرا سے سرکار پچھلا قرض اتارتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ قرض کی زرکاری (Monetised) کی گئی ہے۔

اب اسی نئے جاری شدہ زر کو پھر آگے بینکاری کا نظام بطور زر محفوظ استعمال کر کے مزید سودی زر تخلیق

کر سکتا ہے۔ (بصورت دیگر سرکاری بینکوں کو بانڈ فروخت کر کے اور اس طرح سے حاصل شدہ زر کو خرچ کرنے سے بینکوں کے زر کی رسد میں اضافہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ بینکوں سے لیا گیا قرض واپس بینکاری نظام میں آ جاتا ہے۔ اس طرح سرکار قرض خواہ کا کردار ادا کرتی ہے جس سے جزوی زیر محفوظ کی بینکاری پر عمل درآمد ہو سکتا ہے)۔

جب مرکزی بینک سرکاری زر کی زیر گردش مقدار کو کم کرنے کے لئے آزاد منڈی کی کاروائیاں کرنا چاہتا ہے تو یہ بینکاری کے شعبہ میں بانڈ یا بل بیچتا ہے اور اس طرح سے وصول کردہ رقم کو صرف نہیں کرتا تو زیر گردش زر سکڑتا ہے اور کچھ عرصہ میں بینکی زر کی رسد کم ہوتی ہے۔ مگر یہ مطلوبہ ثمرہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا کیونکہ وصول کردہ قرض پر سرکار کو سود دینا پڑتا ہے اور اس طرح سرکار نے شروع میں تجارتی بینکوں سے جتنا زر حاصل کیا تھا اسے اس سے زیادہ واپس کرنا پڑتا ہے۔ مشکین (Mishkin) لکھتا ہے:

”بہت سے ملکوں میں سرکاری تخلیق زر کا عمل سیدھا سا ہے۔ کیونکہ خزانہ کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ کرنسی جاری کرے جس سے سرکاری اخراجات کی ادائیگی ہو سکے۔ امریکہ میں یہ عمل کچھ پیچیدہ سا ہے۔ کیونکہ خزانے کو کرنسی جاری کر کے اشیاء و خدمات کے حصول کے لئے ادائیگیاں کرنے کا حق حاصل نہیں۔ وہ صرف تمسکات (Securities) جاری کر سکتا ہے۔ یہاں سرکار کے مالی اصراف کے لئے تخلیق زر کا عمل ایک گول مول سارا ستہ اختیار کرتا ہے جس میں خزانہ لوگوں کو بانڈ فروخت کرتا ہے پھر انہیں فیڈرل ریزرو بینک (Federal Reserve Bank) خرید لیتا ہے۔ سرکار کے اخراجات کے لئے مالی رسد کا یہ طریقہ زر کو چھاپنا (Printing Money) کہلاتا ہے چونکہ اس طرح سے قوی تر زر (High Powered Money) جو کہ زر کی اساس (Money Base) ہے کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسے قرض کی زرکاری (Monetizing) بھی کہتے ہیں کیونکہ جیسا کہ مذکورہ بالا دو مراحل کے عمل سے ظاہر ہے سرکار کا قرض جو سرکاری اخراجات کے لئے جاری کیا گیا اتنا زرو عام کے ہاتھوں سے نکال کر قوی تر زر بنادیا گیا۔“

(Mishkin, F.S., "The Economics of Money Banking and Financial Markets", 1992, P. 421)

تجارتی بینکوں کے کھاتہ داروں کے بیلنس میں سود کی وجہ سے اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے خواہ ان کے کھاتوں میں ڈیبٹ (Debit) ہو یا کریڈٹ (Credit)۔ آج کے زمانے کا بہت بڑا مغالطہ یہ ہے کہ سود کی شرح بڑھانے سے زر کی رسد کی نمو میں کمی آتی ہے جس سے افراط زر کی حد بندی ہوتی ہے۔ درحقیقت سود کی شرح بڑھانے سے ڈیبٹ اور کریڈٹ کے بیلنس تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اس لئے آخر کار معیشت میں زر کی رسد اور قرض دونوں کی سطح بڑھتی ہے۔ لہذا یہ طریق کار ایسا نہیں جس کے ذریعے افراط زر کی آسانی سے حد بندی ہو سکے۔

زری پالیسی (Monetary Policy) کا طریقہ کار خواہ کچھ بھی ہو اس سے ایک بہت بڑا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر زری محفوظ کی شرح کی نجی حد مقرر ہو اور سرکاری زر کی رسد مستحکم رہے تو بینکی زر کی رسد ہمیشہ کے لئے نمو پذیر نہیں ہو سکتی۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا سود کی وجہ سے بینکی زر میں توسیع لازمی امر ہے۔ اب جس طریقہ سے یہ تضاد حل کیا جائے گا بعد میں وہی معیشت کی کارکردگی کا تعین کرے گا۔

تجارتی بینکوں کے پاس اپنے زری محفوظ کی شرح کی سطح کو بہت نیچے کرنے سے روکنے کے لئے دور استے ہوتے ہیں۔ یا تو قرض واپس مانگنے پڑتے ہیں یا سرکار سے مزید زری محفوظ کے لئے اثاثہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ پہلی صورت میں تخلیق کردہ زری قرضوں کی واپسی کی وجہ سے سکڑتا ہے اور اس طرح معیشت مندی (Recession) کے بھیانگ گرداب میں پھنس جاتی ہے۔ دوسری صورت میں زر کی رسد میں مسلسل پھیلاؤ ہوتا رہتا ہے۔

زری رسد میں سکڑاؤ سے معاشی اور سیاسی نتائج کے پیش نظر اکثر حکومتوں کا رجحان زر کی رسد میں پھیلاؤ کی طرف ہوتا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے یا تو سرکاری زر میں یا بینکی زر میں یا پھر دونوں میں ہی اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مشکل بیان کرتا ہے۔ سرکاری زر اکثر گورنمنٹ کے قرض کے اجراء سے تخلیق ہوتا ہے۔ اس لئے اس پالیسی پر چلنے سے گورنمنٹ کے قرضہ میں خاصا اضافہ ہوتا ہے اور اگر بینکی زر میں دوسرے ذرائع (مثلاً زری محفوظ کی شرح کم کرنے) سے اضافہ کی ترغیب دی جائے تو اس کے نتیجے میں نجی لوگوں اور کارپوریشنوں کا قرض بڑھتا ہے۔

چونکہ سرکاری ٹیکس سے ملنے والی رقم کا انحصار زیادہ تر معیشت میں خرید و فروخت اور آمدنیوں کی مقدار پر ہوتا ہے اس لئے زر کے بڑھنے سے سرکاری ٹیکس بھی بڑھتا ہے۔ چنانچہ جہاں بینکوں سے نجی قرضوں کے اضافے سے معاشی خوشحالی پیدا ہوتی ہے وہاں سرکار کے قرض لینے کی ضرورت بھی کم ہو جاتی ہے اور سیاسی طور پر اس میں ملک کی بہتری نظر آتی ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ قرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ بس صرف سرکاری قرض اور نجی قرض میں تناسب کی بات رہ جاتی ہے۔ پھر جب (معاشی) مندی (Recession) کا زمانہ آتا ہے تو سرکار کے رفاہی اخراجات (مثلاً بے روزگاری الاؤنس) خاصے بڑھ جاتے ہیں اور سرکاری بجٹ کا خسارہ واپس نمودار ہو جاتا ہے۔

بہت سے لوگ افراط زر کو کوئی خاص برائی نہیں سمجھتے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ افراط زر میں اتنی بڑی برائی کیا ہے؟ لیکن قرض کا معاملہ تو ہے ہی بالکل علیحدہ:

”انہائی مقروض ملک اپنے قرض کی سالانہ ادائیگیوں سے اگر سبکدوش ہو جائیں تو وہ اپنی رقوم سے سرمایہ کاری کر سکتے ہیں جس سے صرف ایک افریقہ میں ہی 2000ء تک تقریباً 21 ملین بچوں کی زندگیاں بچائی جاسکتی ہیں اور 90 ملین بچوں اور عورتوں کو تعلیم کی سہولت مہیا کی جاسکتی ہے۔“

(United Nations Development Programme, "Human Development Report," 1997, P. 93)

چونکہ قرض کی ادائیگی خوراک اور ادویات خریدنے سے پہلے کرنی ہوتی ہے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ بینکاری کا نظام لوگوں کو قتل کر رہا ہے۔ مگر نہ تو ہالی وڈ قرض کے ہالوکاسٹ (Holocaust) کی فلمیں بناتا ہے اور نہ ہی صحافی ہمیں بتلاتے ہیں کہ قرض سے کیا کچھ ہو رہا ہے۔

البتہ ہم بسا اوقات بدعنوان آمروں کے متعلق سنتے رہتے ہیں کہ انہوں نے قرض لے کر اسے محلوں اور افواج پر فضول ضائع کیا۔ شاید ہمیں یہ سوال کرنا چاہیے کہ شروع میں انہیں قرض دیا ہی کس نے تھا۔ صرف ایک دو نہیں درجنوں ممالک ایسے ہیں جو ناقابل ادا قرض تلے دبے ہوئے ہیں۔ کیا وہ سب کے سب بدعنوان ہیں؟ اگر وہ واقعی ہیں تو قرض دینے والے مغربیوں نے شروع کے ہی چند بُرے تجربات سے سبق کیوں نہ سیکھ لیا؟ کیا ایک دن ان کی آنکھ اچانک کھلی تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے سب کے سب قرض دار خراب ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جتنی بدعنوانی ترقی پذیر دنیا میں پائی جاتی ہے مغرب میں بھی کم از کم اتنی ضرور پائی جاتی ہے مگر یہاں وہ نظر نہیں آتی کیونکہ وہ یہاں پیچیدہ سرمایہ دارانہ نظام اور پیشہ دارانہ مسکراہٹوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔

اگر ہم مغرب کے سرمایہ کاری کے شعبوں کے پیچھے محرکات کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کریں تو بلاشبہ پتہ چلے گا کہ ان کی اپنے قرض خواہوں پر سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کی خواہش ہی ایک محرک ہے۔ مثلاً، ایشیا میں 1997ء کے مالی بحران نے ایسا ایک موقع فراہم کیا جس میں ملکی پالیسی کی تبدیلی کا صلہ قرض کی امداد تھی اور ایسا ہم پچھلے پچاس سالوں میں بارہا مرتبہ دیکھ چکے ہیں۔ ان محرکات کو مشروطیت (Conditionality) وغیرہ قسم کی اصطلاحات میں تو چھپایا جاسکتا ہے مگر یہ کبھی نہیں بتلایا جاتا کہ مسئلے کی اصل وجہ جزوی زر محفوظ پینی بینکاری کا نظام ہے۔ آخر کار ہوتا یوں ہے کہ مزید درمزید

قرض دیئے جاتے ہیں جو کہ مجموعی طور پر ناقابل ادا ہوتے ہیں۔ میرے (مصنف) کے علم میں کوئی بھی ترقی پذیر ملک ایسا نہیں جس نے آئی ایم ایف یا ورلڈ بینک سے امداد لی ہو اور بعد میں قرض سے نجات پانے کا انتظام کر سکا ہو۔ آج کل مغربی استعمار کا زیادہ تر انحصار فوج کے بجائے عالمی سرمایہ کارانہ نظام پر ہے۔

زر کی رسد کی مزید وضاحت

(More on Money Supply)

اس موقع پر زر کی رسد کے پھیلاؤ پر کچھ اعداد و شمار سبق آموز ہوں گے۔ مگر اس سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ زر کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً سرکاری زر اور بینکی زر اور علیٰ ہذا القیاس زر کی رسد کے بھی مختلف پیمانے ہیں۔ چونکہ ہر مختلف پیمانہ مختلف قسم کے بینک کے کھاتوں اور آلات مالیہ (Financial Instruments) پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے ماہرین معاشیات زر کی پالیسی (Monetary Policy) کو زیر نگاہ رکھنے کے لئے درست پیمانہ کے انتخاب پر متفق نہیں۔

مثال کے طور پر برطانیہ کو لیجئے۔ مرکزی بینک سے باہر گردش پذیر نوٹوں اور سکوں کے میزان اور تجارتی بینکوں کے مرکزی بینک کے اندر فعال اثاثوں کے دونوں کے مجموعہ کو M_0 فرض کیجئے۔ یہ زر کی رسد کا تنگ (Narrow) پیمانہ ہے۔ بینکنگ کے نظام کے اندر جاری کھاتوں میں جمع شدہ صافی (Net) مقدار اور M_0 کے مجموعہ کو M_1 فرض کیجئے جو زر کی رسد کا فراخ (Wider) پیمانہ ہے۔ M_1 میں اگر میعاد کی کھاتوں میں جمع شدہ زر (Time Deposit) جمع کیا جائے تو اسے M_2 فرض کیجئے۔ اور M_2 میں بلڈنگ سوسائٹیوں کا جمع شدہ زر زر کی مارکیٹ کے آلات زر اور کوئی دوسرا سرمایہ بھی جمع کر لیا جائے تو یہ مزید فراخ پیمانہ بن گیا جس کو M_4 فرض کیجئے۔

| سال | برطانیہ بلین پونڈ | جاپان ٹرلین یین | ملائیشیا ملین رینگٹ |
|-------|----------------------|--------------------|------------------------|
| 1968ء | 16 | 39 | 3,263 |
| 1978ء | 56 | 168 | 17,521 |

| | | | |
|---------|-----|-----|-------|
| 60,135 | 408 | 393 | 1988ء |
| 291,801 | 578 | 835 | 1998ء |

مختلف ممالک کی M_2 زر کی رسد

(IMF International Financial Statistics Year Book, 2000 (ماخذ)

اوپر کی جدول میں ہماری زیر نگاہ ایک پیمانہ M_2 ہے جو سرکاری اور بینکی زر کی رسد کا مجموعہ ہے۔ اوپر والی ہر مثال میں نوٹ کیجئے کہ زر کی رسد کا مستقل اضافہ سودی زر کے نظریہ کی پیش گوئی کے عین مطابق ہے۔ درج ذیل جدول زر کی وہ رسد پیش کر رہی ہے جو بینکاری کے نظام نے تخلیق کی۔

| سال | امریکہ | جاپان | برطانیہ | ترکی | انڈونیشیا |
|-------|--------|-------|---------|------|-----------|
| 1968ء | 87.7 | 88.7 | 79.5 | 41.7 | 13.1 |
| 1978ء | 89.9 | 88.8 | 84.1 | 36.3 | 52.0 |
| 1988ء | 91.5 | 90.4 | 95.0 | 69.2 | 78.2 |
| 1998ء | 89.3 | 89.3 | 96.2 | 72.0 | 87.6 |

مختلف ممالک میں بینکاری نظام کی تخلیق کردہ زر کی رسد بطور M_2 کا فیصد

(IMF International Financial Statistics Year Book, 2000 (ماخذ)

مندرجہ بالا اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ کاغذی زر کے چھاپے خانوں کو کنٹرول تو سرکاری کرتی ہے مگر زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ آج کل زر کے سب سے بڑے تناسب کی صنعتکاری تجارتی بینک کرتے ہیں جس کو کمپنیاں اور دیگر افراد پھر آگے اپنے روزمرہ کے کاروبار میں استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں تو جیسے زر کی صنعتکاری کا پروانہ ملا ہوا ہے۔

کچھ ماہرین معاشیات نے اس بات کی دلیلیں دی ہیں کہ اوپر والی صورت حال بالکل نا انصافی ہے جن کے کئی حوالے اس کتاب میں دیئے بھی گئے ہیں۔ دوسرے ماہرین یہ سوال کرتے ہیں کہ زر کی رسد کی سطح اور اس میں کمی بیشی کی اہمیت آخر ہے ہی کیوں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ بینکاری کے نظام کی کارروائیاں تو درحقیقت معیشت کے لئے فائدہ مند ہیں چونکہ نقصانات سے ان کے فوائد زیادہ ہیں۔

چنانچہ ایسے ماہرین معاشیات اگرچہ بالعموم اس بات پر متفق ہیں کہ زر کی رسد میں تبدیلیاں معیشت پر لازماً اثر انداز ہوتی تو ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ بحث طلب ہے تو وہ صرف زر، پیداوار اور قیمتوں کے باہمی تعلق کا موضوع ہے۔

خلاصہ یہ کہ حمایت اور مخالفت دونوں میں ماہرین معاشیات کے مابین دلائل چلتے رہتے ہیں۔ ایک گروہ محسوس کرتا ہے کہ زر کی رسد میں تبدیلیاں آ خر کار قیمتوں کی سطح میں تبدیلیاں تولاتی ہیں جب کہ پیداوار جیسے متغیرات (Variables) پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں زر غیر جانبدار (Neutral) ہے۔ دوسرے محسوس کرتے ہیں کہ زر کی رسد میں تبدیلیاں آ خر کار متغیرات پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ سیدھا سادھا سوال یہ ہے کہ زائد مقدار میں زر کی صنعتکاری اور اصراف کیا پیداوار کی کسی اکائی کو وجود میں لاتا ہے یا کہ صرف موجودہ اکائیوں کی قیمت میں ہی اضافہ کرتا ہے۔ معاملہ غالباً یہ ہے کہ حقیقت دونوں نظریات کے بین بین ہے اور معاشی نظام کے ابتدائی حالات پر منحصر ہے۔ جس معیشت میں زر کی مقدار کم ہو اس میں مزید زر غالباً زیادہ تجارت پیدا کرے گا اور لوگوں کو کام مہیا کرے گا۔ جس معیشت میں زر کی مقدار زیادہ ہو وہاں مزید زر غالباً صرف افراط زر ہی پیدا کرے گا۔ نوکلاسیکی (Neo-Classical) دلیل کہتی ہے کہ زر کی رسد کسی معیشت میں بالعموم قیمتوں کی سطح متعین کرنے کا ایک بہت بڑا فیصلہ کن عنصر ہے۔ اس بات پہ کوئی شک نہیں کرے گا کہ یہ زر کی رسد میں اضافہ ہی تھا جس نے جنگ کے دوران جرمنی میں اور ماضی قریب میں کمیونسٹ دور کے بعد والے روس میں افراط زر پیدا کی۔ (البتہ مغرب کا مخصوص معاشی پروپیگنڈا ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ اندھا دھند زر چھاپنے کا ذمہ دار ماسکو تھا جب کہ درجنوں نئے لائسنس یافتہ روسی تجارتی بینکوں کی زر کی صنعتکاری کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا)۔ دوسری طرف پروفیسر فشر (Fisher) نے قیمتوں میں کمی کا تعلق امریکہ میں 1930ء کی دہائی کی غیر معمولی مندی (Great Depression) کے دوران تفریط زر کے ساتھ جوڑا ہے۔

زر کی رسد اور قیمتوں میں تعلق مندرجہ ذیل سادہ ترین مساوات سے تجویز کیا گیا ہے جو کہ (1911) Fisher's Quantity Theory of Money "میں دی گئی ہے۔

$$MV=PT$$

جب کہ

$$M = \text{زر کی رسد}$$

$$V = \text{گردش کی رفتار}$$

$$P = \text{دیئے گئے دورانیہ میں بالعموم اوسط قیمت کی سطح}$$

$$T = \text{دیئے گئے دورانیہ میں کاروباری لین دین (Transactions) کی تعداد}$$

یہ فارمولا درست مانا جاتا ہے۔ چونکہ زر کی مقدار ضرب اس کے استعمال کی تعداد کو اوسط قیمت کی سطح ضرب کاروباری لین دین ہائے کی تعداد کے مساوی ہونا چاہیے۔ اس کے تجویز کنندگان کے مطابق یہ تھیوری فائدہ مند تب ہے جب "V" اور "T" چھوٹے دورانیہ میں غیر متغیر ہوں۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ "P" کا انحصار "M" پر ہے یعنی "P" میں تبدیلیاں "M" کو کنٹرول کر کے لائی جاسکتی ہیں۔

اگر یہ کہنا درست ہے کہ زر کی رسد میں تبدیلیاں بالعموم قیمتوں کی سطح پر اثر انداز ہو سکتی ہیں تو پھر ہر کسی معاشیاتی تجزیہ کے لئے سرکاری زر اور پرائیویٹ زر دونوں کے اجرا کا جائزہ لینا نہایت ہی ضروری ہو جاتا ہے اور بہت سے مصنف اس پر متفق بھی ہیں۔ سوڈی کی تحریر "Wealth, Virtual Wealth and Debt, 1926" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرینک نائٹ (Frank Knight) لکھتا ہے:

"خلاصہ یہ کہ مبادلہ واسطہ (Medium of Exchange) کی مقدار کو متعدد مرتبہ بڑھانے کے لئے معاشرے کا بینکاری نظام کو سودا کرنا احمقانہ اور بھیاں تک فعل ہے جب کہ: 1۔ سرکاری محکمہ بھی کام تقریباً بلا قیمت کر سکتا ہے 2۔ ایسا کرنا سرے سے ہی عقلمندی نہیں چونکہ اس سے محض قیمتوں کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے اور 3۔ نتیجہ اہم برائیوں کی شکل میں نکلتا ہے خاص کر پورے معاشی نظام کی خوفناک ناپائیداری پیدا ہو جاتی ہے۔"

(Frank Knight: "Saturday Review of Literature", 1927, P. 732)

جان پلینڈر (John Plender) فنانشل ٹائمز میں تبصرہ کرتا ہے:

"تجارتی بینکوں کی نگرانی کے لئے مرکزی بینک جتنے بھی انسانی اور مالی وسائل بروئے کار لاتا ہے ان سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نکلا نظر نہیں آتا۔ جن معیشتوں میں انگریزی بولی جاتی ہے وہاں 1970ء کی دہائی سے لے کر اب تک ہر معاشی دور (Economic Cycle) میں ان تمام معیشتوں نے ایک بینکاری کا بحران دیکھا ہے، 1974ء میں جاپانیوں کی حالت ڈوبی، 1982ء میں

غیر ترقی یافتہ ممالک کے قرضوں نے مصیبت پیدا کی، 1980ء کی دہائی کے آخر میں فضول قسم کے باغ کی ناکامی کے ساتھ ساتھ بچتوں اور قرضوں کی چابی ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیکس گزار طبقہ کو ایسے ذرا ادا کرنے پڑے۔“

اس کے برعکس فریڈمین (Friedman) یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ موجودہ نظام کے ڈھانچے میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں چونکہ تجارتی بینکوں کے تخلیق قرض کو زوری پالیسی کے مختلف طریقوں سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا ہے کہ ایسے طریقہ ہائے کار نہایت ہی غیر اعتباری ہوتے ہیں اگرچہ معیشت کی ایک بھاری قیمت پر کبھی کامیاب ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اپنی تحریر "Free to Choose" میں فریڈمین دلائل دیتا ہے کہ سرکار کو سختی سے اس پالیسی پر کاربند ہونا چاہیے جس سے زر کی اساس میں صرف 3 سے 5 فیصد کے درمیان نمو کی اجازت ہو۔ اس نمو سے آبادی اور تجارت کے اضافے کے نتیجہ میں معاشی کارگزاری میں ہونے والے اضافے کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ "Monetary Policy: Tactics Versus Strategy" میں فریڈمین اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ سرکار کو زر کی اساس ہمیشہ کے لئے منجمد ہی کر دینا چاہیے۔ اور ساتھ ہی بینک کے زر محفوظ کی ضروریات بھی ختم کر دینی چاہیے۔

فریڈمین کی آخری تجویز کے مطابق سرکار کو تو تخلیق زر سے رک جانا چاہیے جب کہ بینکوں کو ایسا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ مگر ایسا کرنے سے اپنی ضروریات کے لئے سرکار کو بینک کا تخلیق کردہ زرسود پر لینا پڑے گا اور اس کی قیمت عوام ادا کرے گی حالانکہ سرکار سود کے بغیر اپنے زر کی صنعتکاری خود ہی کر سکتی ہے۔ اس پالیسی سے نجی شعبہ (Private Sector) کی استعداد کو مزید تقویت حاصل ہوگی اور وہ زر کی رسد کو منافع کی غرض سے متوقع نتائج کے لئے اپنی مرضی کے مطابق جتنا چاہے تبدیل کر سکے گا۔

برطانیہ کا تجربہ

(The UK Experience)

کافی مواقع پر یہ دلائل سنے جا چکے ہیں کہ سرکار کے مناسب انتظام سے زر کے نجی اجرا کو ضابطے کے اندر لایا جاسکتا ہے تاکہ معاشی حالات پر اس کے بُرے اثرات نہ ہونے پائیں۔ افسوسناک بات

یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سالوں پر محیط زری پالیسی کے انچارج ارباب اختیار کے بہت سے منصوبے ترک کئے جا چکے ہیں جو ضابطے نافذ کرنے کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ کوڈیسٹ "Corest" (بینک ڈیپازٹ کی نمو کو محدود کرنے کے لئے) اور کچھ حکم نامے جو تجارتی بینکوں کی قرض دینے کی پالیسی کو مرکزی بینک کے کنٹرول میں لانے کے لئے جاری کئے گئے اور خصوصی ودائع سکیس (Special Deposit Schemes) صرف چند مثالیں ہیں جو ناقص ثابت ہوئیں اور رائج کرنے کے بعد ترک کر دی گئیں۔

برطانیہ میں 10 فیصد زرمحفوظ کی شرح جو پہلے سے چلی آرہی تھی اُسے 1981ء کے دوران سرکار کی نرمی کی وجہ سے آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ اسی سال 20 اگست کو بلا تکلف نیاز زری نظام فوری طور پر نافذ کر دیا گیا جس کے نتائج بہت ہی دور رس تھے۔ پالیسی کی تبدیلی کے نتیجہ میں تجارتی بینکوں کو اپنے واجبات (Eligible Liabilities) کا صرف 0.50 فیصد مرکزی بینک میں بطور زرمحفوظ رکھنا پڑتا تھا جو کہ غیر فعال ودیعہ (Non-Operational Deposit) ہوتا تھا۔ کسی بینک کی "Eligible Liabilities" سے مراد وہ سٹرلنگ ودائع (Deposits) ہیں جو بینک آف انگلینڈ کے متعین کردہ زمروں کے تحت واجب الادا ہیں۔ اس کے علاوہ "Eligible Liabilities" کا اوسط 0.6 فیصد حصہ سیال ودائع کی شکل میں زیادہ تر ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کے اندر رکھنا پڑتا تھا۔ 1998ء میں غیر فعال زرمحفوظ کی شرح کو کم کر کے 0.15 فیصد کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری زرمحفوظ کی شرائط بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے زرمحفوظ کی کم شرح بینکاری کے نظام کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ جمع شدہ سرکاری زر کے عوض زیادہ بینکی زر تخلیق کر لے۔ چنانچہ برطانیہ میں وہ لوگ خوش ہو گئے ہیں جو ایک اور جائیداد میں تیزی (Property Boom) کی توقع کر رہے تھے۔

زری رسد میں پھیلاؤ کے سلسلہ میں بینکاری نظام کے کردار کے متعلق مندرجہ ذیل ایک اہم بیان "Bank of England Quarterly Bulletin for September 1981" میں شائع ہوا:

"زرمحفوظ کی شرح کو صفر کر دینے سے بینکاری نظام کو سیولت میں مزید پگھ ہوگی تاکہ زر کے عارضی انخلا کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ مگر لمبے عرصہ بعد بینکاری نظام کی سیولت میں بہتری زر کے ہدف کے مطابق تب ہوگی جب اس کی نجی اور غیر ملکی شعبوں کو قرض دینے کی نمو کو محدود کیا جائے۔"

مگر محدود کی جائے تو کیسے؟ ظاہر ہے خود انضباطی سے ایسا تو نہیں ہوگا۔ واین گاؤلی (Wyne Godly) فنانشل ٹائمز کے 4 جنوری 1993ء کے شمارے میں بینک آف انگلینڈ کے کنٹرول کی نرمی کے بعد آنے والے حالات کے متعلق معاشی پیشنگوئی کرتے ہوئے یوں تبصرہ کرتا ہے:

”.....گزشتہ واجبات کی بازیابی کی ابتدا کریڈٹ کنٹرول کو ختم کرنے سے کی گئی جس سے دیرپا اشیاء اور مکانات کے اوپر اصراف کے لئے قرضوں کی ایک دم بھر مار پیدا ہوئی۔ اب دوبارہ ایسا نہیں کیا جاسکتا جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب کوئی کریڈٹ کنٹرول ہے ہی نہیں جس کو ختم کیا جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لائن کی خوشحالی (Lowson Boom) کے دورانیہ میں ناقابل وصول قرضوں (Bad Debts) کی وجہ سے بینکوں اور دیگر قرض دینے والے اداروں کے تختہ و توان (Balance Sheets) بری طرح کمزور ہو چکے ہیں۔“

باضابطہ کنٹرول کی غیر موجودگی میں بینکاری کے تخلیق زر کا مقابلہ کرنے کیلئے اب ترقی یافتہ معیشتوں کے ارباب اختیار صرف ایک ہی ہتھیار پر انحصار کر کے مطمئن ہیں۔ اور وہ ہتھیار سود کی شرح والی پالیسی ہے۔ کچھ ماہرین معاشیات کے مطابق سود کی سطح میں اضافہ زیادہ قرض لینے والوں کے قرض کی مقدار میں کمی لاتا ہے جس سے اشیاء و خدمات کی طلب کم ہوتی ہے اور نتیجتاً قیمتوں کی چڑھائی میں کمی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک عام آدمی کو یہ باور کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ افراط زر کو کنٹرول کرنے کے لئے سود کی شرح بڑھنی چاہیے۔ مگر درحقیقت اس سے عام آدمی کو صرف گمراہ ہی کیا گیا ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ودائع وصول کرنے والے ادارے نفع کمانے کے لئے اپنے وصول کردہ ودائع کے اوپر کم شرح سے سود ادا کرتے ہیں اور اپنے دیئے گئے قرضوں کے اوپر زیادہ شرح سے سود لیتے ہیں۔ سود کی اشراج کے اس فرق کو سودی پھیلاؤ (Interest Spread) کہتے ہیں۔ یہ دلیل تجارتی بینکوں کی اصل کارستانی یعنی زر کی صنعتکاری کرنے اور آگے اسے سود پر دینے کے اوپر پردہ ڈالتی ہے۔ درحقیقت اس طرح سے اس کاروبار میں نفع بڑھانے کے دو طریقے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ زیادہ زر کو قرض پر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ سود کے پھیلاؤ کی مقدار کو بڑھایا جائے۔ سود کی شرح ان دونوں طریقوں پر اثر انداز ہونے کے لئے اکثر اوقات بے معنی ہوتی ہے۔ اور سود کی شرح زیادہ ہو تو پھر بھی بینکی زر میں توسیع جاری رہتی ہے۔

اگر لوگ استعمال کی کوئی چیز خریدنے کے لئے قرض لیں تو اکثر اوقات وہ سود کی شرح میں چند فیصد کمی بیشی کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ کیونکہ بہت لوگوں کے لئے کسی چیز سے لطف اندوز ہونے کی

خواہش بہت غالب ہوتی ہے اور وہ قرض کی ادائیگی کی فکر بعد میں کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سود کی شرح میں زیادتی لوگوں کو قرض لینے سے روکے گی۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب یہ شرح واقعی تکلیف دہ حد تک پہنچ جائے۔ مگر زر کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش میں تکلیف دہ حد کی سود کی شرح معیشت کو بری طرح سے اپانچ کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ قرض خواہوں کا کاروبار بھی تباہ ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بے روزگاری اور کاروباری دیوالیہ پن کی شرح بڑھنے سے روزمرہ کے استعمال اور سرمایہ کاری والی اشیاء کی طلب کم ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں کاروبار کا فطری رد عمل اپنے نفع کو کم کرنا ہوتا ہے جس سے قیمتوں میں کمی آتی ہے۔ اور زری ماہر (Monetarists) کہہ اٹھتے ہیں ہو گیا نا قیمتوں کا علاج! جواباً نقاد پوچھتے ہیں مگر کس قیمت پر؟

لمبے عرصے تک سود کی شرح والی دوا کی عادت کے نتیجہ میں کاروباری ماحول میں غیر ضروری طور پر غیر یقینی صورت حال پیدا ہوتی ہے جس سے طویل المیعاد منصوبہ بندی مشکل ہو جاتی ہے اور اس پر اعتماد کمزور پڑ جاتا ہے۔ سرمایہ کاری کے منصوبوں پر برا اثر پڑنے کی وجہ سے ایسی فضا میں مصنوعات کی کوالٹی گر جاتی ہے۔ پھر جب حالات میں بہتری آتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت قیمت اور کوالٹی میں نجی مصنوعات غیر ملکی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر پائیں۔ فنانشل ٹائمز کے 30 جون 1993ء کے شمارے میں کرپچن ٹاکر (Chirstian Tyler) رابرٹ بسکاف (Robert Bischof) کے نظریات بیان کرتا ہے جو چانسلر کوہل (Chancellor Kohl) کے ان 100 منیجروں میں سے ایک ہے جن کو مشرقی جرمنی کی صنعت میں نئی روح پھونکنے کے لئے مامور کیا گیا تھا:

’بسکاف کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ برطانیہ کی خوشحال مارکیٹ میں داخل ہونے والی غیر ملکی کمپنی کے لئے ملکی مزاحمت کو تار تار کرنا کتنا آسان ہے۔ جرمنی کے صدر "Richard Von Weigsacker" کے ساتھ بسکاف کو اتفاق ہے کہ معیشت کی کامیابی یا ناکامی کو لوگ نہیں بلکہ نظام متعین کرتا ہے۔ کیونکہ کے تحت آپ کام کر کے مر بھی جائیں آپ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے اور برطانیہ میں بھی ایسے ہی ہے۔..... معاشرے کے تانے بانے، وسائل سرمایہ اور ہر چیز کو یہ اتار چڑھاؤ تباہ کر رہے ہیں۔..... مثلاً وہ کہتا ہے کہ چانسلر بلتھوئی باربر (Anthony Barber) اور چانسلر نائیگل لاسن (Nigel Lawson) کو جرمنی کی برآمدات کی خدمات کے صلہ میں آئرن کر اس ملنا چاہیے۔ چونکہ جنگ کے بعد کے زمانہ میں دو بڑی مصنوعی خوش حالیوں انجی کی وجہ سے آئیں۔“

سود کی شرح اور زر کی رسد کی نمو کے درمیان تعلق کے متعلق ایک طرفہ مفروضات پر برائے

ریڈنگ (Brian Reading) یوں تنقید کرتا ہے:

”کوئی بھی قومی حکومت جو زر کو مہنگا کر کے اسے محدود کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ نتائج کو اس کے بالکل برعکس پاتی ہے۔ سود کی بڑھی ہوئی شرح بیرون ملکوں سے زر کھینچ لاتی ہے جس کی وجہ سے مہنگے زر میں قلت کے بجائے کثرت ہو جاتی ہے۔ سود کی بڑھی ہوئی شرح زر کی رسد کی نمو کو تیز کرتی ہے اور افراط زر پیدا کرتی ہے۔ کم شرح رسد کو کم کرتی ہے اور تفریط کا باعث ہے۔ سود کی شرح زیادہ برقرار رکھنے سے برطانیہ کی زر کی رسد کم نہیں ہوئی۔ بینک اور بلڈنگ سوسائٹی کے قرضے پچھلے بارہ ماہ میں تقریباً 70 فیصد بڑھے۔ رہن (Mortgage) پر قرضے اب سے پہلے ملتی آسانی سے کبھی نہ ملتے تھے۔ بچنے پر اپنی مارکیٹ میں تیزی خصوصاً بیرون لندن مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ سود کی شرح یکدم کم کرنے کے لئے دلیرانہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اتنا نیچے آ جائے کہ مزید کم نہ ہو سکے۔ مگر زر بہت زیادہ سستا کر دینا اسے عجیب و غریب طریقہ سے اتنا تباہ بنا دیتا ہے کہ زیادہ قرضوں کی نمو جو اس وقت افراط زر پیدا کر رہی ہے رک جاتی ہے۔ بہت کم سود کی شرح سے ان قرضوں کی نمو پر شدید زبرد پڑتی ہے جو مالیاتی قیاس آرائی کے لئے لئے جاتے ہیں جب کہ پیداوار والی سرمایہ کاری کے لئے رسد بڑھ جاتی ہے۔ صنعت اپنے حریفوں کو مات کرنے کے لئے اچھی مشینیں اور سامان زیادہ خرید سکتی ہے۔“

(Sunday Times, London, 22 May, 1988)

ریڈنگ کہتا ہے کہ 1980ء کی دہائی کے دوران برطانیہ میں وسیع تر مجموعی زر کی نمو کی وجہ سے سرمایہ کاری نے جائیداد میں تیزی (Property Boom) پیدا کی جو دہائی کے آخری حصہ میں انتہا پر تھی۔ (ہم کہہ سکتے ہیں کہ جائیداد میں تیزی مجموعی زر کی نمو کا مظہر ہے) کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ گھریلو اخراجات میں بڑا خرچہ گھر خریدنے کا ہوتا ہے اس لئے اسے افراط زر کے اعداد و شمار کا حساب لگانے میں سب سے پہلے نمبر پر رکھنا چاہیے۔ مگر مکان کی قیمت کو شامل کرنے کے خلاف روایتی دلیل یہ ہے کہ مکان کے لئے سرمایہ کاری کی قیمت بالفاظ دیگر نجی گھرانے کے لئے رہن کے قرضہ کا سود، مکان کی قیمت کا بہتر مظہر ہے۔ اب اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو ہمارے پاس زیادہ سود کی شرح کی وجہ سے افراط زر میں اضافہ کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔

رہن والے گھرانے کی زندگی کے اخراجات پر سود کی زیادہ شرح کے اثر کو بھانپ کر 1988ء میں خزانے کے چانسلر لاسن نائیکل (Lawson Nigel) نے کہا کہ افراط زر کے اعداد و شمار سے رہن پر لئے گئے قرض پر سود کی ادائیگیوں کو بھی نکال دینا چاہیے۔ یہ شماریاتی تبدیلی افراط زر کی ایسی شماریات پیش کر دیتی جن میں نہ تو پرائیویٹ مکانوں کے خریدنے کی اصل قیمت شامل ہوتی اور نہ ہی اس سرمایہ کاری

کے اوپر ادا کی گئی قیمت شامل ہوتی۔ لاسن کی تجاویز کو برطانیہ میں ماہانہ افراط زر کی شماریات کا ایک علیحدہ مجموعہ سمجھا گیا اور پرانی شماریات کو ویسے ہی رکھا گیا۔ تاہم اب بھی برطانیہ کے صارف کو مختلف قسم کے افراط زر کی بڑی بڑی شماریات پیش کرتے وقت رہائشی جائیداد کی قیمتوں میں تبدیلی اور درحقیقت دوسرے اثاثوں کی قیمتوں میں تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

1980ء کی دہائی میں برطانیہ کے اندر جائیداد کی تیزی کے دوران بینک کے مرہونہ قرضوں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ خصوصاً مکانوں کے مالکان کو ترغیب دی گئی کہ وہ اپنی جائیداد پر ذاتی قرض حاصل کر کے اپنے مکانوں کی ایکویٹی (Equity) والی پابندی ہٹائیں۔ اس شیطانی چکر کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے جہاں زر کی تخلیق اثاثوں کی قیمتوں میں اضافہ کرتی ہے اور مزید تخلیق زر کی ترغیب دیتی ہے۔ اس سے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ پابندی ہٹانے سے اس طرح جو نیا زر نکلا اس کو قرض خواہ صرفی اشیاء (Consumer Goods) کی خریداری پر خرچ کر دیتے تھے۔ اگرچہ صرفی اشیاء کی قیمتوں کو افراط زر کی بڑی بڑی شماریات میں شامل کر لیا جاتا تھا اور رہن کے سود کی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف صارف کی نئی طلب بڑھی بلکہ صرفی اشیاء کی قیمتوں کے ساتھ ساتھ درآمدات میں بھی خاصا اضافہ شروع ہو گیا۔

1988ء کے وسط تک ارباب اختیار کی نظر میں سود کی شرح والی دوا ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ اس لائحہ عمل کے خلاف وکالت کرتے ہوئے ”Citicorp Serimgeour Vickers“ کا چیف اکاؤنٹنٹ جارج ہاجسن (George Hodgson) لکھتا ہے:

”درحقیقت تجارتی اکاؤنٹ کے مسئلے کا ایک طویل المدت حل یہ ہے کہ معیشت کی سہولتی والی طرف کو ترقی دی جائے۔ کمپنیوں کے اصل زر کے استعمال میں بڑا اضافہ ایسی ترقی کی نشانی ہوگی۔ اس کو نقصان پہنچانے کا اگر کوئی یقینی طریقہ ہے تو وہ سود کی شرح کو جارحانہ طریقہ سے بڑھانا ہے۔“

(”The Times,” London, 11 July 1988)

سود کی شرح بڑھانے کے زر کی رسد کو محدود کرنے کی دہائی میں ہاجسن کے نظریہ کی پرواہ نہ کی گئی۔ 1988ء کے آخر تک قرضوں پر سود کی بنیادی سطح پچھلے سال کے مقابلہ میں 4.5 فیصد زیادہ تھی۔ زری ماہرین کے مطابق تو زر جتنا زیادہ مہنگا ہوگا اتنا ہی زر کی رسد کی نمو اور اس وجہ سے افراط زر محدود ہوگی

مگر 12 ماہ میں جنوری 1990ء تک تو M_4 میں تقریباً 19 فیصد اضافہ ہوا۔ اسی طرح زری ماہرین نے کہا کہ سود کی زیادہ شرح سٹرلنگ کو مضبوط کرے گی جس سے افراط زر مزید محدود ہوگی مگر اپریل 1990ء تک 18 ماہ میں تو تجارتی پیمانوں کی بنیاد پر فارن ایکسچینج میں کرنسی کی قدر میں 10 فیصد کمی واقع ہوئی۔ دریں اثناء جون 1988ء سے ستمبر 1990ء تک کے افراط زر کی شرح 4.6 فیصد سے 10.9 فیصد ہو گئی۔

زری ماہرین کہتے ہیں کہ ان کی تجویز کردہ پالیسی اپنے اثرات دکھانے کے لئے وقت چاہتی ہے۔ بے شک وہ درست کہتے ہیں مگر انتہائی مندی (Recession) بھی تو عارضی طور پر افراط زر کو محدود کر دیتی ہے۔ عنقریب دلائل پیش کئے جائیں گے کہ اگر ہم اپنے زری ڈھانچے کے نقائص دور کر لیں تو سود کی شرح کی دوبالکل غیر ضروری ہے۔ اگر ڈھانچے کو ویسے ہی رہنے دیا جائے تب بھی زری ماہرین کے نزدیک افراط زر کو کم کرنے کے بیان کردہ اسباب کی کڑیاں بحث طلب ہیں۔ مثال کے طور پر بینک آف انگلینڈ کا اپنا تجزیہ کم از کم اس دعویٰ کی توثیق تو کرتا ہے۔ برائن ریڈنگ (Brian Reading) لکھتا ہے:

”بینک کا حسابی عمل بتاتا ہے کہ اگر سٹرلنگ کی قدر میں زیادتی نہ ہو تو ایک فیصد کا سود کی شرح میں اضافہ پر چون کی قیمتوں کے اشاریہ کو دو سال بعد 0.2 فیصد زیادہ کر دیتا ہے اور تین سال بعد غیر متبدل..... سود کی زیادہ شرح کم عرصے کے اندر معیشت میں افراط زر کو کم تو بالکل نہیں کرتی مگر لمبے عرصے بعد سپلائی والی طرف نقصان پہنچا کر افراط زر میں اضافہ کر دیتی ہے۔“

("Sunday Times", London, 27 May 1990)

پھر ریڈنگ کہتا ہے کہ سود کی زیادہ شرح غیر ملکی سرمایہ کاروں سے کرنسی کھینچ لاتی ہے جس کی وجہ سے تازہ زر (Hot Money) کا بہاؤ ملک کی طرف ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں دائن تو چاہے گا کہ اس سے قرض لیا جائے مگر یہ تو قرض خواہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے تئیں ضبط کرے:

”جب سود کی شرح اتنی زیادہ بڑھ جائے کہ ہمارے لئے قرض لینے کی ہمت ہی نہ رہے تب ہی قرض کی نمویں کمی واقع ہوگی۔“

ول ہٹن (Will Hutton) کہتا ہے:

”..... کثرت سے ثبوت مل بھی گئے کہ افراط زر کو کم کرنے کی کامیابی کا زر کے اہداف سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی گورنمنٹ اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ زری استحکام افراط زر میں کمی کا باعث تھا۔ درحقیقت قیمتوں میں استحکام کے اسباب کے سلسلے کی کڑیاں معاشی قوت سے شروع ہوتی ہیں مگر گورنمنٹ چونکہ اقتصادی متغیرات (Financial Variables) اور آزاد مارکیٹ کی معیشت (Free Market Economy) پر اڑی ہوئی تھی اس لئے اس کا یقین تھا کہ اسباب کے سلسلے کی کڑیاں مخالف سمت میں چلتی ہیں۔“

("The State We're In", 1994, P. 74)

باری رائی 21 (Barry Riley) اگست 1993ء کے فنانشل ٹائمز کے شمارہ میں دلائل دیتا ہے:

”معمد یہ ہے کہ ادھر جرمنی تو سود کی شرح بڑھا کر زر کی نمو کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں ہے ادھر امریکہ میں کم سود کی شرح کے باعث غیر معمولی زر کی کمزوری کا دور ہے۔ اس کا جواب وقت کی دیر میں ہے۔ جب تک معیشت کمزور نہیں پڑ جاتی اور قرضوں کی طلب بالکل ہی بیٹھ نہیں جاتی۔ سود کی زیادہ شرح کا قلیل المدت نتیجہ بینکوں میں ڈپازٹ کا بڑھنا ہے اور سود کی کم شرح کا قلیل المدت نتیجہ بینکوں سے بچتوں کا غائب ہونا اور اس طرح زر کا سکڑاؤ ہے جب تک کہ آخر کار سستا زر لینے کے لئے لوگ بڑی تعداد میں پھر قرض لینا شروع نہیں کر دیتے اور اس طرح معیشت کے پھیلاؤ میں پھر تیزی نہیں آ جاتی۔

چنانچہ کچھ بنیادی نظریات چیلنج ہو رہے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب غیر واضح ہیں۔ کیا سود کی شرح بڑھانے سے افراط زر کم ہوتی ہے یا بڑھتی ہے؟ زر کی ایک ہی پالیسی اپنانے سے اگر ایک وقت میں زر کی رسد بڑھتی ہے تو دوسرے وقت میں کم کیوں ہوتی ہے؟ افراط زر کا علاج معیشت کی مضبوطی میں ہے یا کمزوری میں؟

ان سوالات کا صحیح جواب تو صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ جدید زر (Modern Money) نفع حاصل کرنے کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے۔ لیکن ارباب اختیار موجودہ زر کی ڈھانچے کی ضروری جراحی کرنے کے بجائے سب سے پہلے سود کی شرح کی کمی بیشی کی دوا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ 1990ء میں جان میجر (John Major) نے خزانہ کے چانسلر کی حیثیت سے سود کی زیادہ شرح کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ تب ہی فائدہ پہنچائے گی جب یہ تکلیف دی ہوگی۔ مگر ایسے خیالات کا اظہار تو کوئی نیم حکیم (Quack) ہی کر سکتا ہے کیونکہ ایسا دو ٹوک آلہ کار کام اگر کرے گا بھی تو بنیادی طور پر مندی اور دیوالیہ پن کے ذریعے ہی سے کرے گا۔

100 فیصد کا حل

(The 100% Solution)

زر کی پالیسیوں سے پیدا کردہ یکے بعد دیگرے افراط اور تفریط زر کے سلسلہ وار ادوار کے باوجود سودی نظام پر مبنی معیشتوں نے ابھی تک جزوی زر محفوظ کی بینکاری (Fractal Reserve Banking) سے پیدا شدہ مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اس مسئلہ کو مزید بڑھایا ہے۔ جیسا کہ یہ صورت حال تین صدیوں سے برطانیہ میں چل رہی ہے لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ حکومت

بینکاروں کے ہاتھ میں کٹہ پتلی بنی ہوئی ہے۔ اسی لئے ہر پود میں لوگوں کا ایک نیا گروہ بینکاروں کے خلاف کھڑا ہوتا رہا ہے۔ لیکن جیت ہمیشہ بینکاروں کی رہی ہے۔

اگر ایک غیر پیشہ ور پرچہ نویس کو قرضوں کی غلامی والی چال کی سمجھ آ جائے اور وہ ایسے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو کر تنقید شروع کر دے تو لوگ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیں گے۔ حتیٰ کہ ایک اچھے بھلے پڑھے لکھے انسان کا بھی یہی حشر ہوگا۔ کیونکہ لوگ زرعی معاشیات پڑھنے پر وقت صرف نہیں کرتے۔ ارونگ فشر (Irving Fisher) نے 1935ء میں اپنی تحریر ”100% Money“ کے اندر جو تجاویز پیش کیں ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس نے کہا تھا کہ 100 فیصد زر محفوظ کی شرح کا نفاذ ہونا چاہیے۔

اپنی کتاب میں فشر بیان کرتا ہے کہ امریکہ کی 1929ء میں زر کی کل رسد 27 ارب ڈالر تھی جس میں 23 ارب ڈالر بینکی زر تھا۔ 1933ء میں زر کی رسد سکڑ کر 20 ارب ڈالر ہو گئی۔ جس میں بینکی زر 15 ارب ڈالر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تجارتی بینکوں نے اپنے قرضے واپس لے کر 8 ارب ڈالر کا زر ختم کر دیا تھا اور سرکار نے اپنی ایک ارب ڈالر کرنسی مزید جاری کر دی تھی۔ وسائل کی کثرت تھی اور کام کرنے والے عام ملتے تھے اور معاشرے کو ان کی ضرورت تھی۔ مگر کاروباری لین دین کے لئے زر کی رسد کم ہونے کی وجہ سے لاکھوں کام کرنے والے بیکار ہی رہے۔

فشر کی کتاب میں فیصلہ کن دلیل یہ ہے کہ پرائیویٹ کمپنیوں کا زر کی صنعتکاری کا استحقاق ختم کر دینا چاہیے اور آئینی قوانین کے ذریعہ یہ کام مکمل طور پر سرکار کو خود کرنا چاہیے۔ اس طرح تخلیق زر کا اختیار صرف سرکار کے پاس ہوگا۔ یہ البتہ اس مفروضے کے تحت ہے کہ پرائیویٹ شعبہ کے مقابلے میں سرکار زر کی رسد کی بہتر سرپرست ہے۔

فشر نے نہ صرف تخلیق زر کا عمل ہی سرکار تک محدود کیا بلکہ اس نے ان حالات کی نشاندہی بھی کی جن کے تحت سرکار زر کی رسد میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ لیکن معاشی کارگزاری میں اگر ضرورت محسوس ہو تو تب ہی ایسی تبدیلی لائی جائے گی۔ فشر کا معاشی کارگزاری میں تبدیلی کا پیمانہ معیشت کے کسی ایک دورانیہ میں عام قیمتوں کے اشاریہ کی تبدیلی پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق ایک کرنسی کمیشن کو اختیار ہونا چاہیے کہ ایسی تبدیلیوں کے مد نظر وہ سرکاری زر کی ضروری مقدار کم و بیش کر سکے۔ آبادی کے اضافہ یا تکنیکی ایجادات

کی وجہ سے معاشی سرگرمی بڑھ جانے پر کاروباری لین دین کے لئے موجود زر کی رسد کم ہو جائے گی۔ اور عام قیمتوں کا اشاریہ روبہ زوال ہوگا۔ اس صورت میں کرنسی کمیشن نیا سرکاری زر جاری کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ جب حالات اس کے برعکس ہوں تو زر کی رسد کم کی جاسکتی ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں عام قیمتوں کا اشاریہ ہی ایک پیمانہ ہوگا جس سے زر کی رسد میں تبدیلی کی ضرورت معلوم ہو سکے۔

فشر کے بیان کے مطابق بینکاری کا جو ڈھانچہ سامنے آتا ہے اس میں بنیادی طور پر دو قسم کے کھاتے (Account) ہوں گے۔ ایک غیر سودی جاری کھاتہ (Current Account) ہوگا جس میں تجارتی بینک 100 فیصد زیر محفوظ رکھے گا اور یہ سرمائے فوری طور پر عند الطلب نکلوائے جاسکیں گے۔ یہ کھاتہ اس بنیاد پر قائم ہوگا کہ چونکہ اس کے سرمائے فوری طور پر نکلوانے کے لئے ہر وقت موجود رہنے چاہیں اس لئے وہ کسی کاروبار کے لئے سرکاری یا نجی قرض پر نہیں دیئے جاسکیں گے۔ چونکہ جاری کھاتے کے سرمائے قرض دینے کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے اس لئے ان پر سود ہرگز نہیں کمایا جاسکتا۔ اس قسم کے اکاؤنٹ پر کھاتہ دار سے قدرتی طور پر بینک اپنی خدمات کے عوض کچھ اجرت وصول کرے گا۔ دوسری قسم سرمایہ کاری کا کھاتہ (Investment Account) ہوگا۔ اس قسم کے کھاتہ سے کھاتہ دار اپنی جمع شدہ رقم ایک متفقہ مدت کے اختتام سے پہلے نہیں نکال سکے گا۔ یہ مدت وہ ہوگی جس کے لئے بینک بطور ایک درمیانی واسطہ کے قرض دے گا۔ چونکہ سرمایہ منافع پر قرض دیا جائے گا اس لئے کچھ منافع کھاتہ دار کو بھی واجب الادا ہوگا۔ درمیانی واسطے کا کردار ادا کرنے کی کارروائی کے لئے بینک اپنے اخراجات پر مبنی فیس اور کمیشن وصول کرے گا اور دوسرے بینکوں سے خدمت اور لاگت میں مقابلہ بھی کرے گا۔

اب ان دو قسم کے کھاتوں کے بیان کے بعد ہم جائزہ لیں گے کہ درحقیقت بینکاری کا نظام زر کیا ہے۔ چونکہ سرمایہ کاری کھاتہ میں کھاتہ دار فوری طور پر اپنا سرمایہ نہیں نکلا سکتا اس لئے اس کی اپنی خرید و فروخت کے لئے وہ سرمایہ میسر نہ ہوگا ایسے کھاتہ داروں کا سرمایہ آگے قرض خواہوں کو ملے گا اور انہیں قوت خرید حاصل ہوگی۔ اس لئے سرمایہ کاری کھاتہ زر کی رسد کے پیمانے میں شامل نہیں کئے جاسکتے۔ تمام سرمایہ کاری کھاتوں کا مجموعہ معیشت میں اس زر کے مجموعے کو ظاہر کرے گا جو پہلے سے موجود تھا اور قرض پر دیا گیا۔ اس لئے اسے نئے زر میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس جاری

کھاتے کھاتہ داروں کو فوری قوت خرید مہیا کریں گے اس لئے انہیں زر کی رسد کے پیمانہ میں شامل کرنا ہوگا۔ چونکہ بینک کو ایسے کھاتہ کے لئے 100 فیصد زر محفوظ رکھنے ہوں گے اس لئے ایسے بینکاری کے نظام کے لئے نیاز تخلیق کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

ظاہر ہے کہ آج کل کے موجودہ نظام کے اندر فوری طور پر نقد پذیر و دیعہ اور مدتی و دیعہ (Term Deposit) یعنی مدت کے اندر جکڑے ہوئے سرمائے میں مذکورہ بالا تفریق بہت ہی غیر واضح ہے۔ روایتی بحث کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ معلوم نہیں کہ زر کی رسد میں کیا کچھ شامل ہے۔ موجودہ زرعی نظام کے اندر ایک کھاتہ دار کی سرکاری زر کی مدتی و دیعہ (Term Deposit) اور اس سے تخلیق کردہ مزید رقوم سب کو وسیع تر زر کی رسد کے پیمانے میں شامل کیا جاسکتا ہے خواہ وہ رقوم جاری کھاتہ (Current Account) میں ہوں یا مدتی کھاتہ (Term Account) میں ہوں۔ اس کے برعکس سرکاری زر کو، جو کہ زر کی خود ایک رسد ہے، ایک سے زیادہ مرتبہ رسد میں شمار کرنا ممکن نہیں۔ فشر کہتا ہے:

”.....موجودہ اور نئے نظام میں نمایاں فرق صرف یہ ہے کہ نئے نظام میں کھاتہ کے بجائے بینک سے قابل حصول قرض اور سرمایہ کاری صرف مدتی کھاتہ سے ہوگی۔ حساب لکھنے والوں کی نظر میں تو یہ ایک معمولی سا فرق ہے۔ مگر یہ بنیادی فرق کیونکہ مدتی کھاتہ جن میں چیک لکھنے کا امکان نہیں وہ اس مبادلی واسطہ (Medium of Exchange) کا جزو نہیں بن سکتے جو اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“

(Fisher, I., "100% Moey", 1936, P. 81)

وہ مزید لکھتا ہے۔

”100 فیصد نظام کے تحت بچتوں کو جذب کر کے مدتی ڈیپازٹ صرف اپنی ہی مقدار کے برابر قرضے مہیا کریں گے۔ مگر جاری کھاتے کا طریقہ کار مختلف ہوگا۔ ایسے کھاتے میں جمع شدہ رقم وہیں پڑی رہے گی اور آگے قرض پر نہ دی جاسکے گی۔ اس طرح سے مبادلی واسطہ میں پھیلاؤ نہیں آئے گا بلکہ اس کی تقسیم کی صرف ترتیب مختلف ہو جائے گی۔ قرض صرف بچتوں کے ساتھ بڑھیں گے مگر مبادلی واسطہ کا حجم ویسے کا ویسے رہے گا وہ نہیں بڑھے گا۔ بینک اپنی یا کسی اور کی بچت سے بالکل اسی طرح قرض دے گا جس طرح کوئی اور دیتا ہے۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو سب سے پہلے ابتدائی بینک کرتے رہے ہیں جب تک کہ روشن خیالوں نے نیا طریقہ ان کے ذہن میں نہ ڈالا کہ لوگوں کی رقم آگے قرض پر دے دو پھر ایک طرف تو قرض خواہ بھی وہ رقم استعمال کریں اور دوسری طرف اصل لوگ بھی سمجھتے رہیں کہ وہ بھی وہی رقم استعمال کر سکتے ہیں۔“

(Fisher, I., "100% Moey", 1936, P.81)

فشر کی رائے میں جہاں آئین ضمانت دے وہاں نفع خوردنچی اداروں کی نسبت سرکار زیادہ ذمہ داری

کے ساتھ زر کی رسد میں تبدیلیاں کرے گی۔ زر پالیسی کے روایتی آلات زر (Tradiational Instruments of Monetary Policy) کی ضرورت نہیں رہے گی اور وہ کالعدم ہو جائیں گے۔ مگر زر کو کنٹرول کرنا تو درکنار آج کل تو سرکار کو یہ بھی معلوم نہیں کہ زر ہے ہی کیا جب کہ فشر کا طریقہ کار زر کا صاف طور پر تعین بھی کرتا ہے اور اسے سرکار کے کنٹرول میں بھی لاتا ہے۔ جزوی زر محفوظ کی بینکاری کو ختم کرنے کے لئے فشر کہتا ہے کہ سرکار کو پہلے تو قانون نافذ کرنا چاہئے جس کی رو سے موجود جاری کھاتوں کی رقوم کو مذکورہ بالا مدتی کھاتوں کی رقوم سے علیحدہ کیا جائے اور پھر جاری کھاتوں پر قانوناً 100 فیصد زر محفوظ کا اطلاق ہو۔ اس تبدیلی سے پہلے بینکی زر سرکاری زر سے زیادہ ہوگا اس لئے پہلے سے ہی سرکاری زر وافر مقدار میں تخلیق کر لیا جائے تاکہ تجارتی بینک ضرورت کے مطابق زر محفوظ کی شرح حاصل کر سکیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ تخلیق کردہ نیا زر تجارتی بینکوں تک کیسے پہنچے گا فشر نے ایک بڑا عمدہ حل پیش کیا ہے۔ نئے تخلیق کردہ زر سے سرکار اپنے واجب الادا قرضے ادا کرے گی۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح قومی قرض ابتدا میں بینکی زر کی تخلیق سے پیدا ہوا تھا اب یہ قرض سرکاری زر کی تخلیق سے ادا ہوگا۔ قومی قرض تقریباً بغیر کسی لاگت کے ختم ہو جائے گا۔ نیا تخلیق کردہ سرکاری زر یا تو جاری کھاتوں میں منتقل ہو جائے گا یا ان لوگوں کے مدتی کھاتوں میں چلا جائے گا جنہوں نے اپنے سرکاری بانڈ بیچ دیئے ہوں گے۔ اس طرح نیا قائم شدہ 100 فیصد کا زر محفوظ کا سسٹم کام کرنا شروع کر دے گا۔

| | | |
|----|------------------------------|-----------------|
| 10 | نقد (Cash) | بینک کے اثاثے: |
| 70 | نجی (Private) قرض | |
| 20 | سرکاری قرض | |
| 30 | جاری ودیعہ (Current Deposit) | بینک کے واجبات: |
| 70 | مدتی ودیعہ (Term Deposit) | |
| | فشر کی مجوزہ تبدیلی سے پہلے | |

| | | |
|----|------------------------------|-----------------|
| 30 | نقد (Cash) | بینک کے اثاثے: |
| 70 | نجی (Private) قرض | |
| 30 | جاری ودیعہ (Current Deposit) | بینک کے واجبات: |
| 70 | مدتی ودیعہ (Term Deposit) | |

فشر کی مجوزہ تبدیلی کے بعد

فشر کا مجوزہ 100 فیصد زر محفوظ کا نظام اور موجودہ بینکاری کا نظام جو 100 فیصد زر محفوظ کی شرح کے بجائے تقریباً 0 فیصد زر محفوظ کی شرح کے قریب ہے ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ بے شک اسے نظر انداز کیا جائے یا تنقید کا نشانہ بنایا جائے مگر بہر حال یہ مضبوط نظام ہے۔ فشر کے مجوزہ نظام کی طرف تبدیلی سے پہلے کھاتہ دار جتنی رقم کے مالک تھے اس رقم میں سے کچھ بھی ضائع نہیں ہوگا۔ سرکاری قرضوں کے مالکان کو ان کے قرضوں کے عوض جائز بازاری قیمت (Fair Market Price) مل جائے گی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس تبدیلی کے نتیجہ میں کوئی افراط زر پیدا نہ ہوگا۔ چونکہ نیا تخلیق کردہ سرکاری زر تبدیلی کے پہلے سے موجود بینکی زر کی جگہ لے لے گا زر کی رسد میں کوئی پھیلاؤ نہیں آئے گا صرف اس کی ترکیب بد لے گی۔

فشر کی زرکاری (Monetisation) میں ہمیں ایسا حل ملتا ہے جو پچھلی غلطیوں کی نشاندہی اور ان کا ازالہ کرتا ہے۔ جس کے نتائج مستقبل کی معاشی کارکردگی کے لئے فائدہ مند ہوں گے۔ بیشتر مشہور مغربی مصنفین میں سے جیفرسن (Jefferson)، فرینکلن (Franklin)، کو بیٹ (Cobbett)، نائٹ (Knight)، سوڈی (Soddy)، ٹوبن (Tobin)، سائمن (Simon) اور ہائیک (Hayek) وغیرہ نے بھی اسی طرف کے دلائل دیئے ہیں۔



کرنسی کا کھیل (The Currency Game)

غیر ملکی کرنسی کی جدید مارکیٹ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے خاص کر توجہ اُن ذرائع پر مرکوز کی گئی ہے جن سے اس پر مرکزی بینک اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذہبی معیار (Gold Standard) کے زمانہ اور برٹین وڈز (Brettonwoods) کے معاہدہ کے حوالے سے معاشی کارگزاری پہ ان مختلف ذرائع کی اثر اندازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زر کے نظام کے لئے سرکاری اور بینکی زر کے مقابلہ میں قیمتی دھاتوں کو زر کی بہتر بنیاد تجویز کیا گیا ہے۔ یہ بتلایا گیا ہے کہ روایتی بینکر اور ماہرین معاشیات گزشتہ معاشی ناکامیوں کا الزام تو اکثر ذہبی معیار (Gold Standard) کے سر پر ڈالتے ہیں جبکہ درحقیقت یہ ناکامیاں جزوی زر محفوظ کی بینکاری کا نتیجہ تھیں۔

خالص ذہبی معیار

(A True Gold Standard)

اب تک کے دلائل کے تحت پیش کردہ تجویز کے مطابق زر تخلیق کرنے کا کلی اختیار سرکار کے پاس ہونا چاہیے۔ اب ہمیں یہ سوال کرنا ہے کہ کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جس سے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ سرکار اپنے اختیار کا ناجائز استعمال نہیں کرے گی۔ زر کا ایسا نظام جس میں سرکار کو زر کی رسد پر مکمل اختیار ہو زر کے استحکام کی ضمانت دینے کے لئے ناکافی ہے۔ ہمیں ایک ایسے طریقہ کا تعین کرنا ہے جس سے سرکار کو صرف اس کے اپنے سیاسی یا معاشی فائدے حاصل کر لینے کے لئے زر میں کمی بیشی کرنے سے روکا جاسکے۔

ستمبر 1992ء میں سٹرلنگ کے یورپی مبادلی شرح کے طریقہ کار کی ترکیب (European Exchange Rate Mechanism) سے نکل جانے کے بعد اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ لالچی لوگ جو مالی قیاس آرائیاں کرتے ہیں ان کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے مسائل ناقص سرکاری وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہا گیا کہ اگر صرف سرکاری صحیح معاشی پالیسی پر گامزن ہو تو مسائل بالکل پیدا ہی نہ ہوں۔ اس وقت کے وزیر اعظم پتھ (Heath) نے بظاہر جو سادہ ترین علاج پیش کیا وہ یہ تھا کہ سرے سے غیر ملکی زر مبادلہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر زر مبادلہ کی مارکیٹ میں کچھ لوگوں نے اس تجویز کی مزاحمت کی بھی تو کم از کم کارکردگی بڑھانے کا مقصد پھر بھی ”صرف ایک کرنسی“ تو پورا کر ہی دے گی۔ ”صرف ایک کرنسی“ رکھنے سے سرے سے کوئی مبادلی شرح ہی نہ ہوگی، نہ ہی کاروباری کارروائیوں پر کوئی لاگت آئے گی اور نہ ہی وسیع تر معیشت میں قیمتی انسانی وسائل کا ضیاع ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ مجوزہ نئی ”صرف ایک کرنسی“ کیا شکل اختیار کرے گی؟

کوئی بھی نصابی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے زر کی قابل اعتماد شکل کی کچھ نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ کہ زر پائیدار (Durable) ہونا چاہیے۔ آلو بطور زر ایک اچھی چیز نہیں کیونکہ وہ گل سڑ جاتے ہیں۔ زر قابل انتقال (Portable) ہونا چاہیے۔ یعنی آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکے۔ اینٹیں بطور زر مناسب نہیں کیونکہ وہ بھاری ہوتی ہیں اور آپ کے بٹوے میں نہیں آ سکتیں۔ زریکسانیت والا (Homogeneous) ہونا چاہیے۔ بھینسیں بطور زر مناسب نہیں ہو سکتیں کیونکہ سب بھینسیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، کوئی بڑی ہوتی ہے کوئی چھوٹی ہوتی ہے۔ نیز کسی کو آدھی بھینس ادا کرنے کے لئے بھینس کو ذبح کرنا پڑے گا۔ آخری بات یہ کہ زر آسانی سے دستیاب نہ ہو سکے یعنی نایاب (Scarce) ہو۔ اگر ڈالر کے نوٹ درختوں پر اگنے شروع ہو جائیں تو یہ بطور زر استعمال نہیں ہو سکیں گے۔ زر کی ذخیری قدر کے متعلق دلچسپ بات یہ ہے کہ لمبے عرصے کے لئے سونے کا مقابلہ کوئی کرنسی نہیں کر سکتی۔

| سالانہ اوسط تبدیلی | 1990ء | 1900ء | |
|--------------------|-------|-------|---|
| +0.16% | 150 | 130 | قوت خرید کا اشاریہ (Index) بلحاظ سونا |
| -4.06% | 2.4 | 100 | قوت خرید کا اشاریہ (Index) بلحاظ سٹرلنگ |

برطانیہ میں سونے اور علامتی زر کی قوت خرید

(1)-Gold as Store of Value", World Gold Council, Research Study No. 22, November 1998; (2) Economist 1995

ماخذ:

کچھ مصنفین خالص سونے کے حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ سرکار جتنا کاغذی زر جاری کرے اتنی پوری قیمت کا سونا سرکار کی تجویزوں میں جمع رہنا چاہیے۔ جاری شدہ کاغذی زر کی ہر اکائی (Unit) ایک مخصوص شرح کے حساب سے سونے کے ساتھ عند الطلب قابل تبادلہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح اسی شرح کے مطابق سونا بھی کاغذی زر سے قابل تبادلہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ سرکار ایک کرنسی آفس کا انتظام کرے جو کاغذی زر کا سونے سے اور سونے کا کاغذی زر سے تبادلہ کر سکے اور آئین کی رو سے اس بات کی ضمانت ہو کہ سرکار دھوکہ بازی سے کام نہیں لے گی اور اپنے جاری کردہ کاغذی زر کی قدر کے برابر سونے کا پورا ذخیرہ اپنے پاس محفوظ رکھے گی۔ کاغذی زر کی رسد میں پھیلاؤ صرف اسی صورت میں آئے گا جب سرکار کو مزید سونا حاصل ہوتا کہ وہ اتنی قیمت کے مزید کاغذی زر کا اجرا کر سکے۔ کاغذی زر کی رسد میں سکڑاؤ تب ہوگا جب کاغذی زر کے عوض سرکار سے سونا نکلوا لیا جائے۔

مخالفین پوچھتے ہیں کہ معاشرہ اپنے وسائل سونا چاندی کھودنے کے بجائے مثلاً گھروں اور ہسپتالوں وغیرہ کی تعمیر کے لئے استعمال کیوں نہ کرے؟ کیوں نہ سرکار زر کی صنعتکاری کرے اور کاغذی زر وغیرہ جاری کر کے سونے چاندی کو ذخیرہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دے؟ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ معاشرہ پہلے ہی اپنے بے شمار وسائل سودی زر کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ مثلاً ترقی یافتہ معیشتیں اپنے مجموعی نجی پیداوار (GDP) کا دس فیصد تک بینکاری کے شعبہ پر صرف کر رہی ہیں۔ ہیوبر اور رابرٹسن (Huber & Robertson) کے مطابق زر کی صنعتکاری کی خدمات سرانجام دینے کے لئے تجارتی بینکاری کے نظام پر صرف برطانیہ میں ہی تقریباً 21 ارب پونڈ سالانہ

صرف ہو رہے ہیں۔ سونا چاندی کھودنے اور اسے سکوں میں ڈھالنے پر آخر اس سے کم ہی لاگت آئے گی۔ البتہ سونا چاندی کھودنے پر صرف ایک دفعہ ہی سرمایہ خرچ ہوگا جب کہ بینکی زر کو برقرار رکھنے کے لئے تو ہر سال سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

دوسرے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ خالص ذہبی معیار کے تحت کاغذی زر کی مقدار کا تعین سونے کی دو مقداروں کا مجموعہ کرے گا۔ ایک وہ مقدار جو اب تک میں سرکار کے پاس تھی اور دوسری وہ جس کے عوض کرنسی آفس میں نجی کاروباری لوگ کاغذی زر کا تبادلہ کرنے کو تیار ہوں۔ اس طرح سے کیا زر کی رسد پر سرکار اپنا کنٹرول ایک ایسی دھات کے لئے کھو نہیں دے گی جس کی قابل حصول مقدار کے متعلق پیشگی اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے؟ اور اگر اتفاق سے سرکار کو سونے کی ایک بڑی مقدار کہیں سے مل جائے تو ایسی صورت میں صورت حال کیا ہوگی؟ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ قیمتوں میں استحکام اور معیشت کے استحکام کے لئے ضرورت کے مطابق سونا حاصل ہوتا رہے گا؟

مذکورہ بالا دلائل کے کھوکھلے پن سے پردہ اٹھانے کے لئے تقابلی اعداد (Comparison Data) کی مندرجہ ذیل دو عدد جداول ملاحظہ ہوں۔ یہ جداول بتلا رہی ہیں کہ لمبے عرصہ پر محیط M_2 زر کی رسد کی نمو کے مقابلہ میں سونے کی رسد کی نمو کم بھی رہی ہے اور مستحکم بھی۔

پہلی جدول میں امریکی ڈالر کے اعداد و شمار ہیں جبکہ دوسری کرنسیوں کی شرح نمو ڈالر سے بھی زیادہ ہے جس سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ اندیشہ یقیناً اس میں ہے کہ سونے کی نسبت کاغذی اور الیکٹرانک زر (Electronic Money) ضرورت سے زیادہ تخلیق ہوگا۔

1915ء 1950ء 1997ء سالانہ اوسط تبدیلی

| | | | |
|--------|--------|---------|-------|
| 24,000 | 50,000 | 134,800 | 12% |
| 17.59 | 150.81 | 5,392.9 | 7.23% |

پوری دنیا میں سونے کے ذخیرہ کے میزان کا تخمینہ
امریکہ میں زر کی رسد (ارب امریکی ڈالر)

عالمی سونے کے ذخیرہ کی نمو بمقابلہ امریکہ میں M_2 کی نمو

ماخذ: H.C. Wainwright & Co Economics Inc, USA; 2-Report of US Commerce Department 1970; 3- IMF Financial Statistics Yearbook, 1997

دوسری بات یہ کہ سونے میں سرمایہ کاری کرنے والوں کے نفع یا نقصان میں ذہبی معیار والے دورانیہ کے اندر بغیر ذہبی معیار والے دورانیہ کی نسبت کم سرعت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کاغذی زر اور الیکٹرانک زر کی قدر ذہبی معیار کے دورانیہ میں زیادہ مستحکم رہی۔ دوسرے لفظوں میں جزوی زیر محفوظ کی بینکاری کے باوجود سرکار اور بینکوں کی زر کی تخلیقی کارروائیوں پر اس عرصہ کے دوران سونا اعتدالی اثر ڈالتا رہا۔ مندرجہ ذیل جدول یہ بات واضح کرتی ہے۔

| ذہبی معیار (درج شدہ سالوں میں) | ذہبی معیار کے بعد (1968ء-1996ء) |
|--------------------------------|---------------------------------|
| برطانیہ (1968ء-1959ء) 1.1% | 10.8% |
| فرانس (1968ء-1820ء) 2.3% | 10.5% |
| امریکہ (1968ء-1796ء) 2.0% | 10.5% |

سونے کی قیمتوں پر نفع کی سرعت

(خرید کر ذخیرہ کر کے بیچنے کی تمام تر حکمت عملیوں کے مد نظر)

"Gold As A Store of Value World Gold Council, Research Study
No.22, Nov.1998"

ماخذ:

قابل حصول سونے کی ایک بہت بڑی مقدار آسانی سے نہیں مل جاتی۔ اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کے خلاف بھی شاذ و نادر کبھی ہو ہی جاتا ہے پھر بھی عالمی سطح پر یہی قاعدہ کلیہ کارفرما ہے کہ سونے کے حصول کے لئے محنت چاہیے یعنی قیمتی دھاتیں پیدا کرنے کے لئے قیمت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس فی نفسہ کاغذی اور بینکی زر چھاپنے پر عملاً کوئی لاگت خرچ نہیں ہوتی۔

ظاہر ہے سونا نکالنے کی لاگت اس کی حاصل کردہ پیداوار یعنی حاصل کردہ سونے کی قیمت سے زیادہ ہوگی تو سونا بیکار ہوگا۔ مگر جہاں سونا بطور زر استعمال کیا جائے وہاں جب گرتی ہوئی قیمتوں کے وقت کان کنی کرنے والی کمپنیاں دیکھیں گی کہ مزدوری اور ساز و سامان پر کم لاگت کی وجہ سے زیادہ قیمت کا سونا حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ سونا نکالیں گی۔ یہ ہے تجارت کی سادہ ترکیب

جس کے مطابق اس مجوزہ ماڈل یعنی ترکیب کے تحت زر کی رسد بڑھے گی۔ ستارہویں صدی میں زر کے روایتی نظریہ کے مطابق اس ترکیب (Model) کو انگلستان کے اندر ہر کسی نے تسلیم کیا تھا۔ رسیدوں یا بینک کے قرض اور کاغذی زر کی تخلیق کے لئے سود سے اس ترکیب کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ترکیب معاشی انصاف کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے پیچھے آزاد مارکیٹ کی قوت کار فرما ہے۔

نیا حاصل شدہ سارے کا سارا سونا یا اس کا کچھ حصہ بالآخر کاغذی زر کے ساتھ تبادلہ کے لئے سرکاری کرنسی آفس میں پیش کیا جائے گا جہاں قیمتیں تقابلی (Competitive) سطح پر ہوں گی۔ اس طرح سونا نکالنے والا حاصل شدہ سونے کے لیے قوت خرید کی بلند ترین سطح تک پہنچ جائے گا۔ جس ملک میں اشیاء کی قیمتیں سب سے کم ہوں گی، جو خریداروں کی پسند کی پیداوار کا حامل ہوگا اور جہاں سرمایہ کاری کے بہت نفع بخش مواقع ہوں گے وہ کاغذی زر کے ساتھ تبادلہ کے لئے سب سے زیادہ سونا اپنے کرنسی آفس میں کھینچ لے گا۔ اس کے نتیجے میں زر کی رسد کے پھیلاؤ میں بین الاقوامی سطح پر قوت خرید میں عدم توازن کو ختم کرنے کا رجحان ہوگا اور اس طرح سے وہ روزگار اور تجارت کی ترسیل کے لئے قدرتی طور پر استحکام پیدا کرے گا۔

جہاں مستقبل قریب میں سونے کی رسد آنے کا امکان نہ ہو اور معیشت میں مسلسل پھیلاؤ آرہا ہو تو قیمتوں میں کمی کا رجحان ہوگا۔ رابرٹ بارو (Robert Barro) یہی نکتہ بیان کرتا ہے (ملاحظہ ہو باب نمبر 7) مگر دیگر ماہرین معاشیات گرتی ہوئی قیمتوں کے ساتھ ساتھ معیشت کے پھیلاؤ سے متفق نہیں۔ تاہم اس کی ایک قوی مثال انگلستان کی معاشی تاریخ میں 1821ء سے 1941ء کے دوران ملتی ہے۔ اس ذہبی معیار کے زمانہ میں گرتی ہوئی قیمتیں اور معیشت میں پھیلاؤ ساتھ ساتھ واقع ہوئے۔ بینک آف انگلینڈ کا پرچون قیمتوں کا اشاریہ اس دوران 300 سے کم ہو کر تقریباً 200 رہ گیا تھا۔

ذہبی معیار کے مخالفین کہتے ہیں کہ اس سے کسی ایک ملک میں یا مجموعی طور پر کئی ملکوں میں لمبے عرصہ کے لئے مندی (Recession) پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ ملک A میں تجارتی خسارہ پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں کئی غیر ملکی کمپنیاں ملک A کی کرنسی حاصل کر لیتی ہیں۔ بعد میں اگر یہ غیر ملکی کمپنیاں ملک A میں سرمایہ کاری کرتی ہیں یا اس ملک کی اشیاء و خدمات خریدتی ہیں پھر تو ملک

A کرنسی واپس ملک A میں آ کر گردش کرے گی اور وہاں زر میں سکڑاؤ نہیں رہے گا۔ ہاں اگر غیر ملکی کمپنیاں اگر ملک A کی کرنسی کو ملک A سے باہر ہی جمع رکھیں یا اسے ملک A میں سونے کے عوض تبادلے میں استعمال کریں تو ان صورتوں میں زر کی رسد میں سکڑاؤ آئے گا۔

ذہبی معیار کے مخالفین اس بنیاد پر اپنا نظریہ قائم کرتے ہیں کہ زر کا سکڑاؤ پیداوار میں کمی لاتا ہے۔ ان کے دلائل کے مطابق معیشت کی پیداوار میں کمی کا مطلب بے روزگاری اور معیشت میں مندی ہے۔ مگر دوسرے ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ اگر ملک A میں قیمتیں کم ہو جائیں تو غیر ملکی خریداروں اور سونا پیدا کرنے والوں کے لئے ملک A کی اشیاء و خدمات کی قیمتیں نسبتاً زیادہ پرکشش ہوں گی جس کے نتیجے میں اس کی پیداوار کی طلب بڑھ جائے گی اور اس کی پیداوار کی معاشی بحالی کے لئے ایک محرک پیدا ہو جائے گا۔

ان دونوں نظریات میں جو بھی درست ہو یہ بات عیاں ہے کہ ملک کو اشیاء و خدمات اتنی اچھی کوالٹی کی پیدا کرنی چاہئیں جس سے غیر ملکی خریداروں میں کشش پیدا ہو اور ملک میں سونا آنے کا محرک بنے۔ اگر کوالٹی اچھی نہ ہو تو کم قیمتوں سے پیداوار پرکشش نہیں ہوگی۔ دوسرے ملک سے کرنسی یا سونا صرف اسی صورت میں آئے گا اگر ملک A قابل خرید یا قابل سرمایہ کاری اشیاء پیش کرے۔ ہاں اگر مندی کا زمانہ لمبا ہو جائے تو پھر سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ ملک A بیرون ملکی خریداروں اور سرمایہ کاروں کو اپنی طرف لانے کے مواقع مہیا کر سکے گا؟

اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ جو ملک مقابلے کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتا وہ خوشحالی کا لطف جاری رکھنے کی توقع کیسے کر سکتا ہے؟ زر کے نظام میں تحریف کر کے معیشت کی ناکامی کے نتائج کو دور نہیں رکھا جاسکتا۔ عارضی طور پر مجموعی مشکلات کسی طرح نظر انداز کرنے سے حالات مزید خراب ہوں گے جو قوم کے لئے مزید مشکلات پیدا کریں گے۔ کچھ بھی ہو زر کی قلابازیاں ایسی اشیاء و خدمات پیدا نہیں کریں گی جن کو غیر ملکی لوگ خریدنے کی خواہش کریں۔ دیکھا جائے تو کئی لحاظ سے ملک ایک فرم کی طرح ہے۔ اس کی زندگی کا معیار اس کی پیداوار کے معیار پر منحصر ہے۔ ذہبی معیار صرف حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ آخر ملک A کے باشندوں کی صرف محنت اور پیداوار ہی تو استحکام کا

سبب ہیں جن کے انحصار پر وہ اپنی اُمیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔

جہاں سرکار سونے اور کاغذی زر کے آپس میں تبادلے کے لئے ایک متعین شرح کی ضمانت دیتی ہو وہاں صرف سرکاری ضمانت ہی لوگوں کو کاغذی زر کے عوض سونا نکلوانے سے باز رکھنے کے لئے ہی کافی تو ہو سکتی ہے۔ مگر کاغذی زر کے عوض سونا نکلوانے کے سرکاری وعدہ کو کبھی کسی معنی خیز سطح پر آزمایا ہی نہ گیا ہو تو سرکار کو پوشیدہ طور سے اپنے وعدہ پر دھوکہ دہی سے کون روک سکتا ہے؟ اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مستقبل میں کسی وقت سرکار قانون میں تبدیلی کر کے ذہبی معیار کو سرے سے ختم ہی نہ کر دے گی۔

پھر لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے غالباً صرف ایک ہی ضمانت رہ جاتی ہے کہ 100 فیصد ذہبی معیار کو ختم ہی نہ کیا جائے۔ اس ضمانت کا وجود وہاں ہوگا جہاں سونا بذات خود سرکاری زر کی شکل اختیار کرے۔ نہ تو کاغذی زر جاری ہوگا اور نہ ہی سرکاری تجوریوں میں محفوظ شدہ سونے کا کوئی حساب کتاب لکھا جائے گا۔ کم از کم بڑی قیمت کے سکوں کے لئے بذات خود سونا استعمال ہوگا۔ اس قسم کے ذہبی معیار سے لوگوں کے بٹوں میں زر کی حقیقی قدر پر ڈاکہ نہیں ڈالا جاسکے گا۔

اگر اس قسم کا نظام پوری دنیا میں نافذ ہو جائے تو بین الاقوامی کرنسی کی مارکیٹ میں بے حد تبدیلی آئے گی۔ امریکہ کا ایک اونس کا سکہ کسی طرح سے جاپانی، جرمنی یا فرانسیسی ایک اونس کے سکے سے قدر میں مختلف نہیں ہوگا۔ مختلف ملکوں میں ایک اونس سونے کے سکے کے نام مختلف ہو سکتے ہیں، چاہے اسے 20,000 یین (Yen) کہہ لیں یا 200 ڈوئشمارک (Deutschmark) یا 1000 فرینک (Frank)۔ اس طرح کرنسی کا کاروبار ختم ہو جائے گا اور کرنسی کی قدروں میں فرق کی بدولت کاروباری لین دین کے لئے کرنسی کے تبادلے پر جو خرچ ہوتا ہے وہ بھی نہ ہوگا۔ زر مبادلہ سے متعلق قیاس آرائی کا عدم ہو جائے گی۔ بین الاقوامی سرمایہ کاری اور تجارت میں عدم یقینی سے نجات مل جائے گی۔

جوڈی شیلٹن (Judy Shelton) لکھتی ہے:

”جب زر کی قدر میں سرکاری پالیسیوں کے ذریعہ رد و بدل ہو سکے جس کے خلاف زر رکھنے والوں کی کوئی شنوائی نہ ہو تو عام لوگوں کے معاشی فیصلے سیاستدانوں کی انگلیوں کے برغمال ہو جاتے ہیں۔ زر کے کنٹرول کی چمک سرکاری عہدے داروں کو ایسے طریقے

مہیا کرتی ہے جس سے وہ عوام کی قوت خرید میں رد و بدل کر کے سرکاری بجٹ میں زیادتی کر سکیں اور سرکاری قرضے لے سکیں۔“

(Shelton, J., "Money Meltdown", 1994, P. 347)

فلپ کیکن (Phlliph Cagan) کے الفاظ کو نقل کرتے ہوئے شیلٹن (Shelton) اپنی تحریر

"The Search for Stable Money, 1987" میں یوں بیان کرتی ہے:

”سونے کے حامیوں کے موقف سے جو نتیجہ قدرتی طور پر سامنے آتا ہے اس سے فرار ممکن نہیں۔ وہ یہ کہ کافی حد تک صرف قابل

تبادلہ زری نظام ہی ایسا نظام ہے جو قیمتوں میں استحکام کی ضمانت کے لیے کسی کو اختیار دینے سے آزاد ہے۔ اور تا قابل تبادلہ زری

نظام ہی اُس انتظامیہ کو ایسا اختیار دیتا ہے جو زر کے موثر کنٹرول کے باوجود قیمتوں کے استحکام کی ضمانت نہیں دے سکتی۔“

(Shelton, J., "Money Meltdown, 1994, P.301)

افراطی نظام (Inflationary System) میں سیاستدانوں کے لئے آسان ترین کام یہ ہے کہ وہ سرکاری چھاپے خانے کو یہ حکم

دے دیں کہ انہیں ان کے منصوبوں کے لئے جتنا بھی زردرکار ہو مہیا کر دیا جائے۔ مگر ذہنی معیار کے تحت ایک مضبوط حکومت

کے پاس بڑا اچھا موقع ہوتا ہے اور اس کے سرکردہ لیڈر لوگوں کو کہہ سکتے ہیں کہ ہم ٹیکس بڑھانے کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔

(Shelton, J., "Money Meltdown", 1994, P. 343)

سونے کے استعمال سے کوئی حکومت اپنے تجارتی شراکت داروں کے خلاف فائدہ حاصل

کرنے کے لئے زر کی قدر میں کمی نہیں کر سکے گی۔ کسی کاروباری کو شرح مبادلہ کی غیر یقینی کا اندیشہ نہ ہوگا۔

کسی غیر ملکی سرمایہ کاری کے نفع سے نجی کرنسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہر فرد یا کمپنی یا سرکاری شعبہ اندرون

اور بیرون ملک زر کی قدر سے واقف ہوگا اور اس کے مطابق سرمایہ کاری اور قرض کا میزانیہ (Budget)

بنا سکے گا۔ کرنسی کی تقویت کے لئے نجی معیشت میں سود کا ظلم تاریخ کا قصہ بن جائے گا اور ساتھ ہی کرنسی

کی قدر کو آگے پیچھے کرنے کے تمام منصوبے بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور حکومت کے پاس اس کے

تخلیق کردہ زر کے استعمال کے ذریعہ لوگوں کو لوٹنے کا اختیار نہیں رہے گا۔ یہ نظریہ اتنا دلکش ہونے کے

باوجود حیرانی ہوتی ہے کہ کونسے ایسے تاریخی واقعات نمودار ہوئے جن کی وجہ سے سونے کی شہرت

بحیثیت کرنسی ختم ہو گئی۔

برطانیہ میں ذہبی معیار کی تاریخ

(History of the UK Gold Standard)

قرن وسطی کی ابتدا میں چاندی کا پیسہ (Penny) بطور سکے کی ایک اکائی کے پورے یورپ

میں گردش پذیر تھا۔ 12 پیسہ کا ایک شلنگ (Shilling) اور 20 شلنگ کا ایک پونڈ ہوتا تھا۔ اس طرح ایک پونڈ میں 240 پیسے ہوتے تھے۔ 1066ء میں فاتح ولیم (William the Conqueror) کے دور میں ایک پونڈ وزن کی چاندی سے 240 پیسے ڈھالے جاتے تھے۔ مگر 1666ء تک مسلسل ملاوٹ (Debasement) کی وجہ سے چاندی کے پیسے سے تقریباً دو تہائی چاندی کے عنصر کی جگہ کوئی ناقص دھات لے چکی تھی۔ اس طرح ایک پونڈ وزن کی چاندی سے 700 سے کچھ زائد پیسے بنائے جاتے تھے۔

تاہم کرنسی کی اکائی کے لئے پونڈ کا نام باقی رکھا گیا۔ پہلے کبھی اشیاء کے تبادلے میں دھات کی مقدار بتلانے کے لئے پونڈ کا لفظ استعمال ہوتا تھا اب یہ لفظ نظریاتی طور پر قدر کی ایک اکائی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ کافی مرحلوں کے بعد حقیقی قدر سے خالی کاغذ کا ٹکڑا جو پونڈ کہلایا اسی بنیاد پر تخلیق ہوا۔ جہاں پہلے کبھی بائع اور مشتری ایک گھوڑے کا تبادلہ ایک پونڈ وزن کی چاندی کے عوض کیا کرتے تھے تبدیلی کے پہلے مرحلہ میں اب یہ تبادلہ وہ چاندی کے ایسے ٹکڑے کے عوض کرنے لگے جس کا وزن ایک پونڈ نہیں نام ایک پونڈ تھا۔ پھر جلد ہی گھوڑے کا تبادلہ ایک کاغذ کے ٹکڑے کے عوض ہونے لگا جس پر وعدہ لکھا ہوتا تھا کہ اس کاغذ کے عوض ایک چیز جس کو ایک پونڈ کہتے ہیں دی جائے گی۔ چنانچہ زر ایک قرض بن گیا جو پہلے کبھی اثاثہ ہوتا تھا۔ آخر میں تبدیلی بالکل علامتی زرتک آ پہنچی۔ بینک آف انگلینڈ نے کاغذ کے بدلے قیمتی دھات کے سکے ادا کرنے کا وعدہ منسوخ کر دیا اور کاغذی پونڈ ہی لوگوں میں قدر کی نمائندگی کرنے لگا۔ چنانچہ اب جدید کاغذی زرمحض نظریاتی طور پر قدر کی ایک علامتی اکائی ہے۔

مندرجہ بالا پیرا گراف برطانیہ کے زر کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک سادہ سا خلاصہ ہے۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔ اب ہم سونے اور چاندی کے کردار کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سود اور بینک کے تخلیق زر کی جزواں قوتوں نے ان دھاتوں کو ہمارے روزمرہ کے زر سے بدرجہ کیسے باہر نکال پھینکا۔

دوہری دھات یعنی دھاتی جفت (Bimetallism) زر کے اس معیار کا نام ہے جس میں قانونی طور پر دونوں سونا اور چاندی ایک متعین تناسب کے مطابق سرکاری زر کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

قانوناً چاندی کے ایک مخصوص وزن کے سکے کی قدر سونے کے کسی اور مخصوص وزن کے سکے کی قدر کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ پوری معیشت کے اندر سکوں کی آسان شکل اور کافی مقدار میں گہرے عمل کے لئے اسی معیار پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ادنیٰ قدر (Lower Denomination) کے سونے کے سکے بہت ہی چھوٹے سائز اور گھس جانے کی وجہ سے عملی طور پر قابل استعمال نہیں جب کہ اسی قدر کے چاندی کے سکے مقابلتاً کافی بڑے ہونے کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں اس لئے بطور زرِ قانونی استعمال ہو سکتے ہیں۔ ٹکسال میں جمع شدہ سونے کی مقدار نا کافی ہونے کی صورت میں جو مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اس کو بھی یہ نظام حل کر دیتا ہے۔

مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب معاشی گماشتوں کے خیال میں چاندی اور سونے کے سکوں میں دھات کی مقدار کا تناسب مارکیٹ میں دھات کی حقیقی قیمتوں کے مطابق یا تو زیادہ ہو یا کم۔ مثال کے طور پر اگر سرکار قانون نافذ کرے کہ ایک اونس سونے کے سکے کی وہی قدر ہوگی جو پندرہ اونس چاندی کے سکے کی ہے تو اس صورت میں ایک اور پندرہ کا تناسب سونے اور چاندی کا معیار ہوگا۔ وزن کے اعتبار سے سونے کے سکوں کی قدر چاندی کے سکوں سے پندرہ گنا ہوگی۔ فرض کریں ملک میں چاندی کی مزید دریافت ہو جانے سے چاندی کی دھات کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور اس طرح سونے کی دھات کے ایک اونس کی قدر چاندی کی دھات کے سولہ اونس کے برابر ہو جاتی ہے۔ تو اب کاروباری لوگ مندرجہ ذیل راستے پر چل پڑیں گے۔ چاندی کے پندرہ سکوں کے عوض ایک سونے کے سکے کا تبادلہ کر کے اسے گلا کر سونے کی دھات بنادیں گے اور پھر ایک اونس سونے کی دھات کے عوض سولہ اونس چاندی کی دھات کا تبادلہ کریں گے اور اس سولہ اونس چاندی کی دھات کو ٹکسال پر لیجا کر سولہ چاندی کے سکے بنوالیں گے۔ اب جس کے شروع میں پندرہ سکے تھے اس کے پاس سولہ سکے ہو جائیں گے۔ یہ طریقہ کار مسلسل چلتا رہے گا۔ حتیٰ کہ سونے کے سارے کے سارے زیر گردش سکے ختم ہو کر سونے کی دھات بن جائیں گے۔ جہاں دو دھاتی سٹینڈرڈ دو ملکوں میں مختلف ہو تو قیمتوں کے فرق کی مساوات (Arbitrage Equation) کے مطابق قیمتی دھات ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو جائے گی۔

1257ء میں ہنری سوم نے انگلینڈ میں سونے کے سکے گردش کرانے کی کوشش کی جو ناکام ہو گئی۔ کیونکہ دو دھاتی تناسب ایک اور دس کا مقرر کیا گیا تھا جو اس وقت کی مارکیٹ میں دھاتی قدروں کے تناسب سے کم تھا۔ 1279ء میں ایڈورڈ اول نے گول نصف پیسہ (Round Half Penny) اور گول فاردنگ (Round Farthing) کے سکے متعارف کرائے۔ ماضی میں ایسی کم قیمت کے سکے ایک پیسہ کے سکوں کو دو عدد نصف حصوں اور چار عدد چوتھائی حصوں میں کاٹ کر بنائے جاتے تھے۔

دریں اثنا اٹلی میں سونے کے سکوں کا رواج ہو رہا تھا۔ جنوا (Genoa) نے 1252ء میں سونے کے سکے کا اجراء کیا جس کو بعد میں فلارنس (Florence) اور لپا (Lucca) نے چلایا۔ وینس (Venice) نے بازنطینی سکوں پر کچھ عرصہ کے لئے تو انحصار کیا مگر بعد میں طلائی ڈوکیٹ (Ducat) جاری کیا گیا جو سارے بحیرہ روم (Mediterranean) میں قبولیت حاصل کر گیا۔ یہ مشترکہ کرنسی کی ایک مثال ہے جہاں سیاسی اتحاد ضروری نہیں۔ طلائی سکے کے اجراء کی کثرت نے سونے کی طلب میں اضافہ کر دیا جس کے نتیجے میں پورے اٹلی میں طلائی دھات کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ وینس میں دو دھاتی تناسب تیرہویں صدی کے آخر میں ایک اور دس سے بڑھ کر ایک اور چودہ سے بھی زیادہ ہو گیا جو انگلستان میں ہنری سوم کے طلائی سکوں کی ناکامی کا سبب بنا۔ دریں اثنا زر کی جانی پہچانی قابل اعتماد زر کی اکائیوں کا وجود اور سونے کے جمع شدہ ذخیرے اٹلی کے بینکاروں کی فوقیت قائم کر دینے میں مدد ثابت ہوئے۔

زر کے استحکام کے لئے قیمتی دھاتوں کا معیار استعمال کرنے کی مساعی اکثر ناکام ہونے کی وجہ شروع سے ہی سکوں کی حقیقی قدر میں کمی کرنے (Debasement) کا سرکاری دغا ہے۔ حقیقی قدر میں کمی یا تو سکوں کے اندر قیمتی دھات کی مقدار کم کر کے یا سکوں کا وزن کم کر کے کی جاتی تھی یا ان دونوں طریقوں کو ملا کر کی جاتی تھی۔ حقیقی قدر کی کمی کو نافذ کرنے کے لئے موجود سکوں کو غیر زر قانونی کہہ کر واپس لے لیا جاتا اور سرکاری نمسال میں انہیں ڈھال کر زیادہ تعداد میں حقیقی قدر میں کم والے نئے سکے بنائے جاتے تھے۔ تعداد میں جتنے پرانے سکے سرکار واپس لیتی تھی اتنی تعداد میں نئے سکے گردش کے لئے واپس کر دیئے جاتے تھے اور جو زائد سکے بچ جاتے انہیں سرکار اپنے اخراجات کے لئے صرف کرتی تھی۔ ابتدائی دور کی یہ ایک واضح مثال ہے جس میں سرکار اپنی آمدن پیدا کرنے

کے لئے شہریوں کی دولت کو عملاً ضبط کر لیتی تھی۔ (اس کا جدید طریقہ یہ ہے کہ سرکاری کاغذی زر کی مقدار کو بڑھا دیا جاتا ہے جس سے افراط زر کے باعث پہلے سے موجود زر کی قدر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس جدید طریقہ کار کا فائدہ یہ ہے کہ یہ نمایاں طور پر نظر نہیں آتا اور نہ ہی نئے سکے ڈھالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔)

1542ء سے 1551ء کے دورانیہ میں انگلینڈ میں سکوں کی حقیقی قدر کی تخفیف کبیر (Great Debasement) کے باعث چاندی کے پیسے کا ایک تہائی وزن کم ہو گیا اور اس ہلکے وزن کے سکوں میں چاندی کا عنصر اور بھی کم کر دیا گیا۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ نئے سکوں میں صرف ایک چوتھائی وزن کے برابر چاندی رکھی گئی اور باقی تین چوتھائی وزن کا تانبا ڈال دیا گیا۔ جب باہروالی چاندی کی تہہ گھس جاتی تو اندر سے تانبا ظاہر ہو جاتا تھا۔ سکے کا جو حصہ سب سے پہلے گھستا وہ کنگ ہنری کی شبیہ کا ناک والا حصہ ہوتا تھا اور اسی کی وجہ سے کنگ کا بگڑا ہوا نام (Nickname) اولڈ کا پر نوز (Old Copper Nose) پڑ گیا۔ طلائی سکے کی حقیقی قدر میں بھی کمی کی گئی اور اس میں سونے کی ایک تہائی مقدار کم کر دی گئی۔ اس طرح سکوں کی حقیقی قدریں کم کرنے سے دو دھاتی معیار بھی سونے اور چاندی کے ایک اور گیارہ کے تناسب سے گر کر ایک اور پانچ تک رہ گیا۔

ہنری ہفتم کو ہنری ہشتم کے زمانے سے ایک اچھی شہرت والی مضبوط کرنسی ورثہ میں ملی تھی اس نے بار بار چھ مرتبہ سکوں کی حقیقی قدر میں کمی کر کے اور ہر بار نئے سکے جاری کر کے اپنے بیٹے جارج ششم کے لئے ایک بہت ہی ادنیٰ قدر والی کرنسی چھوڑ دی۔ پھر پروٹیکٹر سمرسٹ (Protector Somerset) کے تحت پانچ مرتبہ نئے سکے بنے اور حقیقی قدر میں مزید کمی ہوئی۔ ٹیوڈر (Tudor) کا افراط زر کا زمانہ انہی واقعات کے دوران واقع ہوا جس کے متعلق کسی اور مقام پر بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ جہاں کہیں بھی حقیقی قدر میں کمی ہوگی وہاں گریشم کا قانون (Gresham's Laws) حرکت میں آئے گا یعنی بُرا زر اچھے زر کو باہر نکال پھینکے گا۔ پرانے سکے جن کی حقیقی قدر میں کمی نہیں ہوئی تھی گردش سے غائب ہو جائیں گے۔ وہ برآمدات میں چلے جائیں گے یا ڈھل کر دھات میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس سے زر کے تبادلہ گروں (Money Changer) کو فائدہ ہوگا جن کے ہاتھوں سے بے شمار سکے

گزرتے ہیں۔

1696ء میں سر اسحاق نیوٹن (Sir Isaac Nowton) کی زر کی ترکیب نو نے ملک کو باضابطہ طور پر چاندی کا معیار دیا مگر سونے کو قانوناً دودھاتی تناسب کے تحت زیادہ قدر دینے سے انگلستان میں ادائیگیوں کے لئے طلائی گنیاں (Guineas) زیادہ عام ہوئیں۔ چاندی کو زیادہ قدر دینے کی وجہ سے اس کی برآمد جاری رہی جو اس کی قلت کا سبب بنی۔

اس وقت کے دودھات والے نظریہ کی وجہ سے پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ذہبی معیار کو از سر نو مرتب کیا گیا جو انگلینڈ کے اندر 1821ء میں مکمل طور پر عمل پذیر ہو گیا۔ اس کے تحت چاندی کے صرف 2 پونڈ تک کے سکوں کو زر قانونی (Legal Tender) قرار دیا گیا۔ اس طرح ذیلی طور پر چاندی کا معیار عمل میں آیا چونکہ بڑے سائز کے کاروباری لین دین صرف اور صرف یا تو طلائی ساورین (Sovereign) یا کاغذی زر (جس کی پشت پناہی سونا کرتا تھا) کے ذریعہ ہی ہو سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں سونے کی بنیاد پر زر کے معیار کے ذیل میں چاندی آتی تھی۔ اب کسی بھی سطح پر سونے اور چاندی کے سکوں کا باہمی تبادلہ کر کے قدروں کے فرق سے فائدہ اٹھانا (Arbitrage) ممکن نہ تھا۔

1797ء میں ادائیگیوں کی معطلی (Suspension of Payments) کے قانون کے تحت بینک آف انگلینڈ سے کاغذی نوٹ کے عوض سونا ادا کرنے پر پابندی لگائی گئی تھی جس کے تحت ملک کے اندر کاغذی کرنسی کے عوض سونا ناقابل تبادلہ ہو گیا تھا۔ 1821ء میں سرکاری طور پر ذہبی معیار پھر سے لوٹ آیا۔ لارڈ لورپول (Lord Liverpool) کے 1816ء کے ایکٹ کی شرائط کے تحت ذہبی معیار بتدریج نافذ کیا گیا۔ اس ایکٹ میں ایک ساورین عہدہ قسم کے 113 گرین (Grain) سونے کے برابر مقرر ہوا۔ ساورین 1817ء میں جاری ہوا اور بتدریج گردش پذیر ہوا۔ اپریل 1817ء تک بینک کے نوٹ سونے کے عوض ناقابل تبادلہ رہے۔ اس کے بعد بینک آف انگلینڈ نے 5 پونڈ کے نوٹوں کے عوض سونا ادا کرنے کی پیشکش کی بشرطیکہ وہ 1816ء سے پہلے کے جاری شدہ ہوں۔ چونکہ اس قسم کے نوٹوں کا مجموعہ صرف 10 لاکھ تھا اس لئے نوٹوں کے عوض سونا حاصل کرنے کی طلب زیادہ نہ تھی۔ اکتوبر 1817ء میں بینک نے 1817ء سے پہلے کے تمام نوٹوں کے عوض سونا ادا کرنے کی پیشکش کر دی۔

1821ء میں تمام نوٹ سونے کے عوض قابل تبادلہ ہو گئے اور مکمل ذہبی معیار وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد تمام کا تمام گردش پذیر زر قابل تبادلہ کاغذی نوٹوں، طلائی ساورین اور ذیلی چاندی کے سکوں پر مشتمل رہا۔

برطانیہ کے طریقہ کار نے جو نمونہ (Model) پیدا کیا اس کی دوسرے مقامات اور نوآبادیوں نے نقل کی۔ چنانچہ ذہبی معیار کو پرتگال نے 1854ء میں اپنایا، کینیڈا نے 1867ء میں، جرمنی نے 1873ء میں، آسٹریا، ہنگری نے 1892ء میں اور روس و جاپان نے 1897ء میں اپنایا۔ نیا ذہبی معیار اپنانے سے پیشتر دنیا میں مختلف معیار چلتے تھے۔ مثلاً جرمنی میں چاندی کا معیار چلتا تھا، امریکہ میں دو دھاتی سونے چاندی کا معیار اور روس میں ناقابل تبادلہ کاغذ کی کرنسی چلتی تھی۔

اگر طلائی سکوں کے بغیر ذہبی معیار کے تحت کرنسی کو گردش میں لانا ہو تو جتنی بھی کاغذی کرنسی گردش پذیر ہو اس پوری کرنسی کی پشت پر لازماً سونے کا ذخیرہ ہونا چاہیے۔ اگر سرکار کے لئے زائد کرنسی چھاپنا ذہبی معیار کے قانون کے تحت منع ہو تو تجارتی بینکوں کو بھی اپنے زر کی رسد کو اسی امتناعی قانون کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ جزوی زر محفوظ کی بینکاری کو روکے بغیر ذہبی معیار کا نفاذ بے معنی ہوگا، مگر تاریخی حقیقت یہ ہے جس کو چاؤن (Chown) یوں بیان کرتا ہے:

”ملکی بینکوں کے نوٹ 3-1821ء میں اوسطاً 4 ملین پونڈ سے بڑھ کر 1824ء میں 6 ملین پونڈ اور 1825ء میں 8 ملین پونڈ ہو گئے جو کہ خوشحالی یا گرم بازاری (Boom) پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب تھا۔ اصولاً تو اس بڑھتی ہوئی زر کی گردش کے عوض سونا ہی واجب الادا تھا..... لوگ ملکی بینکوں کے نوٹوں کے عوض بینک آف انگلینڈ کے نوٹ قبول کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور ملکی بینکوں نے بھی سرگرمی کے ساتھ اپنے نوٹوں کے عوض سونا نکھوانے کی حوصلہ شکنی کی۔ مگر جون 1852ء میں برٹل کے بینک کے خلاف ایک مقدمے کی جیت نے سونا طلب کرنے کا حق لوگوں کے دماغ میں ڈال دیا۔“

(J.F.Chown: "A History of Money", 1994, P. 152)

1844ء کے بینک چارٹر ایکٹ نے نجی اداروں سے ان کا اپنا کاغذی زر جاری کرنے کا حق واپس لینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پیلز ایکٹ (Peel's Act) کا مقصد ان خود ساختہ زر قرض دینے والوں کی کارروائیوں کا علاج کرنا تھا جن کو جیفرسن (Jefferson) نے ہدف تنقید بنایا ہوا تھا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ 1844ء کے بعد پیلز ایکٹ میں جو قسم رہ گئے تھے ان کا بینک والوں نے کیسے ناجائز

فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو سونے اور رسیدوں کا نظام زیادہ چلتا تھا انہوں نے اس کے عوض کھاتوں اور چیکوں کا نظام سوچ لیا۔ عرصے سے ذہبی معیار پر مشتمل جزوی زرمحفوظ کی بینکاری کے نظام کے طریقہ کار کا خلاصہ چاروں یوں بیان کرتا ہے:

”برطانیہ کے ذہبی معیار نے قلیل المدت استحکام کی ضمانت نہ دی اور نہ ہی مالی بحرانوں کی آمد و رفت کو روکا۔ یہ طلائی بنیاد پر قائم قرض کے ڈھانچے کے حجم میں اتار چھاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے۔“

(J.F.Chown: "A History of Money", 1994, P. 72)

18-1914ء کی جنگ کے لئے مال کی ضرورت نے پہلی دفعہ برطانوی ذہبی معیار کی کمزوری سے پردہ اٹھایا۔ جنگ سے پہلے ڈالر اور سٹرلنگ کی مبادلی شرح 4.86 تھی جو کہ دونوں ملکوں کے ذہبی معیار سے معلوم کی گئی تھی۔ یعنی چونکہ ایک پونڈ سٹرلنگ (Pound Sterling) 113 گرین وزن کے عمدہ سونے کا اور ڈالر 23.22 گرین عمدہ سونے کا متعین کیا گیا تھا، اس لئے ایک پونڈ کا تبادلہ 4.86 ڈالروں سے ہونا چاہیے تھا۔ $(113/23.22=4.86)$ ۔ اس کے علاوہ کوئی اور مبادلی شرح دونوں کی قدروں میں عدم توازن کی بدولت تبادلہ گروں کے فائدے (Arbitrage) کا سبب بنتی۔

جنگ سے کئی عشرے پیشتر برطانیہ میں سرکاری اخراجات مجموعی داخلی پیداوار "GDP" (Gross Domestic Product) کا 10 فیصد سے 20 فیصد کے درمیان بدلتے رہتے تھے۔ مگر جنگ کے دوران سرکاری اخراجات "GDP" کے تقریباً 70 فیصد تک بڑھ گئے۔ ان اخراجات کو زر مہیا کرنے کے لئے سرکاری قرض کو بڑھانا باب اختیار کے لئے ناقابل مزاحمت ہو گیا اور اس طرح بینک آف انگلینڈ کے لئے نئے کاغذی زر کی تخلیق ضروری ہو گئی۔ 1914ء میں کاغذی زر صرف 34 ملین پونڈ تھا مگر 1918ء میں کاغذی زر کی مجموعی رسد 299 ملین پونڈ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی 1914ء اور 1918ء کے دوران طلائی ساورین گردش سے تیزی سے غائب ہو گئے۔ جنگ کی ابتدا کے وقت 166 ملین پونڈ کے برابر طلائی ساورین کا مجموعہ گردش پذیر تھا مگر جنگ کے اختتام پر یہ مجموعہ 84 ملین پونڈ سے بھی کم رہ گیا۔

بینک آف انگلینڈ کی ساری توقعات پوری نہ ہوئیں۔ جنگ کے دوران سرکار نے اپنا بلا سود زر تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا اور بریڈبری (Bradbury) نوٹوں کا اجراء ہوا (بریڈبری کا نام اس لئے کہ

شعبہ خزانہ میں اس کے دستخط ہوتے تھے) بلاشبہ ان کاغذی نوٹوں کے اجراء سے بینک کے سربراہ ناراض ہوئے جو اپنا کاغذی زر تخلیق کر کے سرکار کو سود پر قرض دینے کی تجویز پیش کرتے تھے۔ ان کی تجویز واضح تجارتی وجوہات کے باعث رد کردی گئی۔

1919ء میں بینک آف انگلینڈ نے 5 پونڈ کے علاوہ تمام کاغذی نوٹوں کا طلائی ساورین کے عوض تبادلہ ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے زر کی صحیح صورت حال واضح کر دی۔ درحقیقت کاغذی زر کا اجراء اس مقدار سے بہت بڑھ گیا تھا جس کی پشت پناہی سونے کے جمع شدہ ذخیرہ سے ہو سکتی تھی۔ بینک آف انگلینڈ چونکہ اس بات سے باخبر تھا کہ اب گردش میں 5 پونڈ کے نوٹ کم ہی رہ گئے ہیں اس لئے مذکورہ فیصلہ کی وجہ سے اب باقی ماندہ طلائی سونے کے ذخیرے کے اخراج کا امکان کم ہو گیا تھا۔

1919ء کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کے نتیجہ میں پونڈ سٹرلنگ اور ڈالر کی مبادلی شرح 3.5 ہو گئی۔ اور برطانیہ نے بھی پونڈ سٹرلنگ کی تقویت کے لئے نیویارک کرنسی مارکیٹ میں کوئی دخل نہ دیا۔ تاہم پونڈ کی مضبوطی کے لئے نجی دباؤ کے نتیجہ میں بینک آف انگلینڈ نے سود کی شرح بڑھا دی۔ زیادہ دباؤ لندن شہر سے اٹھا کیونکہ بین الاقوامی مالیاتی مرکز کے لحاظ سے اس کا مقام سٹرلنگ کی قوت پر منحصر تھا۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لئے سود کی بڑھی ہوئی شرح پر کشش تھی چنانچہ وہ تبادلہ کی مارکیٹ میں سٹرلنگ کو غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کرنے سے رک گئے۔ اس کے بجائے اب زیادہ سود کی شرح کی پیشکش کا فائدہ لینے کے لئے انہوں نے اپنی رقوم سٹرلنگ کھاتوں میں جمع کر دیں۔

یہ ایک ایسی قسم کی پالیسی کی مثال ہے جس سے بین الاقوامی کرنسی کی خاطر نجی کاروباری سرگرمی کو قربان کیا گیا۔ سود کی شرح میں اضافہ جس کا محرک کرنسی ہوا کثر نجی معاشی ماحول کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ سود کی شرح میں اضافے سے اپنے سٹرلنگ کے قرضوں پر آنے والی سود کی ادائیگیاں سرمایہ کاروں کو تو فائدہ پہنچا سکتی ہیں مگر پھر یہ بوجھ ہر قرض دار کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کاروبار میں اگر سرمایہ لگایا گیا ہو تو سود کے بڑھے ہوئے داموں کو ادا کرنے کے لئے کاروباری نفع مندی کا کافی بھی ہو سکتی ہے۔ سٹرلنگ کی پرکشش سود کی شرح کسی شخص کو سٹرلنگ ڈیپازٹ برقرار رکھنے کی ترغیب کا باعث بنے گی اور اسی طرح سٹرلنگ کی مبادلی شرح پر دباؤ کم ہو سکتا ہے۔ سود کے باعث سٹرلنگ جمع رکھنے والے کو

سٹرلنگ کی اور بھی زیادہ رقم بعد میں مل سکے گی۔ سٹرلنگ کے مالک کے لئے بالآخر انتخاب یہ کرنا ہے کہ وہ اسے غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کرے یا اگر ممکن ہو تو سونے میں تبدیل کر لے یا برطانوی اشیاء کی خرید و فروخت کرے یا پھر مزید سٹرلنگ کی سرمایہ کاری کرے۔

برطانوی صنعتکاروں کے لئے اپنا تیار کردہ سامان بیرون ملک بیچنا زیادہ مشکل ہوتا گیا۔ جنگ نے بہت سے کاروباری تعلقات تباہ کر ڈالے تھے اور بیرونی حریفوں کو برطانیہ کے بعض بہت ہی نفع بخش شعبوں میں قدم جمانے کی اجازت فراہم کی تھی۔ مزید برآں جنگ کے دوران غیر جنگی سامان کی پیداوار میں سرمایہ کاری کے فقدان نے برطانوی صنعتکاروں کو ایسا سامان پیدا کرنے کی طرف دھکیل دیا جو یا تو قدیم طرز کا تھا یا 1920ء کی دہائی والی مارکیٹ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ تیار شدہ سامان کی برآمد، جو 1920ء میں 1664 ملین پونڈ تھی، کم ہو کر 1925ء میں 943 ملین پونڈ رہ گئی اور 1930ء میں 670 ملین پونڈ رہ گئی۔ تجارت کا فاضل (Surplus) کرنٹ اکاؤنٹ بیلنس (Current Account Balance) پہلے 1920ء میں ”GDP“ کا 5.8 فیصد تھا جو گر کر 1930ء میں 0.8 فیصد رہ گیا۔ اب سٹرلنگ کے عوض غیر ملکیوں کو حسب ضرورت سامان مہیا کرنے کی کیا امید ہو سکتی تھی؟

سود کی شرح میں اضافہ اکثر اوقات التوائی حکمت عملی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے صرف اس وقت کو گزارنے کی کوشش ہوتی ہے جب کرنسی کی شرح گر رہی ہو یا سونا نکلوا یا جارہا ہو۔ یہ عارضی طور پر چند سالوں کے لئے کام کر سکتی ہے لیکن دریں اثنا اگر معیشت کافی پیداوار پیدا نہ کر سکے تو آخر کار حقیقت واضح ہو کر رہتی ہے۔

برطانیہ نے 1919ء میں ذہبی معیار ترک کر دیا تھا اس وقت تھوک کی قیمتوں نے معیشت کا عدم استحکام پوری طرح واضح کر دیا جو 1919ء اور 1920ء کے درمیان تقریباً 50 فیصد بڑھ گئی تھیں اور بعد میں 1920ء اور 1921ء کے درمیان 40 فیصد کم ہو گئیں۔ 1925ء میں چرچل (Churchill) کو پرانے حالات واپس لانے کی ترغیب دی گئی۔ اس نے بجٹ کی تقریر میں جنگ سے پہلے کے ذہبی معیار کو واپس لانے کا اعلان کر دیا جس کا مطلب تھا کہ پونڈ اور ڈالر کی مبادلی شرح 4.86 ہوگی۔ تاہم یہ ایسا نہیں تھا جیسا کہ بظاہر لگتا تھا کیونکہ تبادلے کی اجازت صرف بین الاقوامی مقاصد کے لئے دی گئی جبکہ

نہی طور پر اس کی اجازت نہیں تھی۔ اجازت صرف یہ تھی کہ تقریباً 1700 پونڈ اکٹھے کر کے ان کے عوض بینک آف انگلینڈ سے 400 اونس کی طلائی اینٹیں حاصل کر لی جائیں۔ چرچل کا نہی تباد لے سے انکار اس حقیقت کا اقرار تھا کہ موجود طلائی ذخیرے مکمل ذہبی معیار واپس لانے کے لئے بہت نا کافی تھے۔

چرچل کی کوششوں کے باوجود معیشت کی حقیقت نے سٹرلنگ کے اعتماد کو اور زوال پذیر کر دیا اور 1929ء اور 1931ء کے درمیان یہ زوال مکمل ناکامی کی شکل اختیار کر گیا۔ غیر ملکی واقعات سے بھی صورت حال میں ابتری ہی آئی۔ آسٹریا کا "Creditanstalt" بینک مئی 1931ء میں مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ اس کے بعد بین الاقوامی سرمایہ کاروں نے سیولت کے لئے دوڑ لگا دی۔ لندن جس نے اپنے آپ کو سیال زر کے مرکز کے طور پر قائم کر رکھا تھا، غیر ملکی کھاتے داروں کے زرنکوانے کا پہلا ہدف بنا جبکہ لندن کے بینک خود ہی سیولت کے بحران کا شکار تھے۔ کیونکہ گزشتہ سالوں میں انہوں نے بڑی بڑی رقوم خاص کر جرمنی اور مرکزی یورپ میں قرض پردے رکھی تھیں۔ اب ان کو پتہ چلا کہ جس رفتار سے غیر ملکی کھاتہ دار اپنا زرنکوار ہے ہیں اس رفتار سے ادائیگیاں ممکن نہیں۔ یہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ جب ایسے ودائع جو قلیل مدت کی پیشگی اطلاع پر نکوانے کے لئے دستیاب ہونے چاہئیں طویل المدت قرض پردے دیئے جائیں تو کیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ بینک آف انگلینڈ ہی تھا جس نے ان کے لئے اپنے سونے اور غیر ملکی کرنسی کے ذخیرے قرض کے لئے مہیا کر کے انہیں بچایا اور اس طرح سے غیر ملکی کھاتہ داروں کی رقوم نکوانے کی درخواست پوری ہو گئی اور لندن کی ساکھ بچ گئی۔

اس سال میکڈانلڈ (MacDonald) کی سربراہی میں تشکیل شدہ قومی حکومت نے متوازن بجٹ بنا کر برطانوی معاشی پالیسی کا اعتماد واپس برقرار کرنے کی کوشش کی مگر اس کا فائدہ صرف عارضی تھا۔ جولائی 1931ء میں زرمبادلہ پر جرمنی کی پالیسی ناکام ہو گئی اور مالی قیاس آرائی کرنے والوں نے اپنی توجہ سٹرلنگ کی طرف موڑ دی۔ اب سونا نکوانے کے لئے سٹرلنگ ودائع کا ایک سیلاب بینک آف انگلینڈ کی طرف چل پڑا۔ غیر ملکیوں کو اپنے سٹرلنگ کی رقوم بینک میں جمع رکھنے کی ترغیب دینے کے لئے اگر سود کی شرح بڑھائی جاتی تو اس سے نازک نہی معیشت تباہ ہو جاتی اس لئے یہ پالیسی قابل قبول نہ سمجھی گئی۔ 19 ستمبر کو بینک آف انگلینڈ کے سونے اور غیر ملکی کرنسی کے ذخیرے ختم ہو گئے۔ 21 ستمبر کو

ذہبی معیار معطل کر دیا گیا۔ اب سٹرلنگ ایک نئی مبادلہ شرح کے لئے آزاد تھا چنانچہ ڈالر اور سٹرلنگ کی مبادلہ شرح تیزی سے گر کر 4.86 سے 3.80 رہ گئی۔

برٹن وڈز اور اس کے بعد (Bretton Woods and After)

چونکہ بینکی زر کی رسد اور سودی قرضوں سے تخلیق کردہ زر ایک ہی چیز کے نام ہیں اس لئے بینکی زر کی رسد کے لئے اتنی ہی مقدار میں قرضوں کا وجود لازمی ہے۔ چنانچہ رائج الوقت سود کی شرح کے مطابق قرضوں اور بینکی زر میں نمو کا رجحان پایا جاتا ہے جو بینکی زر کی رسد کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرہ اگر قرضوں میں مسلسل اضافہ پسند نہ کرے تو پھر کیا ہوگا؟ اور اگر قرضوں کی عدم ادائیگیاں بڑھ جائیں تو پھر کیا ہوگا؟

ہم نے دیکھا کہ اگر نجی قرضوں میں سکڑاؤ آئے تو بینکی زر کی رسد میں بھی سکڑاؤ آتا ہے۔ ان حالات میں زر کے سکڑاؤ کو ختم کرنے کے لئے تقریباً ہمیشہ ہی سرکار خود قرضے لے کر زر میں پھیلاؤ پیدا کرتی ہے۔ اس علت و معلول کے سلسلہ کو مبصرین کم ہی سمجھتے ہیں۔ روایتی دلیل یہ ہے کہ سرکار کا قرض لینا مندی کے دوران بڑھ جاتا ہے چونکہ سرکار کے خرچے اس کی وصولیوں سے زائد ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صاف ظاہر بھی ہے اور درست بھی۔ بے روزگاری کے باعث تحفظ معاشرہ (Social Security) کی ادائیگیاں زیادہ ہو جاتی ہیں جب کہ کم تعداد میں لوگوں کے برسرِ روزگار ہونے سے ٹیکس کی وصولیاں کم ہو جاتی ہیں۔ مگر درحقیقت وجہ یہ ہے کہ جزوی زر محفوظ کی بینکاری کے نظام کے تحت بینک کے دیئے گئے قرض یعنی اس کے اثاثوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا جتنا کہ بینک میں جمع شدہ رقوم یعنی اس کے واجبات پر سودی شرح کی طلب ہوتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سرکار اپنے اخراجات منسوبوں کی خاطر ذہبی معیار کی قربانی دے سکتی ہے۔ ایسی ضروریات مثلاً جنگ وغیرہ کو سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے عوام پر ٹیکس ٹھونسے کے خوف کے مارے سرکار زر کی رسد کا پھیلاؤ عمل میں لاتی ہے جو بیان کئے گئے گزشتہ طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن زر کی رسد میں پھیلاؤ کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے لوگوں کو بہر حال ٹیکس تو ادا

کرنا ہی پڑتا ہے مگر اب یہ افراط زر کے طریقہ کار کے تحت ہوتا ہے۔ نئے سرکاری زر کی گردش کی وجہ سے گزشتہ شرح پر ذہبی معیار کی طرف لوٹنا خارج از امکان ہو جاتا ہے جب تک کہ ارباب اختیار زر کی رسد کو اتنی مقدار میں کم نہ کر دیں جتنی مقدار میں پہلے زیادہ کیا گیا تھا۔ ایسی کمی کے بغیر متوقع معاشی مصائب کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے کیونکہ جلد ہی سرمایہ کار نجی کرنسی کو غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کرنسی کے دفاع کے لئے اب سرکار سود کی شرح بڑھانے پر مجبور ہو جاتی ہے جس کا فائدہ عارضی مگر نجی معیشت کی قیمت پر ہوتا ہے۔

برٹن وڈز کے 1944ء کے معاہدہ کا مقصد بین الاقوامی زرعی نظام میں جزوی زر محفوظ کی بینکاری کے نظام کے بنیادی مسئلے کو حل کئے بغیر دوبارہ استحکام لانا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دنیا کی بڑی بڑی کرنسیوں کے درمیان مبادلی اشراح میں استحکام پیدا ہو۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر امریکہ کو جنگ سے پہلے والی سونے کی 35 ڈالر فی اونس کی قیمت پر پابند ہونا پڑتا تھا جو 1934ء کے ذہبی زر محفوظ کے قانون (Gold Reserve Act) کے تحت متہرک کی گئی تھی۔ یہاں پر پہلے سے موجود سونے کی 20.67 ڈالر فی اونس قیمت کو تبدیل کرنے سے ڈالر کی قدر میں کمی دیکھنے کے قابل ہے۔ معاہدے میں شریک کرنسیوں اور ڈالر کی متفقہ مبادلی اشراح کے نفاذ سے سونے نے بین الاقوامی زر کی رسد میں لنگر کا کام کرنا تھا۔ نظریاتی طور پر اگر امریکہ ہر جاری کردہ ڈالر کی پشت پر پورا پورا سونا جمع رکھتا اور شریک اقوام ڈالر سے مطلوبہ مبادلی شرح برقرار رکھتیں تو مطلوبہ مقصد پورا ہو جاتا۔ مگر جزوی زر محفوظ کی بینکاری کا نظام چلانے والی کوئی بھی سرکار ہر جاری شدہ ڈالر کی پشت پر پورا پورا سونا جمع رکھنے کو برقرار نہ رکھ سکی۔

برٹن وڈز کے معاہدے کے مطابق دونوں بین الاقوامی بینک برائے تعمیر نو و ترقی (International Bank For Reconstruction and Development) یعنی عالمی بینک (World Bank) اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) قائم کئے گئے۔ عالمی بینک کا اصل مقصد بظاہر ترقی پذیر اقوام کو امدادی طور پر کم سودی شرح پر سرمایہ مہیا کرنا تھا۔ دریں اثنا آئی ایم ایف نے ممبر ممالک کے پندرہ سو سے سونے اور غیر ملکی کرنسی (Foreign Currency) کا جمع شدہ ذخیرہ برقرار رکھنا تھا۔ قرض کی درخواست کرنے والے ممالک کو پھر اس ذخیرے سے آئی ایم ایف کی مرضی کے

مطابق قرض ملنا تھا اور ساتھ ساتھ آئی ایم ایف نے اس ذخیرے سے شریک ممالک کے درمیان مبادلی اشراہ کو بھی برقرار رکھنا تھا۔

برٹین وڈز کی کانفرنس میں زیادہ تر کینز (Keynes) کی معلومات کے مطابق آئی ایم ایف کے آئین میں یہ لحاظ رکھا گیا کہ ممالک اپنے نجی معاشی حالات کے مطابق زرعی پالیسی (Monetary Policy) اور مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy) میں تبدیلی کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مبادلی شرح بھی مستحکم رکھی جائے گی جو کہ بین الاقوامی زرعی تعاون کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ دو مقاصد باہمی طور پر نہ کل ہم آہنگ تھے اور نہ ہی آج ہیں۔

حکومتوں کو یہ آزادی نہیں دی جاسکتی کہ وہ زر کی رسد میں پھیلاؤ اور سکڑاؤ بھی پیدا کریں اور ساتھ ساتھ اپنی کرنسی کی بیرون ملک قوت خرید کو بھی برقرار رکھیں۔ اسی تضاد سے بچنے کے لئے ہی تو برٹین وڈز کے تحت نجی طور پر سونے اور کاغذی زر کے تبادلے کو قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس منصوبے میں ایک اور بنیادی سقم شروع سے ہی آ گیا جو ویسا ہی تھا جیسا کہ چرچل کے 1925ء کے ذہبی معیار میں تھا۔ وہ یہ کہ صرف مرکزی بینک ہی امریکہ کے وفاقی تحفظاتی بینک (Federal Reserve Bank) سے ڈالر نکالوانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اگر نجی تبادلہ کی اجازت دی گئی ہوتی تو نجی زر کی رسد میں پھیلاؤ، جو ہم ابھی بیان کریں گے، کا برقرار رہنا جلد ہی ناممکن ہو جاتا۔ مگر تبادلہ کا حق صرف مرکزی بینکوں کو اپنے تک ہی محدود کرنے سے عام افراد اور نجی اداروں کو اپنی جمع شدہ کرنسی کی منصفانہ قدر (Fair Value) طلب کرنے سے روک دیا گیا۔

اس طرح برٹین وڈز کے انتظامات کے تحت زر کی رسد میں ہیر پھیر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا اور اس کی مزید تقویت کی خاطر زر مبادلہ تک رسائی کے لئے عام باشندوں کا سختی سے راشن مقرر کر دیا گیا۔ برطانیہ کے اندر 1931ء میں لگائی گئی ان پابندیوں کا اطلاق 1979ء تک ہوتا رہا۔ 1979ء میں تھچر (Thatcher) حکومت نے ان پابندیوں کو ہٹا دیا۔

صدر کینیڈی کے تحت خسارے کے بجٹ کو سرمایہ بہم پہنچانے کی حوصلہ افزائی ہوئی جس کو بعد میں صدر جانسن نے مزید بڑھایا اور اس سے ویت نام کی جنگ اور مختلف نئے معاشرتی منصوبوں

(Social Programs) کی ادائیگیاں کی گئیں۔ اس پالیسی نے برٹن وڈز کی بنیادی کمزوری آ خرکار آشکار کر دی۔ چنانچہ 1960ء کی دہائی کے درمیان امریکہ اپنے زر کی رسد تیزی سے بڑھا رہا تھا۔ اس کے باوجود ڈالر کا اعتماد برقرار رہا۔ یہ بین الاقوامی کرنسی تھی جو درحقیقت ذخیرہ کرنے کے لئے پہلے نمبر پر تھی مگر اس کے زوال کے خدو خال ابھر چکے تھے۔

مارچ 1968ء کے دوران پہلی مرتبہ اس نظام میں حقیقی شگاف نمودار ہوا جب دو مدارج والی طلائی مارکیٹ قائم کی گئی جس میں مرکزی بینک کے لئے ڈالر میں سونے کی سرکاری قیمت مختلف تھی اور عام لوگوں کے لئے آزاد مارکیٹ میں اس کی قیمت کچھ اور تھی۔ یہ رد عمل تھا جو ڈالر کی قدر کم کرنے کے نتیجہ میں سونے کے اعتبار سے ہوا۔ طلائی دھات کی نجی مارکیٹ (Private Market) میں قیمت 35 ڈالر فی اونس سے کافی زیادہ بڑھ گئی۔

برٹن وڈز کے انتظامات میں ڈالر کو جو اہمیت بطور زر محفوظ کی کرنسی (Reserve Currency) دی گئی تھی اسے ختم کرنے کے لئے 1967ء میں آئی ایم ایف کے سالانہ اجلاس میں سپیشل ڈرائنگ رائٹس (Special Drawing Rights) کی تخلیق ہوئی جو ایس ڈی آر (SDR) کہلائے۔ یہ "SDR" اصلاً تو سونے کی بنیاد پر متعین کئے گئے تھے مگر 1974ء میں بڑی کرنسیوں کا مجموعہ (Basket of Major Currencies) تسلیم کئے گئے۔ 1970ء کے بعد تو وہ مرکزی بینکوں کے درمیان لین دین کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ البتہ امریکہ کے زر کی رسد میں افراط کی وجہ سے ہوا جو کافی سالوں سے پیدا ہو رہی تھی تاہم "SDRs" نے ڈالر کو بطور زر محفوظ کی کرنسی کبھی چیلنج نہیں کیا چونکہ انہیں اصلاً مرکزی بینکوں کے استعمال کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔

رچرڈ نکسن کے 1968ء کے الیکشن سے برٹن وڈز کی داستان کا اختتام ہو گیا۔ نجی معیشت میں حرکت پیدا کرنے کی خواہش کے پیش نظر 1970ء کے دوران نکسن نے وفاقی تحفظاتی بینک پہ دباؤ ڈال کر اسے زر کی رسد میں پھیلاؤ پر مجبور کیا۔ اس سے غیر ملکی سرمایہ کاروں میں ڈالر کی اہمیت اور کم ہوئی۔ ڈالر بڑی حد تک یورپین کرنسیوں میں تبدیل ہونے لگے کیونکہ اب وہ خاصی زیادہ سود کی شرح پیش کر رہی تھیں۔ چونکہ امریکی درآمدات زر کی رسد میں پھیلاؤ کے سبب بڑھ رہی تھیں اس لئے بڑی

مقدار میں ڈالر غیر ملکی ہاتھوں میں جانے لگے۔ بریٹن وڈز کے معاہدہ کے تحت غیر ملکی مرکزی بینک اس بات کے پابند تھے کہ وہ زیر مبادلہ مارکیٹ میں اس طرح آئے ہوئے فاضل ڈالر خرید کر پہلے سے طے شدہ مبادلہ شرح کو برقرار رکھیں گے۔ غیر ملکی مرکزی بینک جو ڈالر خریدنے پر مجبور تھے اکثر اپنی کرنسیوں کی مزید نئی مقدار جاری کر کے ڈالر کی خرید کے لئے ادائیگیاں کرتے تھے اور اس طرح سے وہاں افراط زر درآمد ہوتا تھا۔ بریٹن وڈز کے معاہدہ کے تحت ان ڈالروں کے عوض وفاقی تحفظاتی بینک سے سونا حاصل کرنے کی اجازت تھی مگر ان ڈالروں کے مقابلہ میں جو غیر ملکی مرکزی بینکوں کے پاس تھے امریکہ میں سونے کے ذخیرے بہت ہی کم تھے۔ چنانچہ یہ جان کر کہ ڈالروں کے عوض سونا نکلوانے سے بریٹن وڈز کے انتظامات ناکام ہو جائیں گے۔ غیر ملکی بینکوں نے اپنا ذخیرہ ڈالروں میں ہی رکھا۔

یورو ڈالر مارکیٹ جو بعد میں ابھری اس کی ایک وجہ امریکہ سے باہر تجارتی مقصد کے لئے ڈالر کی جمع شدہ بڑی مقدار کا رد عمل تھا۔ یہ مارکیٹ وفاقی تحفظاتی بینک کے زری ہتھیاروں کی زد سے باہر تھی۔ یورو ڈالر کی اصطلاح کا مطلب امریکہ سے باہر جمع شدہ ڈالر تھا اور یورو کرنسی کا مطلب وہ کرنسی تھی جو اپنے ملک سے باہر جمع شدہ تھی۔ نظریاتی لحاظ سے اگرچہ یہ آسان نظر آئے مگر زری پالیسی پر یورو کرنسی کی مارکیٹ کے اثرات پیچیدہ ہیں۔ ایک ملک کے ارباب اختیار اپنی بینکاری اور ٹیکس کے قوانین دوسرے ملک پر لاگو نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر امریکی زیر محفوظ کے تقاضے لندن کے ان بینکوں پر لاگو نہیں ہو سکتے جو ڈالروں میں ودائع وصول کرتے ہیں۔ دوسری طرف برطانوی زیر محفوظ کے تقاضے بھی ان ڈالروں پر لاگو نہیں ہوتے چونکہ وہ ڈالر برطانیہ کی کرنسی نہیں ہیں۔ اس قانونی خلا کی وجہ سے یورو ڈالر کی جمع شدہ رقم کو بہت بڑے پھیلاؤ کا موقع ملا۔

ودائع جمع کرانے والوں (Depositors) کو مارکیٹ میں ٹیکس سے آزاد نفع ملتا تھا جو نجی ارباب اختیار کی نظروں سے اوجھل تھا۔ کارپوریشنوں کو جلد ہی یورو مارکیٹ کی دلکشی سمجھ میں آ گئی اور وہ طویل المیعاد بانڈ کی شکل میں سرمایہ جمع کرنے لگیں جو بطور یورو بانڈ جاری ہوتے تھے۔ یورو بانڈ جاری ہونے والے ملک کی کرنسی سے مختلف کرنسی میں جاری ہوتے تھے۔ اس طرح سرمایہ کار اپنا نفع خفیہ حاصل کرتے تھے جو ٹیکس سے آزاد تھا اور یہ کشش واضح تھی۔ نتیجتاً نجی کرنسی پر سودی شرح کے

مقابلہ میں عموماً وہ اپنے سرمایہ پر کچھ کم سودی شرح بھی قبول کر لیتے تھے۔ برٹین وڈز سے ذہبی معیار کی اہمیت میں جو کمی کی گئی اگر اس کا مقصد بین الاقوامی زری حالات میں استحکام پیدا کرنا تھا تو یورو ڈالر نے اس پر ایک اور شدید وار کر دیا۔

جنوری 1971ء میں غیر ملکی مرکزی بینکوں کے پاس 20 ارب ڈالر کی رقوم جمع تھیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے لگا کہ کیا اتنی بڑی رقم کے عوض امریکہ سونا دے سکتا تھا؟ مئی 1971ء میں غیر ملکی مرکزی بینکوں کے اندر جمع شدہ رقوم 32 ارب ڈالر تک پہنچ گئیں چونکہ زرمبادلہ کی مارکیٹوں میں بڑی مقدار میں ڈالر جمع ہو رہے تھے۔ اس وقت امریکہ میں سونے کے ذخیرے صرف 10 ارب ڈالر کے برابر تھے۔ عام لوگ تو اپنے وافر مقدار میں ڈالروں کے عوض کافی عرصہ پیشتر ہی سونا نکلوا لیتے مگر اس کے بجائے مرکزی بینکوں نے بین الاقوامی زری نظم کو اپنے ڈالروں کے جمع شدہ ذخیروں پر زیادہ اہمیت دی۔ اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا کہ برٹین وڈز کے نظام کا اصل مقصد کرنسی کے نجی تبادلے کو روکنا تھا۔ مختلف ادارے اپنے فائدے کے لئے تو ڈالر میں زر کی رسد کا پھیلاؤ کرنے کے لئے آزاد تھے جب کہ ان ڈالروں کے عام مالک ان کی طلائی شکل میں منصفانہ قدر پانے کے لئے کہیں بھی رجوع نہیں کر سکتے تھے۔ عام مالکان نے صرف ایک ہی طریقہ، جو ممکن تھا اختیار کیا کہ اپنے ڈالروں کو دوسری کرنسیوں میں تبدیل کر لیا۔

نکسن نے 1971ء میں اعلان کیا کہ امریکہ اب غیر ملکی مرکزی بینکوں کے ڈالروں کو سونے میں تبادلے کی اجازت نہ دے گا۔ اس نے کئی سالوں کے زری پھیلاؤ سے افراط زر کے نتائج کو بھی مختلف طریقوں سے چھپانے کی کوشش کی جن میں اجرتوں اور قیمتوں کا کنٹرول شامل تھا۔

برٹین وڈز کی ناکامی کے بعد دسمبر 1971ء کا سمٹھ سوئین معاہدہ (Smithsonian Agreement) ہوا۔ اس نے بڑی بڑی کرنسیوں کی باہمی مرکزی مبادلی اشراح میں اتار چڑھاؤ کے لئے 2.25 فیصد کی حد مقرر کی اور ساتھ ہی سونے کی قیمت بھی 38 ڈالر فی اونس مقرر کر دی۔ امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ اس قیمت کا دفاع نہیں کرے گا چنانچہ طلائی تعلق بیکار ثابت ہوا۔ سمٹھ سوئین معاہدہ جلد ہی ڈگمگا گیا۔ اگرچہ جون 1972ء میں ڈالر کے مقابلے میں سٹرلنگ کی قدر کم ہوئی اور جنوری 1973ء

میں اٹلی کے لیرا کی قدر گری مگر سوئزر لینڈ کے فرینک اور ڈنمارک کی قدروں میں اضافہ ہوا۔ جونہی کسی کرنسی کی قدر میں ڈالر کے مقابلے میں اضافہ ہوا سرمایہ کاروں نے ایسی دوسری کرنسیوں کی مقررہ مبادلی اشراخ پر اپنے ڈالر بیچ دیئے جو ابھی تک نظام میں موجود تھیں۔ فروری 1973ء میں سونے کی سرکاری قیمت 42 ڈالر فی اونس قرار پائی مگر مارچ میں نجی مارکیٹ کے اندر سونے کی قیمت اس کے دگنے سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ ڈالر پر دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ سمٹھ سوئین معاہدہ اسے برداشت نہ کر پایا اور 12 مارچ 1973ء میں برسل معاہدہ (Brussel Agreement) کے تحت ڈالر کا سونے سے تعلق ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد عالمی متغیر مبادلی اشراخ (Global Floating Exchange Rates) کا دور متعارف ہوا۔ اب بڑی بڑی کرنسیاں نہ تو کسی حقیقی قدر (Intrinsic Value) کے ذخیرے کے ساتھ جکڑی ہوئی تھیں اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ان کا کوئی تعلق تھا۔ کینز اور فریڈمین کے خیالات کے مطابق اس طرح حکومتوں کو اپنے معاشی فائدے کے لئے مالیاتی اور زرعی پالیسیاں مرتب کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ یہ ماہرین معاشیات مؤثر طریقہ سے اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ کرنسی کو بطور معاشی پالیسی کا ہتھیار استعمال کرنے کی خاطر اس کی ذخیری قدر کو قربان کر دینا چاہیے۔ دوسرے مفکرین بھی مبادلی اشراخ میں استحکام پیدا کرنے کے لئے اپنے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ تاہم قوت خرید کی یکسانیت کے بظاہر منطقی خیالات حقیقت کو بیان کرتے نظر نہیں آتے۔ اس کے بجائے مالی قیاس آرائی اور نقد زر (Hot Money) کی ترسیل اس طرف ہوگی جہاں سب سے زیادہ نفع کی شرح حاصل ہو اور کرنسی کا لین دین جو اشیاء و خدمات کی تجارت پر مبنی ہونا چاہیے بہت حد تک کم ہو جائے گا۔ امریکہ میں زر کی رسد کی نمو 1970ء کی دہائی کے آخر تک جاری رہی۔ 1979ء میں سونے کی قیمت 450 ڈالر فی اونس ہو گئی اور امریکہ میں اشیائے صرف کی قیمتیں 13 فیصد سالانہ شرح سے بڑھتی گئیں۔ یہ شرح 1940ء کی دہائی کے بعد سب سے زیادہ تھی۔ 6 اکتوبر 1979ء کو وفاقی تحفظاتی بینک کے نئے چیئر مین پال وولکر (Paul Volker) نے پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی نافذ کر دی۔ افراط زر کو کنٹرول کرنا اس کا ہدف تھا۔ اس کے تحت سودی اشراخ جہاں تک مارکیٹ چاہے جاسکتی تھیں۔

مرکزی بینکوں کے درمیان اس کے بعد ستمبر 1985ء میں پلازا معاہدہ (Plaza Accord) پھر فروری 1987ء میں لوور معاہدہ (Louvre Accord) اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے بھی غیر اعلانیہ معاہدے ہوئے جن کا مقصد بین الاقوامی کرنسی مارکیٹوں کو استحکام مہیا کرنا تھا۔ مگر آج ہمارے زرعی نظام کی پیش رفت کسی طرح بھی استحکام کی طرف نہیں۔ اگر استحکام ہی مقصود ہے تو متغیر مبادلی شرح کا نظام جو حقیقی قدر کے ذخیرہ سے لا تعلق ہو اس کام کے لئے درست ذریعہ نہیں۔

جدید مالیاتی دنیا میں مالی قیاس آرائی کرنے والوں کی کارروائیاں نظام کو خاص طور پر عدم استحکام کا شکار کرتی ہیں۔ اس قسم کے عامل (Agents) کرنسیوں کی لہروں میں ایک چوٹی سے دوسری تک سوار ہونا چاہتے ہیں اور موجودہ کرنسی کی قدر کم ہونے سے پیشتر کسی دوسری کرنسی کی لہر پر چھلانگ لگانا چاہتے ہیں اور درایں اثنا جتنا سود حاصل ہو وصول کر لیتے ہیں۔ کرنسی کا لین دین جو اس طرح سے ہوتا ہے اس کا حقیقی معیشت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سیاستدانوں کی کوششیں اپنی کرنسیوں کے اتار چڑھاؤ پر لگی رہتی ہیں اور وہ زرعی آلات کی اصلاح ہی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک دستہ (Lever) کھینچتے ہیں کبھی دوسرا جب کہ انہیں پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ہر ایک دستہ کیا کام کرتا ہے۔ جو تاجر ہیں ان میں سے کچھ تو بے کسی کے ساتھ یہ مضحکہ خیز حرکتیں بس دیکھتے ہی رہتے ہیں اور دوسرے اس خوشحالی کا انتظار کرتے رہتے ہیں جو الیکشن کے وقت متوقع ہوتی ہے۔

مکمل ذہبی معیار پر مبنی نظام اور خاص کر سونے کے سکے ہی سرکاری من مانی تخلیق زر کو روک سکتے ہیں۔ اسی طرح 100 فیصد زر محفوظ کا تناسب ہی تجارتی بینکوں اور ایسے ہی ودائع وصول کرنے والے دوسرے اداروں کو نجی تخلیق زر سے روکے گا۔ اگر ان کو نافذ کر دیا جائے تو یہ دو پالیسیاں مل کر ان مسائل کا تدارک کر سکتی ہیں جن کی یہاں نشاندہی کی گئی ہے۔ مگر صرف ایک پالیسی کو دوسری کے بغیر اپنایا جائے تو وہ ناکام ہو جائے گی۔ حقیقی خطرہ یہ ہے کہ جب ایک مضبوط زرعی نظام کسی ایسی ناکامی کا الزام اپنے سر لیتا ہے جو مکمل طور پر کسی اور وجہ سے ہو تو ایک نسل کے گزر جانے کے بعد ہی اس مضبوط زرعی نظام کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ میرے (مصنف کے) خیال میں ذہبی معیار نے جزوی زر محفوظ کی بینکاری کا قصور اپنے سر لے لیا جبکہ حقیقت میں جرم جزوی ریزرو بینکاری کا تھا۔

1990ء کی دہائی میں یورپ کے اندر ’صرف ایک کرنسی‘ چلانے کی بحث تو تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اب ہمارے نظریات کو اگر زیر بحث لایا جائے تو بینک والوں کو یقیناً ان تجاویز پر اعتراض ہوں گے۔ موجودہ زرعی اور بینکاری کے ڈھانچے سے جو اس وقت زرعی شکل پیدا ہو چکی ہے اس کا پیشہ وارانہ سطح پر بھی بہت کم علم ہے۔ عام سی غلط فہمیاں اس موضوع کی بحث کو اصل مقصد سے دور لے جاسکتی ہیں اور کبھی کبھی تو قائم شدہ نظام کے لیے معذرت خواہی کی بھرمار میں بنیادی نتیجہ غائب ہی ہو جاتا ہے۔

اگر زر کو وہ کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے جو اسے کرنا چاہیے اور اگر یہ سیاسی اور مالی نفع کے لئے استعمال ہو جس کی قیمت لوگ ادا کریں تو یہ اپنا متوقع کردار بطور فائدہ مند آلہ کے ادا نہیں کر سکتا۔ جب کوئی قوم آج کے معیار زندگی کے لئے آج ہی ادائیگی کے لئے تیار ہو اور آج صرف اتنا قرض لے جو کل ادا ہو سکے اور زر کی چالاکیوں میں نہ جائے تو مستقبل ہر ممکن طور پر بہترین ہوگا۔ زرعی پالیسی کے آلات (Instruments of Monetary Policy) جنہوں نے بیماری کو اکثر طور پر چھپائے رکھا ہے اور مریض کو قریب المرگ کر دیا ہے ان کو ترک کر دینا چاہیے۔ معاشی عدم استحکام کی وجوہات پیدا کرنے والے زرعی عناصر کو ختم کرنا بالکل ممکن ہے۔ معاشی مسائل حقیقی وجوہات سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تجارتی گروہ انہیں پیدا کر دیں یا تجارتی جھگڑوں یا قحط سالی یا جنگ کی وجہ سے پیدا ہو جائیں۔ ہمیں ایسے مسائل کا سامنا تو ہمیشہ کرنا ہوگا مگر سوال یہ ہے ہم ان میں اضافہ کیوں کریں؟



تخلیق دولت اور انتقال دولت

(Wealth Creation and Wealth Transfer)

رولٹ چکر (Roulett Wheel) کا جو وسائل اور انسانی کاوش دونوں کو بروئے کار لاتا ہے اور یہی کام کھیتی باڑی بھی کرتی ہے۔ مگر کھیتی باڑی کرنے والا تو خوراک پیدا کرتا ہے جو ایسی دولت ہے جس سے انسان کی بقا ہے جب کہ جو خانے دولت کو محض ہارنے والوں سے جیتنے والوں تک منتقل کرتے ہیں۔ دولت چونکہ بوسیدہ ہوتی رہتی ہے اس لیے نئی دولت کو مسلسل پیدا ہوتے رہنا چاہیے تاکہ پرانی دولت میں بوسیدگی کے باعث جو کمی آئی ہو اس کمی کو پورا کر سکے۔ اگر انسان صرف انتقال دولت کے کاموں میں ہی مشغول رہے تو اس کی نمو تو درکنار اس کے ذخیرے کی سطح کو برقرار بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے تخلیق دولت انسانی بقا کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس باب میں انتقال دولت کے طریقہ کار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص کر رہن (Collateral) اور قوت قرض یعنی لیوریج (Leverage) جو کردار ادا کرتے ہیں ان پر غور کیا گیا ہے۔ بتلایا گیا ہے کہ یہ تمام طریقے صرف مالی قیاس آرائی (Speculation) میں ہی تیزی پیدا کرتے ہیں جو وسائل کی تقسیم پر مضر اثر ڈالتی ہے۔

جوا یا سرمایہ کاری

(Gambling or Investment)

ہم نے دیکھا کہ ہر قسم کی دولت میں زری قدر نہیں پائی جاتی۔ مثلاً ہوا کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی

جس سے ہم سانس لیتے ہیں۔ اس لئے مختلف قسم کے اعداد و شمار جو کسی قوم کی دولت بیان کرنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں بہت ہی گمراہ کن ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجموعی داخلی پیداوار (Gross Domestic Product) یا "GDP" ایک پیمانہ ہے جو سرکاری ادارے شائع کرتے ہیں جس کا مقصد کسی خاص دورانیے میں اندرون ملک معیشت کی نئی پیدا شدہ دولت کی قدر بتلانا ہے۔ پھر دولت کے جس اصل ذخیرے (Capital Stock) سے مجموعی داخلی پیداوار اخذ کی جاتی ہے اس میں فرسودگی کی وجہ سے قدر کی کمی کا حساب کر کے صافی داخلی پیداوار (Net Domestic Product) یا "NDP" کے اعداد و شمار معلوم کئے جاتے ہیں۔ تاہم دولت میں وہ کمی پیشیاں اکثر حساب میں نہیں آتیں جو خوبصورت مناظر، سماجی استحکام، تعلیم کا معیار وغیرہ جیسی اشیاء کی فرسودگی یا بہتری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ نکتہ کرسٹوفر آرمراڈ (Christopher Ormerod) نے اپنی کتاب "The Death of Economics" جو 1994ء میں شائع ہوئی، کے صفحہ 28 پر یوں بیان کیا ہے:

”مگر بنیادی طور پر کوئی وجہ نہیں کہ مثلاً ماحولیات جیسے دوسرے عوامل کو اہمیت نہ دی جائے اور انہیں قومی حساب کتاب میں شامل نہ کیا جائے جب کہ یہ حقیقت ہے کہ ان میں بہت سے تو ضروری موجود ہوتے ہیں جیسے فضائی آلودگی مگر ان کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح گھریلو کام کو موجودہ رواج میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی جس کے تحت قومی حساب کتاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مختلف روزمرہ کے کام جن کا تعلق کھانا پکانے، صفائی کرنے، کپڑے دھونے، استری کرنے اور بچوں کی نگہداشت سے ہے ان کو سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ قومی معیشت میں قدر کا کوئی اضافہ نہیں کرتے۔“

یہاں جس اضافی قدر (Added Value) کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ مندرجہ ذیل بحث میں بہت اہم ہے۔ جارجیسکو روجن (Georgescu-Roegen) کے نظریہ کے مطابق زندگی میں ہر لطف اندوزی کی ایک قدر و قیمت (Value) ہوتی ہے۔ چنانچہ حال یا مستقبل کی کسی بھی کاروائی کے نتیجے میں لطف اندوزی میں جو اضافہ ہوتا ہے اس اضافی لطف اندوزی کے برابر جو قدر ہوگی وہ اضافی قدر کہلائے گی اور ایسی کاروائی مثبت اضافی قدر (Added Value) والا عمل کہلائے گا۔ جس سے لطف اندوزی میں کوئی اضافہ نہ ہو اس کو صفر اضافی قدر (Zero Value-Added) والا عمل کہیں گے جب کہ ایسا عمل جس سے لطف اندوزی میں کمی واقع ہو وہ تخفیفی قدر (Value-Subtractive) والا عمل

کہلائے گا۔

دولت کی نمو ہمیشہ حسابی نفع (Accounting Profit) کے مطابق ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی حسابی نفع ہمیشہ دولت کی نمو کے مطابق ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کا وجود آپس میں لازم و ملزوم نہیں۔ جیسا کہ آرمراڈ (Ormerod) واضح کرتا ہے گھریلو فرائض سرانجام دے کر گھر کے افراد کوئی حسابی چیز پیدا نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے نجی فرائض کی انجام دہی سے کسی مالی فائدہ کا حساب نہیں لگاتے۔ اس لئے ارباب اختیار جو معاشی کارروائیوں کی پیمائش کے اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں "GDP" کی پیمائش میں ایسے قدری اضافہ کا اندراج نہیں کرتے۔ اس کا علاج یوں ممکن ہے کہ گھریلو کام کی بھی قیمت لگائی جائے جو کبھی وصول نہیں کی جاتی پھر متعلقہ قومی اعداد و شمار میں اسے بھی شامل کیا جائے۔

دولت کی نمو کے ساتھ حسابی نفع کے تعلق کا پتہ لگانے کی کوشش کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ مثال کے طور پر ہم جوا خانے کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں صرف جوئے میں جیتنے والے کو وہ ملتا ہے جو ہارنے والا ہارتا ہے۔ البتہ اس سے جوا خانے کی فیس لے لی جاتی ہے۔ اگرچہ جیتنے والے کی طرح جوا خانے کو چلانے والے کے لئے بھی یہ بہت نفع بخش کام ہے مگر شرکاء کے درمیان دولت کے محض باہمی انتقال کے علاوہ بھی کوئی معاشی کارروائی ہونی چاہیے تاکہ نئی دولت پیدا بھی ہو سکے۔ جوئے کے حامی کہتے ہیں کہ جیتنے والوں کو اس سے لطف حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ بھی دولت کی ایک شکل تو ہے۔ لطف واقعی دولت کی ایک شکل ہے مگر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہارنا نہایت ہی تکلیف دہ بھی ہے۔ اور اس لحاظ سے جوئے کی کارروائی سے تخلیق کردہ دولت کا حاصل جمع صفر نہیں تو اس کے قریب ضرور ہے۔

اب جوئے کا شوقین یہ کہہ سکتا ہے کہ جوا خانے کے محاصل کا کچھ حصہ اس کے ملازمین کی تنخواہوں پر خرچ ہوتا ہے جس سے وہ زندگی کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے جو صفر قدری یا منفی قدری اضافہ والا عمل نہ ہوا۔ اس دلیل میں بھی نقص ہے۔ جوا خانے کے ملازمین کی تنخواہ بھی تو دوسروں کے زر کے انتقال سے ہوئی۔ وہ بھی اسی زر سے لطف والی دولت خرید سکتے تھے۔ مزید برآں ایک اور پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جوئے کی کارروائی میں استعمال ہونے والی محنت اور وسائل کو بروئے کار لا کر تخلیق دولت کا موقع ضائع ہو گیا۔

بہت سے لوگ جوئے کے حق میں اس بنیاد پر دلائل بھی دیتے ہیں کہ انسان کے ہر کام میں جوئے کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ ہر وہ کام جس کا نتیجہ غیر یقینی ہو ایک قسم کا جوابی ہے اس لئے جوئے پر تنقید ہر ایسے کام پر تنقید کے مترادف ہے۔ چنانچہ اگر رولٹیٹ چکر پر سرمایہ کاری قابل مذمت ہے تو پھر کسی نئے کاروبار میں پیسہ لگانا قابل مذمت کیوں نہیں؟ اس کا ایک ممکن جواب یہ ہے کہ جب پودے لگائے جاتے ہیں تو کسان کے لئے شدید موسم اور بیماری سے نقصان کا امکان تو واقعی ہوتا ہے ایسے ہی جب تیل صاف کرنے والی فیکٹری لگائی جاتی ہے تو اسے چلانے والے کے لئے فنی خرابی اور تباہ کن حادثات کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ یقیناً یہ تمام خطرات تو ضرور درپیش ہیں مگر ان خطرات کا سامنا تب کرنا چاہیے جب ہمیں کھانے کے لئے روٹی یا کار چلانے کے لئے پٹرول کا حصول مقصود ہو۔ یہ کہنا کہ کھیتی باڑی کرنے میں خطرے ہیں اور رولٹیٹ کے چکر میں بھی خطرہ ہوتا ہے تو کیوں نہ رولٹیٹ کے چکر میں اپنی مساعی بروئے کار لائی جائیں۔ اس میں یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ کھیتی باڑی تو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے جب کہ رولٹیٹ کا چکر ہرگز نہیں۔

اس نقطہ نظر سے تو قومی لاٹری پر بھی ہمیشہ تنقید ہوئی ہے۔ اس قسم کے انتقال دولت پر کاروبار کا بنیادی ڈھانچہ جو مصروف عمل ہوتا ہے اسے انتقال دولت کے بجائے معیشت کے دوسرے شعبوں میں نئی دولت کی تخلیق کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ اور حکومت اگر واقعی صحیح معنوں میں خیراتی کاموں کے لئے محاصل پیدا کرنا چاہتی ہے تو موجودہ ٹیکس کے نظام کو بروئے کار لا کر مطلوبہ محاصل پیدا کئے جاسکتے ہیں جس سے لاٹری کے اخراجات کے مقابلہ میں لاگت بھی کم آئے گی۔ مثلاً اگر لینڈ ریونیو (Land Revenue) یعنی ارضی محصول کا نظام پہلے سے ہی موجود ہو تو ٹیکسوں کے لیے اس قسم کا ایک اور نیا بنیادی ڈھانچہ متعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے؟

برطانیہ میں قومی لاٹری کھلنے کے فوراً بعد جو راگلی نے (Joe Rogaly) نے 17 دسمبر 1994ء کے فنانشل ٹائمز میں یوں لکھا:

”قومی لاٹری ایک خیالی سرمایہ ہے..... یہ غریبوں پر ٹیکس ہے جو امیر کو ملتا ہے۔ یہ اندھیرے میں سکے اُچھالنے والے قابل افسوس احمقوں کے لئے خود کو تسکین دینے کا ایک جعلی احساس ہے۔ اس گندے کھیل میں قابل قدر کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی خیرات کے لئے فائدہ ہے نہ کوئی فنکاری کا کام ہوتا ہے نہ کوئی عمارت کھڑی ہوتی ہے جو اس سے کم رساں سے بن سکتی تھی نہ کوئی عزت ہی ملتی ہے

اور سوائے غالباً "Camelot Suckers" کے حصہ داروں کے نہ کسی کو کوئی فائدہ ہی ملتا ہے..... قرآن کے مطابق جوئے کے کھیل شیطانی اعمال ہیں۔ پاکیزہ کتاب کہتی ہے کہ "وہ شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ دونوں میں بہت نقصان ہیں اگرچہ لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے نقصان ان کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔" شراب پینے والے شاید اسے ماننے میں پس و پیش کریں مگر جہاں تک لاثری کا تعلق ہے تو اسلامی نظریہ عین عقل کے مطابق ہے۔"

مالیاتی منڈی (Financial Market) میں قیاس آرائی کی معاشی قدر پر مندرجہ بالا نظریات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مالی قیاس آرائی کو جوئے کی ہی ایک شکل خیال کرتے ہیں چونکہ وسائل کی تقسیم پر اس کا اثر جو خانہ جیسا ہی ہے۔ مگر کم از کم ایک اہم فرق ضرور ہے۔ مالیاتی مارکیٹ میں قیاس آرائی معاشی متغیرات (Economic Variables) مثلاً مبادلی شرح سودی شرح یا اشیاء کی قیمتوں پر اثر پذیر ہو سکتی ہے جب کہ جو خانہ کی شرطیں (Bets) ایسا نہیں کرتیں۔ قیمتوں کے طریقہ کار پر مالی قیاس آرائی کی اثر اندازی وسائل کی تقسیم پر گہرا اثر کر سکتی ہے۔

مالی قیاس آرائی کرنے والوں کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس میں قدری اضافے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ عام طور پر ان کے تین دلائل یہ ہیں: پہلے یہ کہ بڑی مارکیٹوں میں قیاس آرائی والے لین دین کے حجم کی وجہ سے مثلاً زر مبادلہ کی مارکیٹ کی وجہ سے صارف کو لین دین کے لئے زر مبادلہ کے حصول کی سیال مارکیٹ مل جاتی ہے۔ اگر مالی قیاس آرائی کا کاروبار کرنے والے نہ ہوتے تو صارف ایک کرنسی کا دوسری میں تبادلہ کرنے کے لئے مارکیٹ میں اپنے مقابلے کا کوئی فریق نہ پاتا جو معقول قیمت اور معقول پیمانے پر کرنسی کا تبادلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔ قیاس آرائی ایسی خرید و فروخت کرنے کے خواہشمندوں کا ایک اکٹھا گروہ اور اس طرح ایک اچھے خاصے پیمانے کی مارکیٹ مہیا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے مالی قیاس آرائی بھی ایک قسم کی قدر پیدا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مارکیٹ میں مالی قیاس آرائی میں شرکت کرنیوالوں کے مابین مقابلہ کے باعث صارف کی قیمت خرید اور قیمت فروخت میں فرق کم ہو جاتا ہے۔ جتنی قیاس آرائی زیادہ ہوگی اتنا ہی بولی اور پیش کش میں فرق کم ہوگا۔ اور اتنا ہی صارف کے لئے لین دین کے اخراجات میں کمی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ چونکہ مالی قیاس آرائی کرنے والے نفع بخش مواقع کی تجارت کرتے ہیں اس لئے مارکیٹ کی قیمتوں کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ ممکن تو ہے کہ سیولٹ ملنے اور لین دین کے کم اخراجات (Low Transaction Cost) کی وجہ سے فائدے حاصل ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے والا مالی قیاس آراء بذات خود ہوتا ہے۔ ایسے فریق کے لئے بڑے پیمانے پر کم وقت کے اندر تجارت کی تیز رفتاری نہایت اہم ہے۔ مگر حقیقی معیشت کے چلانے والے ایسی خصوصیات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کیا حقیقی معیشت کی کارکردگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیر مبادلہ کا بیوپار ایک منٹ سے بھی کم عرصہ میں مکمل ہو جائے؟ کیا کاروباری لین دین کو جس کو منظم کرنے میں کئی مہینے لگے ہوں اس لئے ختم کر دیا جائے کہ اس کے لئے غیر ملکی کرنسی ایک ہفتہ کی پیشگی اطلاع پر ہی دستیاب ہو سکتی ہے؟

مالی قیاس آرائی سے منسوب قیمتوں کی کارکردگی میں بہتری اور بھی قابل بحث ہے۔ کہتے ہیں کہ مارکیٹ کی کارکردگی میں بہتری کی سطح کا دار و مدار اس پہ ہے کہ حالیہ قیمتوں کے متعلق معلومات کس حد تک استعمال کی گئی ہیں۔ مگر یہ طریقہ کار تو مارکیٹ کے مقصد کو کم کر کے ثانوی اہمیت کا درجہ دیتا ہے۔ تخلیق دولت کو بڑھانے والے منصوبوں میں وسائل کو مختص نہ کرنے سے کیا مارکیٹ کی کارکردگی بہتر ہو سکتی ہے؟ 1990ء میں پال وولکر نیویارک ٹائمز کے ایک انٹرویو میں تذکرہ کرتا ہے کہ زیر مبادلہ کی غیر یقینی تو کاروبار کے اعتماد اور منصوبہ بندی پر تباہ کن اثرات پیدا کر سکتی ہے۔ مالی قیاس آرائی کو اس غیر یقینی کا موجب ہونے کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ سوال کرتا ہے کہ کوئی دلیل ہے جس کے تحت 1987ء کے ابتدائی مہینوں میں ڈالر اور پین کی مبادلہ شرح میں پہلے 30 فیصد کا اضافہ اور پھر 30 فیصد کی تخفیف ہوئی، کیا ہم یہ فرض کر لیں کہ منڈی کی قیمتوں میں استحکام کا کارکردگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟ اگر زیر مبادلہ کا حصول کسی غیر ملکی کاروبار کی سرمایہ کاری کے لئے ضروری ہو تو ایک کرنسی کا دوسری کرنسی میں تبادلہ کرنے سے کسی اضافی قدر والے منصوبے کا امکان تو ہو سکتا ہے مگر 1992ء میں مرکزی بینک نے بینک فار انٹرنیشنل سیٹلمنٹ کے جو اعداد و شمار اکٹھے کئے ان کے مطابق مالی قیاس آرائی کی تجارت کل دنیا کے روزانہ 880 ارب ڈالر کے کاروبار کا 95 فیصد تھی۔ اس لئے کارکردگی کی دلیل پر تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اس کو کم از کم غیر یقینی کے متعلق وولکر کی تنقید کا جواب تو دینا چاہئے۔

مالی دلال کاروبار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے غیر یقینی کو ایک حد تک پسندیدہ سمجھتے ہیں۔

کسی کو ایک ڈالر کے عوض 100 عدد بین خریدنے پر راغب کرنا مشکل ہوگا اگر کل بھی ڈالر ایک سو بین کا ہی رہے۔ جوئے کے لئے فریقین کا ہونا تو ضروری ہے مگر کیا مالی ادارے کو چاہیے کہ اپنے گاہک کو جو اکیلے کی ترغیب دے؟ گیسٹنر (Gestetner) گبسنز گریٹنگز (Gibsons Greetings) میٹل گیسلسافٹ (Metallgesellschaft) اور آرنج کاؤنٹی (Orange County) سب نے جوئے کے کھیل میں سینکڑوں لاکھوں ڈالر ہارے ہوئے ہیں۔ بہت سے مالی اداروں کے اندر ایک ٹیڑھے قسم کے ترغیبی نظام کا وجود پایا جاتا ہے جو ان لوگوں کو صلہ دیتا ہے جو اپنے گاہکوں کو سب سے زیادہ جو اکیلے کی ترغیب دیں۔ دولت کی تخلیق تو نہیں ہوتی سیلز مین کو کمیشن مل جاتی ہے۔

”ایک اشیائے صرف بنانے والی کمپنی پراکٹر اینڈ گیمبل (Procter & Gamble) کے ساتھ قانونی مقابلے میں ایک سرمایہ کاری والے بینکرز ٹرسٹ نامی بینک کے معاملہ سے لوگ پریشان ہو گئے۔ افشا ہونے والے کاغذات اور ٹیپس (Tapes) سے پتہ چلا کہ بینک کے ملازم خفیہ فروخت (Derivative Sales) کے پیچیدہ کاروبار کے متعلق لوٹ کھسوٹ کے عنصر کی گفت و شنید میں ملوث تھے۔“

(The Economist, 7 October 1995)

جب بین الاقوامی بینک اس طرح کے کام کریں تو وہ اپنا اصل مقصد پورا نہیں کرتے جو ایک مالی ادارے کو کرنا چاہیے۔ اس کھیل کا نام انتقال دولت ہے اور اس کا نتیجہ غیر یقینی اور وسائل کی غلط تقسیم ہے۔ پراکٹر اینڈ گیمبل کی لوٹ کھسوٹ کے دھبے کو دھونے اور اپنی شہرت برقرار رکھنے کے لئے مالی مارکیٹ کو ایسے ترتیب دینا ہوگا کہ اس کے گاہکوں کی جائز ضروریات پورا کرنے کے لئے دوسروں کا استحصال نہ ہو۔ مالی اداروں کو چاہیے کہ وہ قرض خواہوں اور سرمایہ کاری کرنے والے گاہکوں کا طویل المیعاد نفع بخش شراکت داروں کی طرح خیال کریں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ تجارتی حجم کی مقدار پر کمیشن سے جن اداروں کو آمدن حاصل ہوتی ہے ان کی تجارتی حکمت عملی کا ہدف حجم کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا ہے۔ ایسے گروہ کے افراد کے لئے مقصدیت کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے اور کارکردگی والی دلیل ایسے بے اصولوں کی اوٹ بن جاتی ہے۔

مالی منڈی میں قیاس آرائی کی بحث جاری رکھنے کے لئے ہم اپنی توجہ کا رخ مختصر طور پر مستقبلیات کی مارکیٹوں (Future Markets) کی طرف کرتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ وہ

مارکیٹیں ہیں جہاں پر بائع اور مشتری کے مابین کسی مستقبل کی تاریخ کے لئے لین دین کی شرائط طے کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مشتری اور بائع کے درمیان اگر معاہدہ طے پاتا ہے کہ 400 ڈالر فی اونس کے حساب سے 100 اونس سونا خریدا جا رہا ہے۔ جس کی سپردگی یا تسلیم (Delivery) اور ادائیگی آنے والے دسمبر میں ہوگی تو کہیں گے کہ یہ سونے کے لئے مستقبل دسمبر کا معاہدہ ہے جو 100 اونس بحساب 400 ڈالر خریدا گیا۔

جس دن تجارتی معاہدہ طے پائے اس دن فریقین کو کچھ رقم جمع کرانا پڑتی ہے جو ابتدائی ہامش (Initial Margin) کہلاتی ہے جو مستقبل کی تاریخ پر معاہدے کی تکمیل کے لئے ایک ضمانت فراہم کرنے کا کام کرتی ہے۔ یہ ہامش زیر تجارت سامان کی قیمت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوتی ہے جو ایک مرکزی کلیئرنگ ہاؤس (Central Clearing House) کے پاس محفوظ رہتی ہے۔ تمام مارکیٹیں اسی ہامشی تجارت (Margin Trading) کے اصول پر کام کرتی ہیں۔ مرکزی کلیئرنگ ہاؤس مشتری اور بائع کے لئے ایک ایسا فریق بن جاتا ہے جو معاہدے کی خلاف ورزی کے خلاف ضمانت فراہم کرنے کا کام کرتا ہے۔ یہ مشتری اور بائع سے وصول کئے گئے ہامش کو اس ضمانت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ملاحظہ کیجئے کہ زیر تجارت اشیاء کے پوری ادائیگی اور بذات خود وہ اُن اشیاء کا بوقت معاہدہ تبادلہ نہیں ہوتا۔ اس لئے مستقبلیات کی مارکیٹ بائع کو ایسی اشیاء فروخت کرنے کی اجازت دیتی ہے جو اس کی ملکیت میں نہیں۔ اسے شارٹ سیلنگ (Short Selling) یعنی مختصر فروخت کہتے ہیں اور مشتری وہ چیز بغیر فوری ادائیگی کے خرید سکتا ہے۔ فریقین سپردگی کی مستقبل کی تاریخ کا ہم قدر اشیاء (Counter Values) کے تبادلے کی تکمیل کے لئے انتظار کرتے ہیں۔ (بصورت دیگر سپردگی کی تاریخ سے پیشتر کوئی ایک فریق معاہدہ ختم کر کے اس کے برعکس کوئی دوسرا معاہدہ کر سکتا ہے۔ اس صورت میں نفع یا نقصان پورا کر لیا جاتا ہے جس کا تعین مستقبل کی دونوں قیمتوں کے فرق سے ہوتا ہے۔)

ایسی مارکیٹوں کو جہاں فوری سپردگی اور ادائیگی درکار ہوتی ہے نام نہاد نقد (Cash) یا فوری (Spot) مارکیٹیں کہتے ہیں ان میں بھی ایسی حکمت عملی اپنائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر نقد منڈی

میں ایک تاجر ایسا بانڈ فروخت کرنا چاہتا ہے جو اس کے پاس نہیں تو وہ صرف کسی سے ایسا بانڈ کچھ مدت کے لئے ادھار لے لیتا ہے۔ ادھار لئے گئے بانڈ کو وہ تاجر فوری طور پر بیچ دیتا ہے۔ قرض کی مدت ختم ہونے سے پیشتر اسے امید ہے کہ وہ مارکیٹ میں وہی بانڈ کم قیمت پر واپس خرید لے گا اور متوقع نفع حاصل کرنے کے بعد ادھار کے معاہدے کے مطابق ادھار دینے والے کو بانڈ لوٹا دے گا۔

میرے (مصنف) کے خیال میں تجارت کے مذکورہ بالا طریقہ ہائے کار ہی مالی قیاس آرائی کے سب سے بڑے معاون ہیں۔ اُن کے تحت جب عامل (Agents) کسی اثاثے کی مستقبل کی قیمت پر شرط لگاتے ہیں تو چونکہ ہم قدر شے (Counter Value) یعنی وہ اثاثہ فوری طور پر دینا ہی نہیں پڑتا اس لئے ایسا کرنے میں بہت کم لاگت آتی ہے۔ لہذا مستقبل کی تجارت کے لئے اصل زر کی ضرورت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور لگائی گئی تھوڑی سی رقم پر جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اثاثے کی قیمت میں فیصد اضافے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لیوریج (Leverage) یعنی قوت قرض کی ایک سادہ سی مثال ہے۔ جس پر تفصیلی بحث ذیل میں آرہی ہے۔

جہاں بائع ایسی اشیاء بیچتا ہے جن کا وہ مالک نہیں اور ایسے کاروبار کا حجم بھی بہت وسیع ہو تو منڈی کا توازن بری طرح بگڑ سکتا ہے۔ ہاں البتہ مشتری کو پوری قیمت اگر فوری طور پر نہ دینی پڑے تو عدم استحکام کی حوصلہ افزائی مخالف سمت میں بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کارروائی دوسرے لوگوں میں بھی نفع مندی کے اعتبار سے خود غرضی کا رجحان پیدا کر سکتی ہے۔ معیشت کے اندر حقیقی شعبہ تو پیدا کاروں (Producers) اور صارفین (Consumers) کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ پیداوار اور اصراف کے درمیان مارکیٹ میں توازن پیدا کریں جبکہ مالی قیاس آرائی کے شعبہ کا مقصد اس توازن کو قائم کرنے والی قیمتوں کے اتار و چڑھاؤ کی پیش بینی کر کے نفع کمانا ہوتا ہے۔ ذیل میں واضح کیا جائے گا کہ اس طرح قیاس آرائی کرنے والا معیشت کے حقیقی شعبہ کی اس ترتیب ہی میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے جو درحقیقت پیداوار اور اصراف کا تعین کرتی ہے۔ یہ بگاڑ کچھ لوگوں کے لئے تو فائدہ مند ہوتا ہے مگر بڑے پیمانہ پر معاشرے کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ اسی لئے تاریخ میں ہمیشہ ہی قحط کے دوران قیاس آرائی کے تحت خوراک کی اشیاء کی خرید سے نفرت دلائی گئی ہے۔

پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ اثاثوں کے ذخیرہ کا نام دولت ہے جس سے وقت کے ساتھ لطف اندوزی کی ترسیل ہوتی ہے۔ کسی عرصہ میں اگر ان ذخیروں میں معنی خیز اضافہ درکار ہو تو نئی دولت اتنی کافی مقدار میں پیدا ہونی چاہیے کہ وہ اس عرصہ کے دوران ان ذخیروں میں واقع ہونے والی کمی سے زیادہ ہو۔ مثال کے طور پر خوراک کے ذخیرے استعمال کی وجہ سے کم ہوتے ہیں سڑکوں میں ٹریفک کے بہاؤ سے توڑ پھوڑ پیدا ہوتی ہے چنانچہ ان کی کمی کو دور کرنے کے لئے معاشی تگ و دو مسلسل چلتی رہنا چاہیے تاکہ معیشت کی ایک سطح برقرار رہے۔ اس تگ و دو کا مقصد دولت کے ذخیرے کو ایک سطح پر برقرار رکھنا ہے تاکہ زندگی کے لطف کی روانی گزشتہ سطح پر قائم رہے۔ یہاں پر ایک دفعہ پھر اینٹراپی کا عمل قابل ذکر ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایک بنیادی نظام میں نظم کی سطح نیچے آتی رہتی ہے جب تک کہ اسے برقرار رکھنے کے لئے توانائی صرف نہ کی جائے۔ دولت بھی طبعی نظام کی طرح ہے۔ جوں جوں زندگی کے لطف کی ترسیل ہوتی ہے اس کے منبع میں کمی آتی رہتی ہے۔

قطعی بات یہ ہے کہ کسی معاشرے میں اگر معیشت کا ہر عمل تخفیفی یا صفر اضافی قدر والا ہو تو بالآخر معاشرہ لامحالہ طور پر غربت میں چلا جائے گا۔ یہ غربت مادی معاشرتی یا ماحولیاتی کسی لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اینٹراپی کی وجہ سے ہر قسم کے طبعی نظام چونکہ شکست و ریخت کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کے لئے ان کی لطف اندوزی کی ترسیل کی قابلیت میں کمی واقع ہوتی ہے اس لئے نئی دولت پیدا کر کے گزشتہ ذخیرے کی سطح قائم رکھنے کا عمل معاشرے کی بقا کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نفع مل جانا اس بات کی لازمی علامت نہیں کہ نئی دولت کی پیداوار کا عمل بھی ہو رہا ہے۔ جوئے بازی اور نشہ آور اشیاء کا کاروبار نہ تو نئی دولت پیدا کرتے ہیں اور نہ ہی معاشرہ کے لئے دولت کے گزشتہ ذخیرے کو برقرار رکھتے ہیں۔ دونوں ہی لوگوں کی توانائی چوس لیتے ہیں جو نئی دولت کی پیداوار کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں ہی کاروبار ایسے ہیں جو دولت کی تخلیق سے نہ صرف کوسوں ہی دور ہیں بلکہ اسے تباہ کر رہے ہیں مگر ہیں نفع بخش۔

اس صورت حال کی وضاحت کا خلاصہ تو اس باب کے عنوان ہی میں درج ہے۔ کچھ معاشی کاروائیاں تخلیق دولت اور کچھ محض انتقال دولت کرتی ہیں۔ جدید دنیا میں انتقال دولت والی کاروائیاں

بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ہماری اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کی خوشی اور تحفظ اس پر منحصر ہے کہ تخلیق دولت اور انتقال دولت میں سے کون سی کارروائی دوسری پہ سبقت لے جاتی ہے۔ جب معاشرے میں کچھ طبقے اپنی بقا کے لئے تخفیفی قدر والے طریقہ ہائے کار اپنانے کی کوشش کریں جن کی ایک مثال چوری ہے تو اس کے معاشرتی ڈھانچے اور ترتیب کو نقصان پہنچتا ہے۔ تخفیفی قدر والے عمل بے شک معاشی حجم میں کم ہی ہوں مگر بات وہی ہے کہ وسائل جو تخلیق دولت کے لئے استعمال ہو سکتے تھے محض انتقال دولت کے لئے استعمال ہو گئے۔

ہمارے مالیاتی ماحول کی کچھ روایات انتقال دولت کی کارروائیوں کی ترغیب دیتی ہیں۔ یہ وہ روایات ہیں جو ان معاشی کارروائیوں کا تعین کرتی ہیں اور جن میں مختلف معاشی شرکاء حصہ لیتے ہیں اور اس طرح معیشت میں وسائل کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس دلیل کی وضاحت کے لئے انتقال دولت کو ایک اور پہلو سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

رہن اور سود

(Collateral and Interest)

جیسا کہ باب نمبر 2 میں بیان کیا گیا اکثر و بیشتر دہن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے قرض خواہوں سے رہن کا سہارا حاصل کرنے پر اصرار کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ قرض خواہ قرض واپس ہی نہ کر سکے۔ اس طرح اگر قرض دار قرض واپس کرنے اور پہلے سے مقرر شدہ سود ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس صورت میں سودی دائن رہن ضبط کر کے اس کی فروخت سے وصول شدہ رقم کے ذریعہ اپنا واجب الوصول قرض بمعہ پہلے سے مقرر شدہ سود حاصل کر سکتا ہے۔ رہن کی ضبطی کا نتیجہ یوں ہوتا ہے کہ دائن کی وصولی مکمل طور پر یا جزوی طور پر قرض دار کے کمائے ہوئے نفع سے نہیں بلکہ اس کے اثاثہ سے نکلتی ہے۔ رہن کے تحت پہلے سے مقرر شدہ سود پر کاروبار کے لئے سرمایہ کاری کا مطلب یہ ہے کہ اس سرمایہ سے ممکن ہے حاصل کردہ نفع مقررہ سود سے کم ہو تو اس صورت میں رہن ضبط کر کے قرض بمعہ مقررہ سود وصول کرنے کے لیے انتقال دولت کی جائے گی مگر جہاں یہ طریقہ کار موجود بھی ہو وہاں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ ضبط کردہ رہن کی قیمت واجب الوصول قرض کے لئے ناکافی ہو جائے۔

برطانیہ کے اندر اس صورت حال کی خصوصیت کو منفی اکیویٹی (Negative Equity) کہتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ رہن کے طریقہ کار سے دائن اپنے سرمایہ پر مثبت نفع حاصل کرنے کا انتظام تو کر لیتا ہے مگر ضروری نہیں کہ مدیون کو بھی فائدہ ہی ہو۔ اگر معیشت میں سرمایہ کاری کی تقسیم کا طریق کار متوقع نفع مندی پہنی ہو تو پھر رہن پہنی قرض دینا اس طریق کار کے لئے رکاوٹ ہوگا۔ مزید برآں ہم نے چونکہ دیکھ لیا کہ نفع تخلیق دولت کا مترادف نہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ کار کا مثبت اضافی قدر والی سرمایہ کاری میں مالی نقصان بھی ہو سکتا ہے یا تخفیفی قدر والی سرمایہ کاری میں مالی فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرض کے سرمایہ کی تقسیم اگر متوقع نفع مندی پر ہی مبنی ہو تو پھر بھی کوئی ضمانت نہیں کہ نتیجتاً مثبت اضافی قدر والے کاموں کو تخفیفی قدر والے کاموں پر ترجیح دی جائے گی۔

ضروری نہیں کہ انتقال دولت چھوٹے پیمانہ کی کاروباری سرمایہ کاری میں ہی ہو۔ سرکاری سرمایہ کاری بڑے پیمانہ پر اسی طریق کار کی ایک مثال ہے۔ حکومت اپنے اخراجات کے لئے مقررہ سود کی شرح پر سرمایہ قرض لیتی ہے۔ یہ اخراجات یا تو اتنی کافی مقدار میں ٹیکس پیدا کریں جس سے قرض کی واپسی ہو سکے یا سرکار اپنے رہن کی ضبطی کی اجازت دے جو بالکل اسی طرح ہے جس طرح اوپر ذکر کیا گیا۔ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے اس کے رہن کی ضبطی ٹیکسوں کی صورت میں ہے جو یا تو اعلانیہ طور پر ٹیکسوں میں اضافہ کی شکل میں ہو یا غیر اعلانیہ کرنسی کی قدر کم کر دینے میں ہو۔ تیسرا طریقہ موجودہ قرض کو ادا کرنے کے لئے مزید قرض کا اجرا ہے جس سے انتقال دولت صرف ملتوی ہوتا ہے اور اکثر بڑھ جاتا ہے۔

سرکاری سرمایہ کاری کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ بے خطر (Risk Free) سود کی شرح کی وجہ سے نجی کاروبار میں سرمایہ کاری کو سرکاری کاموں میں سرمایہ کاری کے مقابلہ میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ نجی منصوبے میں سرمایہ کاری بھلا کیونکر کی جائے جس سے 10 فیصد فائدہ باخطر (Risky) ہے جب کہ سرکار بے خطر 10 فیصد فائدہ دیتی ہے؟ بے خطر سود کی شرح والے نجی منصوبے تو ضرور ہوں گے مگر وہ مالی لحاظ سے قابل جواز نہیں کیونکہ وہ سرکار کے مقابلہ میں زیادہ نفع فراہم نہیں کرتے اور اگر ان میں سے کوئی منصوبہ ناگزیر قسم کی خدمات سرانجام دینے والا ہو جیسے شعبہ صحت یا شعبہ تعلیم تو ان کو سرکار کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہی ان کو سرمایہ مہیا کرے۔

تب دو قسم کی ناپسندیدہ صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایسے منصوبے جن کی نفع مندی نجی سرمایہ کاری کے لئے دلکش نہیں ہوتی اور ان کو سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے سرکار مجبور ہوتی ہے جس کے باعث سرکاری شعبہ کے سرمایہ پر بہت بوجھ پڑتا ہے۔ یہ بوجھ اور بھی بڑھ جاتا ہے جب بے خطر سودی شرح اوپر جاتی ہے۔ دوسری یہ کہ سرکاری منصوبوں میں ایسا سرمایہ لگ جاتا ہے جو بصورت دیگر نجی منصوبوں پر لگ سکتا تھا۔ اس کے لیے اکثر جبری اخراج (Crowding Out) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جبری اخراج کے حامی کہتے ہیں کہ نجی کاروبار وسائل کی تقسیم کا بہترین طریقہ کار ہے۔ غیر نفع مندی کے خوف سے بالا ہو کر سرکار ایسے منصوبوں پر سرمایہ لگا دیتی ہے جو مالی نقطہ نظر سے بہت ہی قابل اعتراض ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر اس دلیل کا مطلب ہے کہ نجی کاروبار اس قسم کی غلطیاں بہت کم کرتا ہے۔ اس تجزیے میں کچھ سچائی ضرور ہوگی مگر یہ بھی لحاظ رہنا چاہیے کہ معاشرہ کے لئے ضروری منصوبے جو ہماری نظر میں بہت زیادہ مثبت اضافی قدر والے ہوتے ہیں جب انہیں نفع مندی کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ اکثر غیر دلکش ہوتے ہیں۔ سودی شرح خواہ جتنی بھی ہو نجی کاروبار ایسے منصوبوں میں سرمایہ کاری نہیں کرتا جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مثبت اضافی قدر والے منصوبوں میں نفع کونا پنے کا کوئی پیمانہ دستیاب نہیں۔

اگر سرکار مجبوری کے تحت ایسے ناگزیر منصوبوں پر سرمایہ لگانے کے لئے بلا خطر سودی شرح پر قرض لیتی ہے جو کم مالی نفع دیتے ہیں تو آخر کار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرکار کی مالی دولت کا انتقال قرض دینے والوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ طبی علاج کی نئی سہولتیں مہیا کرنے سے اگر کچھ لوگ صحت یاب ہو کر معیشت کی پیداوار میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں تو ان سے سرکار کو ٹیکس بھی تو ملتا ہے۔ یہ ٹیکس طبی علاج کی سہولت میں سرمایہ کاری کے نفع کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر سرکار کی سرمایہ کاری کی قیمت اس ٹیکس سے پوری نہیں ہوتی تو آخر کار سرمایہ کار کو قرض واپس کرنے کا بوجھ بھی تو ٹیکس دینے والوں نے ہی برداشت کرنا ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ معیشت میں بے خطر اور دوسری سود کی اشرا ح سرکار کی زری پالیسی کے تحت ہونی چاہئیں تاکہ معاشی عمل کے نتیجہ میں نفع ان کے برابر ہو جائے۔ مگر یہ کام یقینی طور پر ناممکن ہے۔

کاروبار کی اقسام میں تنوع اور مختلف قسم کے خطرات اور دورانیے جن کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی جاتی ہے ان کے پیش نظر کوئی ایسی منفرد سودی شرح نہیں جو ان تمام اقسام کی سرمایہ کاریوں سے قابل حصول نفع کی نمائندگی کرتی ہو۔ اور چونکہ سرکار کی زرعی پالیسی قلیل المدت سود کی اشراح کے گرد گھومتی ہے اس لئے طویل المدت سودی اشراح کا تعین ارباب اختیار کے کنٹرول سے باہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے باب نمبر 2 میں دیکھا کہ زرعی پالیسی اکثر بینک کے تخلیق زر کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ مگر ایسی کوشش حقیقی معیشت کی ضروریات کے برعکس ہو سکتی ہے جس میں کاروباری کارروائیاں یا تو کافی زیادہ یا کافی کم ایسی سودی اشراح کا مطالبہ کر سکتی ہیں جو بینکاری کے نظام کو کنٹرول کرنے کے لئے موزوں نہیں سمجھی جاتیں۔ چنانچہ معاشی پالیسی کے ارباب اختیار کے لئے یہ دو متضاد مطالبے کشمکش کی مشکل صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔

بہر حال سودی اشراح ایسی کسی سطح پر مقرر نہیں کی جاسکتیں جو کاروبار کی نفع مندی کی صحیح ترجمانی کرتی ہوں کیونکہ نفع مندی کی شرح اس کے حصول سے پیشتر نہیں بتلائی جاسکتی۔ نتیجہ پھر بھی یہی نکلتا ہے کہ جس منصوبے میں سرمایہ کاری کی گئی ہو سود اس کی نفع مندی کی نمائندگی نہیں کرتا۔ سود اس کی نفع مندی کی شرح سے زیادہ ہو گا یا کم۔ یہاں سے منصفانہ کامل شراکت (Full Equity Financing) کی سرمایہ کاری کا فائدہ واضح ہے۔ شراکت پر مبنی سرمایہ کاری والے منصوبوں میں منصفانہ شراکت کے مالکوں کو منقسم نفع اور ان کے حصہ (Shareholding) کے سرمایہ میں نمو حاصل ہوتی ہے جو کہ خرکار سرمایہ کاری کی نفع مندی کے بہت قریب ہوتی ہے۔ نتیجتاً نفع کی شرح خود بخود اصل زر کی صحیح قیمت مہیا کر دیتی ہے۔ جب تک ایسے منصوبوں کی سرمایہ کاری میں سودی قرضہ شامل نہیں ہوتا تو جو بھی اس معاشی عمل میں نفع حاصل ہو وہ بغیر رہن کی ضبطی کے تقسیم ہو جاتا ہے۔

مقررہ سودی شرح والی سرمایہ کاری کی حمایت میں کبھی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مذکورہ بالا سرمایہ کاری کے طریقہ کار سے تاجر (Entrepreneurs) کئی منصوبے شروع ہی نہیں کریں گے۔ مثلاً جہاں منصفانہ شراکت پر مبنی کوئی سرمایہ کاری میں کسی منصوبے کے لئے کوئی سرمایہ کار تمام مالی سرمایہ مہیا کرے تو مکمل نفع وہی لے جائے گا۔ اس لئے تاجر کو کاروبار کرنے کے لئے کوئی محرک (Incentive)

مہیا ہی نہ رہے گا۔ اس دلیل پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ان حالات میں سرمایہ کار خود ہی مقررہ نفع کی شرح وصول کرنے کی خواہش نہیں کر سکے گا کیونکہ رہن کی عدم موجودگی کے باعث منصوبے میں نقصان کی صورت میں خود ہی اسے مکمل خطرے کا سامنا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ فائدہ کی صورت میں وہ اپنے سرمایہ کے نفع پر مقررہ شرح کی حد مقرر کر دے۔ دوسری زیادہ اہم بات یہ کہ تاجر کو اس بات سے کوئی چیز نہیں روکتی کہ وہ منصفانہ شراکت والے سرمایہ کار سے شروع میں ہی منصوبے کے نفع سے ایک طے شدہ تناسب کے تحت ایک متوقع حصہ لینے کا معاہدہ کر لے۔ اس طرح منصفانہ طریقے سے کاروبار کے اصل زر میں تاجر کا حصہ متعارف ہو جاتا ہے۔

اب تک یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ رہن کی ضبطی سے سرمایہ کار کو نفع مندی حاصل ہوتی ہے اس لئے اسے رہن اور نفع مندی دونوں کو سامنے رکھ کر اپنے سرمایہ کی تقسیم کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ دائن ہو سکتا ہے صرف ان قرض خواہوں کو قرض دینا پسند کرے جن کے پاس پہلے اثاثے موجود ہیں اور ان قرض خواہوں کو قرض نہ دینا چاہتا ہو جن کے پاس رہن کے لئے اثاثے موجود نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بینکر آپ کو قرض تب دیں گے جب آپ ثابت کر دیں کہ آپ کو اس کی درحقیقت ضرورت نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ رہن کی بنیاد پر قرض صرف امیروں میں سرمایہ کی گردش کا محرک بنتے ہیں چونکہ یہی تو وہ لوگ ہیں جو دراصل رہن پیش کرنے کے قابل ہیں جبکہ امیر یا پہلے سے موجود اثاثوں کے مالک مثبت اضافی قدر والے منصوبوں پر ہی تو اجارہ داری نہیں رکھتے۔ غریب لوگ اور درحقیقت غریب اقوام کے پاس ہی تو مثبت اضافی قدر والے منصوبے شروع کرنے کے لئے ہوتے ہیں مگر ان کے پاس ایسے منصوبوں کے لئے سرمائے کا فقدان ہوتا ہے۔ جب سرمایہ صرف وہاں دستیاب ہو جہاں رہن موجود ہے تو رہن والے طریقہ کار سے ممکنہ قرض خواہوں کا ایک خاص گروہ محروم رہ جاتا ہے۔

باب نمبر 2 میں بتلایا گیا تھا کہ قرض دینے کے لئے بینک اپنا رجحان ایسے سرمایہ کی طرف رکھتے ہیں جو بیک وقت قلیل پیشگی اطلاع پر کھاتہ داروں کو بھی واجب الادا ہوتا ہے۔ اس طرح سیولت کے بحران کا خطرہ رہتا ہے جو کھاتہ داروں کا اپنا جمع شدہ سرمایہ نکلوانے کی ضرورت پوری نہ کر سکنے پر

اور خاص کر معیشت میں مندی کے دوران سامنے آتا ہے۔ ان خطرات کی تلافی کی خاطر بینکروں کی ترجیح قلیل المدت منصوبوں میں سرمایہ کاری کی ہوتی ہے تاکہ مندی کی صورت میں سیولت کی طلب پوری کی جاسکے۔ طویل المدت منصوبے جن میں نفع پیدا کرنے کے لئے لمبے عرصہ کی سرمایہ کاری درکار ہوتی ہے سیولت میں قلیل المدت منصوبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دوبارہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قلیل المدت منصوبے ضروری نہیں کہ مثبت اضافی قدر والے بھی ہوں۔ بعض اوقات وہ قیاس آرائی کی کارروائیوں کے گردھومتے ہیں اور بعض معاشی حالات کے تحت صنعتی اور تجارتی کارروائیوں کے مقابلہ میں زیادہ نفع پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اکثر غیر منقولہ جائیدادوں کی قیمتوں میں تیزی کے دوران ایسا ہوتا ہے۔ مزید برآں ہم نے دیکھا کہ سرمایہ کاروں کے ڈسکاؤنٹنگ کے تجزیے کے تحت حالیہ کارروائیوں کے دور رس نتائج کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ قلیل المدت منصوبے ڈسکاؤنٹنگ کے تجزیے کے مطابق بہتر نظر آتے ہیں اس لئے جو سرمایہ کار ایسے تجزیے پر انحصار کرتے ہیں ان کا میلان انہی کی طرف ہوتا ہے۔

لیوریج یعنی قوت قرض اور مالی قیاس آرائی (Leverage and Speculation)

اب تک جدید مالی ماحول کے دو قسم کے رواج متعارف کئے گئے یعنی رہن پہنئی سرمایہ کاری کے لئے قرض اور بے خطر سودی نفع۔ دونوں ہی سرمایہ کاری کی تقسیم کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ معیشت میں جس طریقے سے یہ رواج انتقال دولت کا محرک بنتے ہیں اس کو سمجھنے کے لئے قرض خواہوں کے محرکات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ قرض لینے اور دینے والی دونوں اطراف کا جائزہ لینے سے ہم بہتر طور پر جان سکتے ہیں کہ غیر منصفانہ رواج اتنے لمبے عرصہ سے زندہ کیسے ہیں۔

اگر وسیع پیمانہ پر اپنایا جائے تو قرض لے کر اثاثے خریدنے کے لئے سرمایہ کاری کا تسلسل خود بخود برقرار رہ سکتا ہے۔ اثاثوں کے مالک اکثر اپنے اثاثے قرض لینے کے لئے رہن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس طرح سے لئے گئے قرضے مزید اثاثے خریدنے کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اور پھر ان سے آگے اور سرمایہ کاری حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک خاص قسم کا اثاثہ جب قرض

اور رہن میں اضافہ کے تسلسل کا مرکز بن جائے تو ایسی قسم کے اثاثہ کی قیمت بڑھنی شروع ہو جاتی ہے نتیجتاً رہن کی قدر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح قرض لینے والوں میں زیادہ اعتماد کا باعث بنتا ہے۔ جلد ہی مالی قیاس آرائی کے غبارے میں ہوا بھرنی شروع ہو جاتی ہے۔ اثاثہ رہن مہیا کرتا ہے اور قرض پر حاصل کردہ سرمایہ لئے ہوئے خریداروں کی موجودگی میں طلائی مارکیٹ سیولت مہیا کر دیتی ہے۔

اثاثے کی قلیل قیمت سے بڑی مقدار کے قرضہ پر مبنی منصوبہ مالک کو اس کے اپنے سرمایہ کی اساس پر ایک بہت بڑی شرح کا نفع مہیا کر سکتا ہے۔ اس طرح حاصل کردہ قوت قرض کو لیورج (Leverage) کہتے ہیں۔ ذیل کی جدول میں نوگنالیورج کا عمل دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایکویٹی (والے سرمائے) کا نوگن قرض مالک کے اثاثہ پر 20 فیصد نفع کو اس کی ایکویٹی (والے سرمائے) کا 110 فیصد نفع بنا دیتا ہے۔

| | |
|----------|---|
| 100 | مالک کی ایکویٹی (Owner's Equity) |
| 900 | 10 فیصد پر لیا گیا قرض |
| 1000 | منصوبہ کے اثاثے (Project Assets) کا میزان |
| 200 | منصوبہ کا نفع |
| 1200 | ایک سال بعد اثاثے کی قدر |
| 990 | سود اور اصل زر جو دائن کو واپس کیا گیا |
| 210 | ایک سال بعد مالک کی ایکویٹی (1200-990) |
| 20 فیصد | اثاثے پر نفع (200/1,000) |
| 110 فیصد | مالک کی ایکویٹی پر نفع (110/100) |

منصوبہ کے مالک کے نفع پر قوت قرض یعنی لیورج (Leverage) کا اثر

جو لوگ قوت قرض یعنی لیورج کے بل بوتے پر کاروبار کرتے ہیں ان کا جنون اکثر تکلیف کا باعث بنتا ہے جو مالی قیاس آرائی پر مبنی جائیداد کے کاروبار میں تیزی (Boom) کے بعد والے دور سے بالکل

ہی واضح ہے۔ اثاثوں کی قیمت میں زیادہ اضافے کے رد عمل میں سرکار سودی شرح بڑھا سکتی ہے جس کا اطلاق تمام قرض خواہوں پر ہوتا ہے۔ جو نہی سودی شرح بڑھتی ہے کچھ قرضدار سود کی قیمت برداشت نہیں کر سکتے اور ان میں کچھ ادائیگی سے معذور ہو جاتے ہیں۔ اب اس نئے پیدا شدہ ماحول میں مالی قیاس آرائی پر مبنی سرمایہ کاری کا رستہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے نئے خریدار نایاب ہو جاتے ہیں اور قیمتوں میں تیزی یکدم ختم ہو جاتی ہے۔

کم از کم جہاں تک ارباب اختیار کا تعلق ہے ان کے لئے تو یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ جان کر کہ اصل زر پر مزید قلیل المدت نفع اب ممکن نہیں رہا اور لئے ہوئے قرض پر سودی قیمت بڑھ رہی ہے مالی قیاس آرائی کرنے والے لوگ اثاثے بیچ کر اپنے کچھ قرض چکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سقیم مارکیٹ میں اب اثاثوں کی قیمت گرنی شروع ہو جاتی ہے۔ کئی مالی قیاس آرائی کرنے والوں کی صافی مالیت (Net Worth) اب تیزی سے سکڑتی ہے چونکہ قوت قرض یعنی لیوریج کا عمل اب متوقع سمت کے بجائے اس کے برعکس حرکت میں آ جاتا ہے۔ دائنین اپنے رہن کی گرتی ہوئی قدر کے باعث بہت تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ ان قرضداروں سے بھی قرض واپس لینا (fore close) شروع کر دیتے ہیں جو قرضوں کی ادائیگی وقت پہ کر سکتے تھے۔ اثاثوں کی مزید فروخت کا شیطانی چکر چل پڑتا ہے اثاثوں کی قیمتیں مزید گرتی ہیں اور بینک مزید قرض داروں کے قرضے واپس لینا (fore close) شروع کر دیتے ہیں۔

ارونگ فشر (Irving Fisher) گرتی ہوئی اثاثوں کی قیمتوں اور بہت زیادہ قرض لینے کے مہلک اتحاد کو تفریط قرض (Debt Deflation) کہتا ہے۔ بینکی زر کو وہ چیک بک منی (Check Book Money) کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا پھیلاؤ اور سکڑاؤ قطعی طور پر محرک (Catalyst) کا کام کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”جب نام نہاد کاروباری ادوار (Business Cycles) تشویشناک حد تک پہنچ جائیں تو ان کی موجودگی میں زیادہ پیداوار کم اصراف، زیادہ استعداد (Capacity) زیادہ اعتماد، زیادہ سرمایہ کاری، زیادہ بچت، زیادہ اصراف وغیرہ سب کی موزونیت متکوک لگتی ہے۔ میری رائے جس کے خلاف جب تک کوئی شہادت نہ مل جائے یہ ہے کہ ماضی کی حقیقی بڑی تیزیوں (Booms) اور مندلیوں (Depression) کے دوران مذکورہ بالا تمام عناصر بہت کم اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ان کی نسبت زیادہ اہم کردار

صرف دو ہی عناصر نے ادا کیا ہے۔ وہ دو عناصر ہیں: (1) زیادہ مقرض (Over Indebtedness) ہونا، خصوصاً بینک کے قرضوں سے اور (2) اس کے فوراً بعد آنے والی تفریط زر (Deflation)۔“

(Fisher, J., "100% Money", 1934, P. 106)

گارڈن پیپر (Gorden Pepper) مالی منڈیوں میں اثاثوں کی قیمتوں کی افراط و تفریط کی زری (Monetary) وجوہ پر توجہ مرکوز کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان میں گہرا تعلق ہے۔ وہ کہتا ہے:

”انفرادی کمپنیوں پر جو عناصر اثر انداز ہوتے ہیں صنعتکاران کے طرز عمل پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ وہ ہیں: نفع (Profit)، مقسومے (Dividends)، کمائیاں (Earnings) وغیرہ جو دراصل منصفانہ شراکت والی مارکیٹ کی سطح پر زیادہ اہم قلیل المدت اثر نہیں رکھتے۔ یہ ہے ”سٹی“ (City) کے الزامات کی اہم وضاحت جو حقیقت اور قلیل نظری (Short-Termism) سے واقفیت نہیں رکھتا۔ قلیل نظری کے علاج کے لئے جو بہت سے نسخے تجویز کئے گئے ہیں وہ صرف علامات کی حد تک جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بنیادی وجوہات پر توجہ مرکوز کی جائے اور وہ ہیں سرمایہ کی ترسیل اور مالی نظام میں عدم توازن۔“

(Pepper, G., "Money, Credit and Asset Prices," 1994, P. 15)

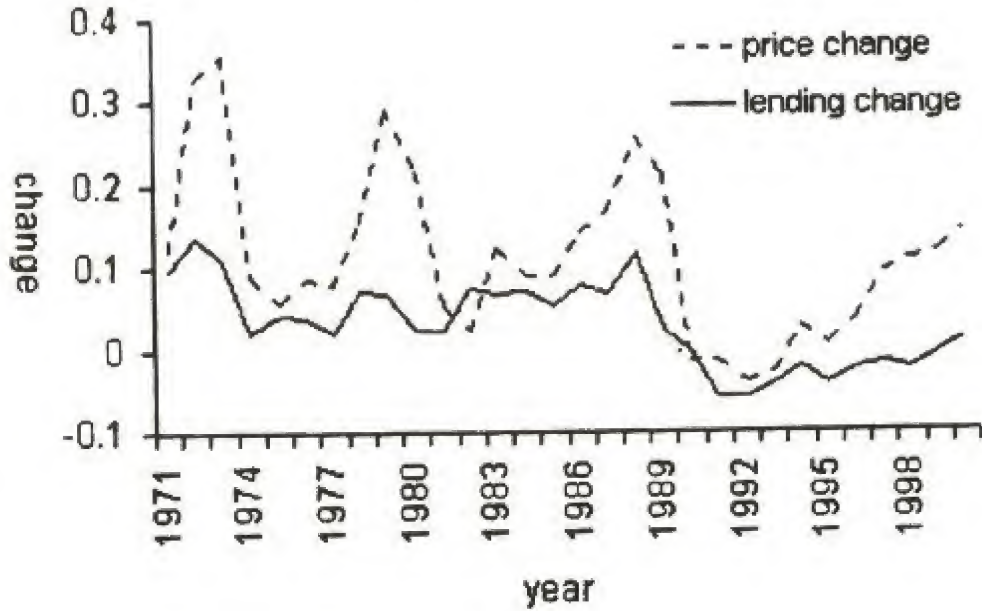
بینک کے سود دینے کی تبدیلیوں اور اثاثوں کی قیمتوں میں تغیرات کے مابین تعلق قابل غور ہے، خاص کر جہاں قرض کسی خاص قسم کے اثاثوں کے لئے دیا جائے مثلاً مکانوں کے رہن (Mortgages) اور جائیداد کی قیمتیں۔ اس کے متعلق پیپر (Pepper) کا تجزیہ جو مندرجہ ذیل گراف کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ ایک اور جائزے میں بینک کے قرضوں میں تغیر اور برطانیہ میں مکانوں کی اوسط قیمتوں میں تغیر کے درمیان گہرا تعلق پایا گیا۔ پیپر اور فشر کے پاس یہ دکھانے کے لئے ٹھوس دلیل ہے کہ نجی شعبے کے زر کی رسد میں پھیلاؤ جدید دور کی مالی قیاس آرائیوں کی تیزی (Speculative Booms) کا بہت بڑا محرک ہے۔

معاشی تیزی (Economic Boom) کے دوران سود اور رہن پر مبنی سرمایہ کاری کا معیار بینکوں کو اپنے قرض دینے اور اس طرح زر کی رسد میں اضافہ کرنے کی ترغیب پیدا کرتا ہے تاکہ زیادہ نفع حاصل ہو۔ اس کے الٹ دور میں وہی معیار اس کے برعکس کام کرتا ہے۔ پیپر کہتا ہے:

”جب سیولٹ کالین دین ایک ہی بہت میں ہو تو خبروں پر مارکیٹ کے رد عمل میں تعصب پایا جاتا ہے۔ مارکیٹ اچھے حالات میں صرف اچھی خبروں کو ہی قبول کرتی ہے۔ اور بری خبروں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ بصورت دیگر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ نیز مشاہدہ کار پہچان لیتے ہیں کہ مارکیٹ اوپر کو جارہی ہے یا نیچے کی طرف۔ مارکیٹ میں شرکت کرنے والے سمجھتے ہیں کہ رخ کے

پیچھے چلنے میں فائدہ ہے۔ بھیڑ چال کی کیفیت ہوتی ہے۔ ذی شعور سرمایہ کار کے طرز عمل کے مقابلہ میں ہجوم کی نفسیات زیادہ اہم ہو جاتی ہے اور بنیادی تجزیے کے مقابلہ میں ہجوم کی نفسیات پر مبنی تجزیہ زیادہ اہمیت لے جاتا ہے۔“

(Pepper, G., "Money, Credit and Asset Prices," 1994, P. xlx)



برطانیہ میں مکانوں کی اوسط قیمتوں میں تغیرات اور برطانیہ میں بینکوں کے قرضوں میں تغیرات

برطانیہ میں آج مالک مکان جانتے ہیں کہ بھیڑ چال میں کتنی طاقت ہو سکتی ہے۔ جب انہیں اطلاع ملتی ہے کہ مکانوں کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں تو مالی قیاس آرائی کرنے والے رہائشی جائیداد خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق چلنے میں تو یہ اچھی کارکردگی ہو سکتی ہے مگر وسائل کی تقسیم کے لحاظ سے اکثر یہ عمل اچھا ثابت نہیں ہوتا۔ جب لاکھوں گھرانے ایسا کرنا شروع کر دیں تو مالی قیاس آرائی کا کھیل سرمایہ گھما کے اپنے فائدے کا باعث تو ہو سکتا ہے مگر اس سے قیمتوں میں جو تغیرات واقع ہوتے ہیں ان کا بنیادی حقائق کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ جلد ہی لوگوں کے ذہنوں پر جعلی قسم کے خیالات چھا جاتے ہیں مثلاً ”..... اگر کر سکتے ہو تو ابھی خریداری کر لو“۔ ایسے ماحول میں کبھی نہیں پوچھتے کہ رہائشی جائیداد کی تعمیر میں اچھے خاصے وسائل لگا دینا رہائش کی حقیقی ضرورت کے مطابق ہے بھی

کہ نہیں یا کیا یہ صرف مالی قیاس آرائی کے ذریعہ نفع کمانے کے لئے ہے؟ جائیداد کی بڑھتی ہوئی قیمتیں بہر حال نئی جائیداد کی تعمیر کی ترغیب دیتی ہیں۔ مالی قیاس آرائی کی عدم موجودگی میں جہاں جائیداد کی حقیقی طلب موجود ہو وہاں تو قیمتوں میں اضافہ وسائل کو جائیداد کی تعمیر کی طرف مبذول کرانے میں درست کام کرتا ہے۔ مگر مالی قیاس آرائی پہنی قیمتوں کے اضافہ سے جو ہوتا ہے وہ درست نہیں۔

1984ء اور 1989ء کے درمیان برطانیہ میں مکانوں کی خرید کے لئے واجب الادا قرضے 110 فیصد سے بھی زیادہ بڑھ کر 108 ارب پونڈ سے 258 ارب پونڈ ہو گئے۔ اسی اثناء میں مکان کی رہن کے لئے اوسط قیمت کا مردوں کی اوسط آمدن سے تناسب 1:3.25 سے بڑھ کر تقریباً 1:4.5 ہو گیا۔ جنوب مشرق میں جہاں قرض کی سرمایہ کاری سے مالی قیاس آرائیوں کا بازار پوری طرح گرم تھا وہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مکان کی اوسط قیمت 1984ء میں 37,334 پونڈ تھی جو بڑھ کر 1989ء میں 81,365 پونڈ ہو گئی اور رہائشی زمین کی اوسط قیمت اسی علاقے میں 1984ء میں 397,800 پونڈ ہیکٹر فی (1000 مربع میٹر) سے بڑھ کر 1989ء میں 895,000 پونڈ ہو گئی۔ تاہم 1992ء میں رہائشی زمین کی اوسط قیمت جنوب مشرق میں گر کر 74,347 پونڈ ہو گئی تھی جو 1990ء میں 636,500 پونڈ فی ہیکٹر تھی۔

ابتداء میں قوتِ قرض یعنی لیوریج کے ذریعے خریداری کرنے کے بعد اب جب کہ بہت زیادہ سودی خرچے ادا کرنے پڑے تو جو لوگ استطاعت سے زیادہ قرض لے چکے ہوتے ہیں عدم ادائیگی کا شکار ہونے شروع ہو گئے۔ بہت سی جائیدادیں کونسل آف مارگیج لینڈرز (Council of Mortgage Lenders) نے ضبط کر کے واپس لے لیں۔ ان کی تعداد 1989ء میں 15,800 سے بڑھ کر 1990ء میں 43,900 اور پھر 1991ء میں 75,500 ہو گئی۔ یہ تفریط قرض (Debt- Deflation) کے نتائج کی صرف ایک مثال ہے۔

فنی تجزیہ (Technical Analysis) پر پپر کی تنقید کا اطلاق کم مدت کے لئے تو ہو سکتا ہے مگر مارکیٹ کی اصلاح کے لئے کم مدت بھی اتنی لمبی ہو سکتی ہے جو بہت تباہ کن ہو۔ خیراتی تنظیم "Shelter" نے تخمینہ لگایا تھا جس کے مطابق 100,000 کم قیمت والے مکان مستقل طور پر ہر سال درکار تھے

تاکہ کم قیمت کے مکانوں کی بڑھی ہوئی ضرورت پوری ہو سکے۔ جب 1994ء کے آخر میں 127,290 خاندان جو بے گھر تھے اور 419,890 لوگ جن کے رہن کی کئی ماہ کی ادائیگیاں عدم ادائیگی کے باعث اکٹھی ہو چکی تھیں اور لاکھوں ایسے لوگ جو منفی منصفانہ شراکت کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے سب کے سب کو ایسے مکانوں کی ضرورت تھی تو 1980ء کی دہائی کی تیزی نے ان لوگوں کے لئے کیا کیا؟ مذکورہ بالا آزاد مارکیٹ کا طریقہ کار اگر کارفرما ہو تو کوئی بھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے تحت مادی وسائل اور انسانی محنت کا درست استعمال ہوا ہے۔ اس معاشی کھیل کے کچھ کھلاڑی دوسروں سے زیادہ قصور وار ہوتے ہیں اور کچھ بعد میں زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ مگر کچھ تو بچارے اس کھیل میں حصہ نہ لے کر بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔ مثبت قدری اضافہ والے عامل (Agent) کو جس نے مالی قیاس آرائی کی خوشحالی میں حصہ نہ لیا یا نہ لے سکا اسے بھی ایسی زری تنگی کے اثرات کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے جن کا مقصد ایسے حالات کو درست کرنا ہے۔ ایک دفعہ جب کاروبار انتہائی کم قیمت پر بیچ دیا جائے تو پھر تاجر بعد میں اسے دوبارہ نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ کارخانہ و ملازم اور ہنر جو سالوں میں اکٹھے کئے گئے ہوں جب یکدم بکھر جائیں تو گاہک فوراً نئے صنعتکار ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور شہرت (Goodwill) کی دیگر شکلیں ہوا ہو جاتی ہیں۔ ہر تاجر جانتا ہے کہ بالکل ابتدا سے کاروبار شروع کرنا آسان کام نہیں۔ کامیاب طویل المدت کاروبار تھوڑے سے عرصہ میں استوار نہیں ہو سکتا چونکہ گاہکوں کا اعتماد اور موزوں مصنوعات کی پیداوار پیدا کرنا سب وقت مانگتے ہیں۔ کار کا نیا ماڈل، کمپیوٹر کا نیا چپ (Chip)، نیا جہاز، نئی دوا اور بیشمار ایسی اور مثبت قدری اضافے والی مصنوعات طویل المدت ذمہ داری اور محنت طلب کرتی ہیں۔ درحقیقت طویل المدت نقطہ نظر سے کاروبار کے لئے استحکام نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ معیشت میں ایسی تیزی جس میں گاہک کی خواہشات مکمل طور پر پوری نہ ہو سکیں اور جس کا انجام دیوالیہ پن ہو بیکار ہے۔

کامیاب اور فوری نفع کا طالب مالی قیاس آرائی کرنے والا تو معیشت میں ایسی تیزی پسند کرے گا جس قسم کی تیزی نے ماضی قریب میں اینگلو سیکسن معاشیات کو مشکل میں ڈالا اور قلیل المدت مالی قیاس آرائی والے منصوبے ان لوگوں کو پسند ہوں گے جو رہن پر سرمایہ کاری کریں اور سیولت کی

قدر کریں۔ مگر اس قسم کی کارروائی ایسی صنعت پیدا کرنے کی ترغیب نہیں دیتی جو آخر کار مستحکم ملازمت اور مثبت قدری اضافہ پیدا کرے۔ تخلیق دولت کے لئے معاشی استحکام کی اور ساتھ ہی سرمایہ کار کی طویل المدت پابندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے سرمایہ کار کو وہاں سرمایہ لگانا چاہیے جہاں نظریات اور قابلیت ہونہ کہ صرف رہن ہی رہن ہو۔ جدید سرمایہ کاری میں ایسی باتوں کا ذکر سننے میں نہیں آتا مگر یہ اس لئے بھی نہیں کہ اس شعبے میں ذہانت کی کمی ہے کیونکہ مالیاتی شعبے میں اچھی تنخواہوں نے بہت سے قابل ذہن اپنی طرف کھینچ لئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشی نظام کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے جو مضر ترجیحات کو غالب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ڈسکاؤنٹنگ کی نوعیت، نجی تخلیق زر، زر پالیسی اور بینکوں کے قرض دینے کے معیار نے کبھی انتخابات کے نعروں میں اہمیت حاصل نہیں کی اگرچہ یہ سب کے سب عناصر جدید معیشت میں ہر فرد کی زندگی پر مسلسل اور قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ مائیکل راؤ باہتم (Michael Rowbotham) لکھتا ہے:

”قرض پر مبنی مالی نظام کے اندر قیمتیں ادا کرنے اور قرض کی ادائیگی کی جدوجہد عالم قسم کا دباؤ پیدا کرتی ہے جو صنعت، زراعت اور ملازمت پر چھا جاتا ہے۔ یہ وہ دباؤ ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے پر غالب ہے، جو ہمیں مستقل ملازمت پر مجبور کرتا ہے جو ہماری معیشت کو سبک کر کے اسے ہمیشہ تیزی کے ساتھ اضافہ پذیر شرح سے نمو اور تبدیلی پر مجبور کرتا ہے۔ جس طرح یہ دباؤ کام کرتا ہے..... اس سے لارڈ سٹیمپ (Lord Stamp) کے اس انتخاب کو تقویت ملتی ہے کہ ”اگر تم بینکروں کے غلام بننا چاہتے ہو اور اپنی غلامی کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہو تو بینکروں کو تخلیق زر کرنے دو۔“

(Rowbotham, M., "Grip of Death," 1998)



قدری تخمینے (Value Judgements)

اس باب میں معیشت کے معیاری (Normative) اور اثباتی (Positive) طریقہ ہائے کار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اثباتی معاشیات قدری تخمینوں (Value Judgements) سے آزاد ہونے کی کوشش تو کرتی ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔ معیاری معاشیات جان بوجھ کر اپنے قدری تخمینوں کو اجاگر کرتی ہے اور ان کو اپنے مباحث میں مرکزی حیثیت دیتی ہے۔ اہم ترین سوال جو اٹھایا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ”ہمارے قدری تخمینے کہاں سے آتے ہیں؟“ الہامی (Revealed) علم کا استخراجی (Deductive) علم سے موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ بتلایا گیا ہے کہ معاشی کارروائی کی بنیاد مکمل طور پر مادیت پر نہیں رکھی جاسکتی۔ اسلامی معاشیات کے قدری تخمینے متعارف کرائے گئے ہیں اور مختلف معاشی پالیسیوں پر ان کے اثرات بیان کئے گئے ہیں۔

معیاری اور اثباتی طریقہ کار

(Normative and Postive Approach)

رانج الوقت روایتی معاشیات قدری تخمینوں سے اپنی آزادی پر زور دیتی ہے۔ اس کے تجزیے میں اثبات کا انداز ہے۔ اس لئے اس کا مقصد جن سوالات کا جائزہ لینا ہے وہ ”کیا ہوگا اگر.....؟“ کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً اثباتی ماہر معاشیات پوچھ سکتا ہے کہ ٹیکس کی اشراح کے اضافہ سے محاصل پر کیا اثر پڑے گا۔ دوسرا طریقہ کار اس کے برعکس ہے جس میں مخصوص قدری تخمینوں کو اجاگر کر کے انہیں

مختلف معاشی نسخوں کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہے معاشی تجربے کا معیاری طریق کار جس کا تعلق جن سوالات سے ہے وہ ”کیا ہونا چاہیے.....؟“ کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً معیاری ماہر معاشیات سوچے گا کہ ٹیکس کے محاصل کے ذریعے دولت کی تقسیم نوکس حد تک کی جاسکتی ہے۔

جو معاشیات اثباتی تصور کی جاتی ہے وہ اگرچہ قدری تخمینوں سے آزادی کا تاثر دیتی تو ہے اس کے باوجود اس کے بھی اپنے کچھ قدری تخمینے ہیں۔ مثلاً بینتھم (Bentham) کہتا ہے کہ انسان اصراف سے زیادہ سے زیادہ منفعت (Utility) حاصل کرنے کی تمنا پوری کرنے کی خاطر مصروف عمل ہے جب کہ سمٹھ (Smith) اور رکارڈو (Ricardo) جیسے روایتی ماہرین معاشیات کے خیال میں معاشی کارروائیوں کا محرک نفع (Profit) کمانا ہے۔ مگر ایسے وسیع تر مفروضوں کو اثباتی سوچ والا ماہر معاشیات مشکل سے ہی برداشت کرے گا۔ پھر بھی جدید معاشی انسان (Economic Man) کی نظر میں انسان کے مصروف عمل ہونے کے پیچھے اس کی اپنی مادی دولت کو بڑھانے کی خود غرض خواہش ہی کارفرما ہے۔ اس میں خیرات یا ضمیر کی بیداری اور اخلاقیات کی کوئی گنجائش نہیں۔

مینگر (Menger) اور والرس (Walras) جیسے نوکلاسیکی (Neo-Classical) ماہرین معاشیات کے قدری نظریے کے بیانات میں قدری تخمینے کی ایک اور مثال بھی ملتی ہے۔ ایک شخص جو ریگستان میں گم ہو گیا ہو وہ سونے کے ٹکڑے کے مقابلہ میں پانی کے گلاس کی کہیں زیادہ قدر کرے گا اور اس کی سونے سے زیادہ قیمت ادا کر دے گا۔ هامشی منفعت (Marginal Utility) کا نظریہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت کا تعین صارف ذہنی طور پر کرتا ہے نہ کہ اس چیز کے پیدا کرنے کی لاگت سے کیا جاتا ہے جیسا کہ گزشتہ ماہرین معاشیات کا خیال تھا۔ چنانچہ ہر پانی کے گلاس کی منفعت ہی اس کی قیمت کا تعین کرے گی۔ جہاں پانی کثرت سے ملتا ہو وہاں اس کی قیمت تو اگرچہ زیادہ نہ ہوگی مگر ریگستان میں.....

منفعت کا نظریہ رکھنے والوں کے کچھ اپنے مفروضے تھے۔ ایک یہ کہ کسی ایک صارف کے لئے کسی چیز کی منفعت دوسروں کی نظر میں اس چیز کی منفعت پر منحصر نہیں ہوتی اور یہ کہ منفعت کا تعین صرف بیرونی عوامل کرتے ہیں۔ مگر اکثر طور پر ایک کی منفعت اور دوسرے کی منفعت آپس میں ایک

دوسرے پر منحصر ہوتی ہیں۔ مثلاً فیشن کے رجحانات کو لیجئے اس میں ایک صارف کی ترجیحات دوسروں کی ترجیحات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ منفعت پر اندرونی عوامل بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً 1000 پونڈ یومیہ اجرت آج کسی کے لئے اگر پریشی معیار زندگی مہیا کرتی ہے تو کچھ عرصہ بعد جب وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اتنی اجرت پھر ضرورت بن جاتی ہے اور اسی اجرت سے تسکین کم ہو جاتی ہے اور اسی شخص کی ضروریات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کل وہ ایک کار لینے کا خواب دیکھتا تھا اور آج دو کے دیکھتا ہے۔ اسی طرح آج کی منفعت گزرے ہوئے کل کے اصراف سے متاثر ہوتی ہے۔ مگر چونکہ گزشتہ کل کا اصراف گزشتہ کل کی منفعت سے متعین ہوتا ہے اس لئے علت و معلول کا یہ سلسلہ اندرونی طور پہ کام کرتا ہے۔ منفعت سے اصراف کا تعین ہوتا ہے اور اصراف سے منفعت کا۔

قدر سے آزاد (Value Free) اثباتی معاشیات درحقیقت قدروں سے آزاد نہیں۔ قدری تخمینے ایک حقیقت تو ہیں مگر فوری طور پر نظر نہیں آتے۔ معیاری معاشیات کا ماہر ہمیں بتلاتا ہے کہ ”ہماری معاشی زندگی میں کیا ہونا چاہیے“ کا تعین کئے بغیر ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اسے کیسے حاصل کرنا ہے۔ ”کیا ہونا چاہیے“ کے تعین کے لئے ہم مجبور ہوتے ہیں کہ قدری تخمینے معلوم کریں۔ پھر مسائل یہ پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں کہ قدری تخمینے لگانے کا اختیار کس کو دیا جائے۔

الہامی علم اور استخراجی علم

(Revealed Knowledge and Deductive Knowledge)

بہت سے مذہبی فرقوں کا عام خیال ہے کہ اہم قدری تخمینوں کے بارے میں الہی احکامات ہمارے پاس پہلے ہی سے نازل شدہ ہیں۔ یہ اس لحاظ سے تسکین کا باعث ہے کہ جھگڑوں اور ذہنی پریشانی کی کم از کم ایک بنیاد تو ختم ہوئی ورنہ انسان کو اپنے لئے ایسے تخمینے خود لگانا پڑتے۔ دوسروں کے نزدیک یہ بات محض انسانی ذہانت کی ذمہ داری سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔

وہ طرز خود ہی ہدف تنقید ہے جس پر جدید قدری نظام استوار کئے گئے ہیں۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے اجلاس میں مختلف گروہوں کی آپس میں جھڑپیں اس کی ایک بہت اچھی مثال پیش کرتی ہیں جن کے قدری تخمینے ایک دوسروں کے برعکس ہوتے ہیں۔ کاروباری لوگوں کے حقوق کی حمایت کی جائے یا

غریب لوگوں کے حقوق کی؟ یہ سرمایہ داروں اور اشتراک پسندوں کے مابین مثالی جھگڑے کی ایک سادہ شکل ہے جس کی بحث پر سیاستدانوں کا زیادہ وقت خرچ ہوتا ہے۔ مخالف قدری تخمینے قانون سازی کی راہ میں شدید رکاوٹ بن سکتے ہیں کیونکہ بعض اوقات تو پالیسی کا مقصد ہی واضح نہ ہونے سے اس کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔

جہاں پہلے کبھی مذہبی دستور چلتا تھا اب اسے غیر مذہبی (Secular) بنیاد پر قائم کرنے سے ہمارے لئے قدری تخمینوں کا الہی اختیار سیاستدانوں نے غصب کر رکھا ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے اور اس کا سرکار کے روزمرہ کے معاملات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی معاشیات کے ساتھ بھی اس کا کوئی رشتہ ہے پھر بھی سوال یہ ہے کہ سیاستدانوں کے قدری تخمینوں ہی کو بھلا کسی قسم کا اعزاز کیوں بخشا جائے؟

اپنی زندگیوں پر حکمرانی کے لئے ہم خود اپنے قدری تخمینوں کو اپنائیں یا اس کے جو الہی ہستی سمجھی جاتی ہے یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنا ہے۔ یہاں جھگڑا دو گروہوں کے درمیان ہے۔ ایک کا ایمان ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ خواہ یہ طبعی کائنات کے متعلق ہو سیاست کے میدان میں ہو یا ہماری معاشرتی اور معاشی زندگی کے لحاظ سے ہو۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مذہب ہماری زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے غیر مذہبی (Secular) معاشرے میں سائنس کے پیروکاروں اور مذہب کے پیروکاروں کے مابین یہ بحث چلتی ہی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں سائنس نے مذہب کو غلط ثابت کر دیا ہے اس لئے مذہبی رہنمائی کو بلا خوف و خطر نظر انداز کیا جاسکتا ہے لہذا وہ اقدار جو انجیل سے اخذ کی گئی ہیں ان کی اہمیت کسی انسان سے لی گئیں اقدار سے کچھ زیادہ نہیں۔

جہاں تک مغربی لوگوں کے خیال کا تعلق ہے ڈاکٹر مارلیس بو کے (Dr. Maurice Bucaille) کہتا ہے کہ سائنس اور مذہب کے مابین تضاد کے مفروضہ کی زیادہ وجہ انجیل کے متن کے اندر تضادات ہیں۔ چونکہ اکثر لوگوں کے نزدیک انجیل مذہب کی نمائندگی کرتی ہے اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب موجودہ سائنسی علم سے مطابقت نہیں رکھتا:

”پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حبرک الہامی عبارت کے معبر ہونے کے لئے الہامی کتابوں اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہ اصول سینٹ آگسٹین (Saint Augustine) نے اپنے خط نمبر 82 میں وضع کیا تھا۔ مگر جوں جوں سائنس نے ترقی کی اور یہ واضح ہوتا گیا کہ بائبل اور سائنس کے درمیان اختلاف ہے۔ تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں میں موازنہ ہی نہ کیا جائے۔ تاہم ان اختلافات اور بعید از قیاس باتوں نے مجھے خدا پر ایمان سے دور نہیں کیا کیونکہ ان کا ذمہ دار انسان ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اصلی عبارات کیا ہیں اور ان میں انسانی تخیلات نے کتنی تدوین کی ہے یا کتنا سوادا دھرا دھرا کیا گیا ہے یا کتنی غیر ارادی تبدیلی ہوئی ہے۔“

(Bucaille, M. "The Bible, The Quran and Science", 1981, P. ix)

اسلامی دنیا کے اندر مذہبی رہنماؤں اور سائنسدانوں کے درمیان بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ طبعی علوم کے متعلق قرآنی رہنمائی اور سائنسی انکشافات میں اب تک کوئی تضاد نہیں پایا گیا۔ قرآن ہمیں یہ نہیں کہتا کہ ہم اپنی بنیادی سائنسی معلومات سے بالکل انکار کر دیں جیسے یہ کہ خدا نے زمین پر سورج پیدا کرنے سے پہلے سبزہ اگایا (Genesis 1:1)۔ اس کے برعکس سائنس کے دائرہ علم میں قرآنی رہنمائی تو جدید سائنسی انکشافات سے بھی بہت قدیم ہے۔ جدید فلکیات اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ آسمان اور زمین کبھی ایک وقت میں جڑے ہوئے تھے اور یہ کہ عالم کائنات پھیل رہا ہے۔ (الانبیاء 30:21)۔ اور یہ کہ سورج بھی اپنے ایک مدار میں گردش کر رہا ہے (یس 40:36)۔ جس وقت انیسویں صدی کے سائنسدان انسانی پیدائش کے متعلق ناقابل یقین نظریے پیش کر رہے تھے اسلام کے پیروکار اس سے بھی پہلے جانتے تھے کہ یہ مرد کا نطفہ ہے جو بچے کی جنس (مذکر یا مؤنث ہونے) متعین کرتا ہے۔ (النجم 45-46:53)

قرآن کی سائنسی معلومات اس وقت نازل ہوئیں جب انسانی سائنس نے مذکورہ بالا انکشافات ابھی نہیں کئے تھے۔ یہ انکشافات خدا کی موجودگی کا حتمی ثبوت تو نہیں مگر غیر مذہبی (Secular) سائنسدان ان انکشافات کی کوئی وضاحت پیش کریں تو دلچسپی کا باعث ہوگی۔

مسلمان قرآن کو الہی کلام ہونے کا یقین رکھتے ہیں چنانچہ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اسلام کے تحت مطالعہ کا طریقہ کار استقرائی (Inductive) اور استخراجی (Deductive) دونوں طریقوں کو کیوں اکٹھا کرتا ہے۔

استخراجی طریقہ کار میں عمومی مشاہدے سے خصوصی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ ”A سبب ہے B کا

اور B سبب ہے C کا۔ اس لئے A سبب ہے C کا۔“ یہ ہے استخراجی سوچ۔ مثلاً تمباکو نوشی سے پھپھڑوں میں تارکھل داخل ہوتی ہے اور مشاہدہ ہے کہ تارکول سے پھپھڑوں کا سرطان پیدا ہوتا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ تمباکو نوشی سرطان پیدا کرتی ہے۔ یہ ہے سائنسی طریقہ کی بنیاد جس نے انسانیت کو بہت فائدے پہنچائے ہیں۔

استخراجی سوچ جو ہمارے گرد دنیا کے مشاہدے پر مبنی ہے ہمیشہ ہی غلطی سے محفوظ نہیں ہوتی۔ استخراجی علم حاصل شدہ معلومات میں تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اپنی ارد گرد کی دنیا کے متعلق ہمارا ادراک محدود ہے۔ جیسا کہ آرمراد (Ormerod) کہتا ہے کوپرنیکس (Copernicus) اور کلیسا ایک ہی معلومات کا تجربہ کر کے مختلف نتائج پر پہنچے ہیں۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے تو یقیناً سورج زمین کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ یہ کلیسا کا خیال تھا۔ کوپرنیکس نے کہا نہیں، یقیناً زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

استقرائی سوچ میں خصوصیت پہلے اور عمومیت اس کے بعد آتی ہے۔ ”A اور B درست ہیں اس لئے C بھی درست ہے۔“ یہ استقرائی سوچ ہے۔ قرآن کی فلکیات کے بارے میں معلومات سائنسی معلومات کی تائید کرتی ہیں اور ایسا ہی حیاتیات کے متعلق بھی ہے۔ چنانچہ قرآن خدا کی طرف سے ہونا چاہیے۔

استقرائی طریقہ کے اوپر اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ سائنسی طریقہ کار جیسے استخراجی طریقہ کا اس میں فقدان ہے۔ تاہم کئی ایسے امور ہیں جو سائنسی طریقہ سے دریافت نہیں ہو سکتے۔ ان کے لئے خدا کا نازل شدہ علم ہی ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ وہی مکمل ہے اور یہ نازل شدہ ہدایت ہے اس کی پیروی کرنے سے انسان کو مشکل طریقہ سے سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

سود کے بارے میں مسلمانوں کا انداز فکر مخالفانہ ہے کیونکہ اسلام سود کے خلاف ہے۔ سود معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے اور یہ الہامی علم کا حصہ ہے۔ انسان الہی سوچ کی گہرائی تک نہ بھی پہنچ سکے تو پھر بھی الہی رہنمائی کی صداقت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی معاشیات کے عالمی نظریہ کے لئے ضروری ہے کہ قدری تخمینے جو مذہبی ذہن کے مطابق ہیں

اور وہ قدری تخمینے جو غیر مذہبی ذہن کے مطابق ہیں ہم ان دونوں کے درمیان فرق کو سمجھیں۔ اگر بعد الموت زندگی ہے، خدا بھی ہے، یوم حساب ہے اور دنیا کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا بھی ہوگی، تو یقیناً ہمیں ان سب کو اپنے معاشی تجزیہ میں شمار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر زندگی بعد الموت نہیں تو پھر ہم اس دنیا میں اپنے سوالات کے جوابات کی تلاش اپنے راستے پر چل کر اپنے ہی طور پر کر سکتے ہیں۔ جہاں ہر شخص کو دوسرے سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر یہاں مطلق سچائی اکثر نہیں مل سکتی اور نہ ہی اس صورت حال سے سکون ہی ملتا ہے۔ تاہم جدید معاشیات خدا پر ایمان کو کوئی حیثیت نہیں دیتی جس پر اربوں لوگ یقین رکھتے ہیں۔ قدری تخمینے اگر معاشی کارگزاری کی اطلاع دے سکتے ہیں تو معاشی تجزیہ کی معلومات وہ کیوں نہ دیں گے؟ اس کتاب کے بقیہ حصہ میں میں (مصنف) صرف اسلامی قدری تخمینوں سے اپنے خیالات کے اظہار کی ابتدا کریں گا۔

اسلامی معاشیات کے بنیادی اصول

(The Foundations of Islamic Economics)

دیباچے میں لکھا جا چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظریات جو عالمی سطح پر اس وقت پروان چڑھ رہے ہیں ان کے لئے اسلامی معاشی نظریات مسلمہ طور پر غالباً ایک فیصلہ کن مخالف حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اسلامی ماہرین معاشیات کوئی نئی چیز تو پیش نہیں کر رہے۔ بہت سے مغربی اصول بنیادی طور پر اسلامی تصورات ہی کا حصہ ہیں۔ کئی مغربی اصول تو اسلام ہی سے مستعار لئے گئے ہیں یا پرانی اسلامی دنیا سے رابطہ کے ذریعہ آئے ہیں۔

اسلامی قوانین کے لئے قرآن قطعی اور فیصلہ کن ماخذ ہے۔ کسی بھی حالات میں قرآنی احکامات کی نفی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی اور ذریعہ سے منسوخ ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم محمد ﷺ کا قول و فعل جو سنت کہلاتا ہے اور احادیث میں تحریر شدہ ہے اسلامی اصولوں کے انضباط کے لئے دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ رسول کریم محمد ﷺ کے دور میں جنہوں نے احادیث زبانی یاد کی ہوتی تھیں وہ انہیں آگے زبانی ہی بیان کرتے تھے۔ اس دور میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی۔ رسول کریم محمد ﷺ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد لاکھوں احادیث کو جن میں کچھ

متضاد بھی تھیں پر کھنے اور اکٹھا کرنے کا بیڑا تدوین کرنے والوں اور سیرت نویسوں نے اٹھایا۔ سب سے زیادہ مستند مجموعے صحاح ستہ کہلاتے ہیں جو یہ ہیں۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ۔

احادیث ہمیں بتلاتی ہیں کہ رسول کریم محمد ﷺ نے فرمایا۔ ”..... میرے جانے کے بعد تمہارے اندر اختلافات پیدا ہوں گے۔ جو کچھ میرے متعلق منسوب کیا جائے اس کا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ موازنہ کرو جو اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو اسے میری طرف سے تسلیم کر لو اور جو مخالفت میں ہو اسے موضوع سمجھ کر رد کر دو۔“ بعد میں ایسے باقاعدہ طریقہ ہائے کار وضع ہوئے جن کے مطابق احادیث کو صحت کے اعتبار سے پرکھا جاتا تھا۔ مثلاً حدیث بیان کرنے والے کی سچائی اور نیکی کو دیکھا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ بیان کرنے والوں کے سلسلہ (اسناد) کو سامنے رکھ کر حدیث کی صحت کا تعین کیا جاتا تھا۔

اسلامی علماء کو ایسا مسئلہ بھی درپیش ہو سکتا ہے جس کے متعلق خصوصیت کے ساتھ قرآن اور سنت میں رہنمائی نہ ملتی ہو۔ ایسے معاملات میں وہ اجتہاد کر کے ان امور کے متعلق امت مسلمہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ایسی قانون دانی کو فقہ کہتے ہیں اور کسی مسئلہ پر فیصلہ دینا فتویٰ کہلاتا ہے۔ فقہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ علماء میں اجماع پایا جائے اور دوسرا طریقہ قیاس ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جہاں حکم لگانے کا تعلق ہو وہاں فقہاء اس کی وجہ یعنی علت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی بنا پر حکم لگایا جائے۔ علت پر اختلاف ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے فقہاء کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہوگا۔ اگرچہ یہ بات انسانی ذہن سے ماوراء ہے پھر بھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حکم کے پیچھے حکمت کیا ہے کچھ جائزے لینے پڑتے ہیں۔ مثلاً حکم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ اس میں حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ باقی لوگ چوری کرنے سے ڈر جائیں اور دنیا رہنے کے لئے ایک محفوظ جگہ بن جائے۔ اس کی علت یہ ہے کہ ایک مخصوص نصاب سے زائد کسی کا مال چوری کیا ہو۔ یہ نصاب ایک فقیہ کے مطابق دو سے دس درہم کے درمیان یا ایک چوتھائی دینار کے برابر ہے۔ چنانچہ روٹی کے ایک ٹکڑے کی چوری سے مذکورہ سزا جاری نہ ہوگی کیونکہ علت پوری نہیں ہوئی۔

شریعت، جس کو عموماً اسلامی قانون کہتے ہیں، میں وہ قوانین بھی ہیں جو قرآن اور سنت سے واضح

طور پر ثابت ہیں اور وہ قوانین بھی جو اجماع اور قیاس سے مرتب کئے گئے ہیں۔ سنی مسالک چار ہیں۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ یہ مسالک چار علیحدہ اسلام پیش کرنے کے لئے قائم نہیں ہوئے۔ وہ صرف حاصل شدہ رہنمائی کی تحقیق کے چار طریقے ہیں۔ (ایک اقلیت شیعہ مسلک کی بھی ہے مگر اسے اس کتاب میں زیر موضوع نہیں لایا گیا۔)

صرف معاشی دائرہ کے لئے ہی نہیں بلکہ عمومی طور پر اسلام ہر انسانی دائرہ عمل کے لئے ضابطہ پیش کرتا ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جو اپنے قدری تخمینے اجاگر کر کے انہیں پوری انسانیت کے لئے بنیاد قرار دیتا ہے جو تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ وہ ہیں عقیدہ یعنی ارکان دین جن پر مسلمانوں کا ایمان قائم ہے۔ اخلاق یعنی اخلاقیات کا ضابطہ اور تیسری شریعت ہے۔ شریعت کے دو پہلو ہیں۔ عبادات (عبادات کا ضابطہ) اور معاملات (ضابطہ معاشرت)۔

عقیدہ ایمان کے چھ ارکان پر مشتمل ہے۔ وہ ہیں توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا، یوم حساب پر ایمان، الہی کتابوں پر ایمان، نبیوں پر ایمان، ملائکہ پر ایمان (جو اللہ کے احکامات بجا لاتے ہیں) اور قضا و قدر پر ایمان۔

اسلام میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے۔ عبادت کی دوسری صورتیں خواہ انسان پوجا کی شکل میں ہو مادی ملکیت یا اپنی شہرت کی پوجا کی شکل میں ہو سب اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ اگر مادیت کو مذہب تصور کیا جائے تو یہی تو وہ مذہب ہے جس کو اسلام مٹانا چاہتا ہے۔

یوم حساب کو ہر انسان کی زندگی کا نامہ اعمال اس کے سامنے لایا جائے گا جو اس کی حمایت میں یا اس کے خلاف شہادت دے گا۔ گزشتہ اعمال کے مطابق قطعی انصاف اللہ تعالیٰ کریں گے۔ اسلام میں یہ دنیوی زندگی صرف ایک امتحان ہے جس کا انعام دائمی جنت ہے۔ یہ انعام لامحدود ہے جس کی قیمت سرمایہ کی شکل میں نہیں لگ سکتی اور نہ ہی کسی طرح اسے روایتی معاشی تجزیہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ انعام واقعی کوئی وجود رکھتا ہے تو پھر ایسے مادی نظاموں کا جواز کہاں ہے جو دنیوی مفاد اور دولت کو زیادہ سے زیادہ تر کرنے کے انسانی محرکات کی بنیادوں پر استوار کئے گئے ہیں۔

خدا کی طرف سے الہامی کتابیں بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے اتاری گئی ہیں۔ انسان چونکہ بطور خود بے عیب نہیں اس لئے اس کے بنائے ہوئے قوانین بھی بے عیب نہیں ہو سکتے۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی ممکن ہے اور وہ منسوخ بھی ہو سکتے ہیں اور اکثر اوقات قانون دانوں کے اپنے مفاد کے حصول کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسلام کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لئے آخری وحی ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ اسی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے کئی نبی مبعوث کئے جن میں نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام شامل ہیں جو سب کے سب قابل تعظیم ہیں۔ اسی لئے دوسرے مذاہب میں اسلام کے کئی قوانین موجود ہیں۔ اسلام کا یہ دعویٰ نہیں کہ سچائی پر اسی کی اجارہ داری ہے بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وقت کے ساتھ دوسرے مذاہب میں دی گئی ہدایت کے اندر جو انسانی گڑبڑ کی گئی یہ اس سے آزاد ہے۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں کہ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی بشمولیت ممانعت سود کئی اسلامی نواہی کو مانتے ہیں۔

اسلامی عدالت میں معاملات کے متعلق حرام کام قانون کے تحت قابل سزا ہیں۔ کبیرہ حرام کاموں میں قتل، زنا کاری، چوری، منشیات کا استعمال، نجومی عملیات اور سود شامل ہیں۔ قطع نظر کسی قسم کے فائدہ کے جو ممکنہ طور پر ان سے حاصل ہو سکے ایسے کاموں میں بلا واسطہ یا بالواسطہ ملوث ہونا ہر طرح سے منع ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ نتیجہ ذریعے کا جواز نہیں۔ درحقیقت رسول کریم محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اچھائی صرف اچھائی کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔“ اس لئے اسلام کے اندر ذریعہ نتیجہ کا جواز ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں ضرورت کے تحت مذکورہ بالا نواہی میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً جہاں جان کا خطرہ ہو وہاں بقدر ضرورت حرام خوراک کھا لینا جائز ہے۔ جو کام حرام نہیں کئے گئے وہ خود بخود ہی حلال تصور کئے جاتے ہیں۔

عقیدہ اور معاملات میں ان قدری تخمینوں کو پہچاننے سے ابتدا کرنا چاہیے جو اسلامی معاشی نظام کی خبر دیتے ہیں۔ محمد ہیکل (Haykal) اپنی کتاب ”دی لائف آف محمد ﷺ“ میں تحریر کرتا ہے کہ وہ معاشرہ جس کی معاشیات میں ایمان کا عنصر شامل نہ ہو انسانیت کے لئے خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

محنت کش سرمایہ دار کے سامنے ہو یا تاجر اشتراکیت پسند کے سامنے ہو مادی معاشیات کا نظریہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے مددگار کے بجائے بطور حریف کھڑا کرتا ہے ہیکل کا کہنا ہے۔

”مغرب میں مادی سوچ کی فتح معاشی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل کی وجہ سے ہوئی۔ اس صورت حال سے ایسے نظریات نے جنم لیا جنہوں نے انسان کی زندگی کا ہر شعبہ معاشی قوتوں کے رحم و کرم کے تحت کر دیا۔“

یہ درست ہے کہ مادی دولت کسی شخص کی خوشی میں تھوڑے عرصہ کے لئے اضافہ کا باعث بنتی ہے پھر یہ بھی عجب نہیں کہ زیادہ سے زیادہ مادی دولت ہی روایتی معاشی پالیسی کا مقصد بن جاتی ہے۔ شاید اسی لئے اب لوگ صرف خرید و فروخت کے نشہ میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام انسان کے کاموں کو ایک ضابطے کے تحت لانے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی اپنے اظہار کا موقع دیتا ہے۔ ہیکل (Haykal) کہتا ہے کہ اسلام انسان کو ذاتی دولت اکٹھا کرنے کی خواہش سے منع نہیں کرتا۔ اس کے تحت اس خواہش کو انسان پر ہر لحاظ سے سوار نہیں ہونے دینا چاہیے جیسا کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہوتا ہے اور نہ ہی اشتراکی مشورے کے مطابق اس خواہش کو بالکل ہی دبا دینا چاہیے۔

مشیت الہی کے مطابق اسلام کے تحت دولت جمع کرنا انسانی فطرت کی ایک حقیقت ہے۔ دولت اکٹھی کرنا اور اسلام پر چلنا بعض اوقات دو متضاد خواہشوں کے درمیان ایک کشمکش ہے جو انسانی زندگی کے امتحان کی ایک شکل ہے۔ اقتدار اور دولت انسانیت کے لئے ایسے ہی آزمائش ہیں جیسے غربت اور کمزوری چونکہ اپنے اپنے لحاظ سے دونوں ہی گناہ گاری کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اس لئے سب اعمال موجودہ زندگی اور اخروی زندگی کے نتائج سامنے رکھتے ہوئے کرنے چاہئیں اور دنیوی ذاتی مفاد ہی سب کاموں کے لئے معیار نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں معاشی مفاد سامنے رکھنے والے انسان کو دوسرے مذاہب کی طرح بالکل کم مادیت پسندی والے انسان میں ڈھالا جا رہا ہے۔ دولت بذات خود برائی نہیں اور نہ ہی اسلام کہتا ہے کہ جنت صرف غریبوں کے لئے ہے۔ صرف بات اتنی ہے کہ دولت اکٹھا کرنا بذات خود ہی زندگی کا مقصد نہیں بن جانا چاہیے۔

اسلامی نظام کا مقصد دولت میں خیالی (Ideal) برابری نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دولت میں عدم مساوات جان بوجھ کر قائم کی گئی ہے اور انسانیت میں مختلف افراد کو مختلف میلان اور مدارج کے لحاظ

کے تحت دولت سے نوازنا مشیت الہی کا نتیجہ ہے۔ کوئی بھی منصفانہ پالیسی عدم مساوات کو نہیں مٹا سکتی اور نہ ہی کسی پالیسی سے ایسا مقصد حاصل کرنا پسندیدہ ہے۔ دولت میں عدم مساوات کو فطری سمجھنے کا مطلب غربت کی موجودگی کو تسلیم کرنا نہیں۔ چونکہ مشکلات سے بچنا تو ایمان کو قائم رکھنے کا ایک بنیادی اصول ہے۔

اسلام میں حکومتی پالیسی کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہے جن کے تحت لوگ اُخروی زندگی کی کامیابی حاصل کر سکیں۔ مادی اعتبار سے محض معیار زندگی بلند کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ حکومت کو چاہیے کہ وسائل کی تقسیم کی حوصلہ افزائی سب سے زیادہ اس مقصد کے تحت کرے۔ اس پالیسی کو عموماً معاشرتی بہبود یا عوامی مصالح کی پالیسی کہتے ہیں۔

انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اس نظریہ کی ترجمانی بعض یوں کرتے ہیں کہ دولت سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور انسان صرف اس کا رکھوالا ہے۔ تاہم ابن کثیر کے مطابق اس کی درست توضیح یہ ہے کہ انسان اللہ کا نائب ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کو کسی نائب کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ قادر مطلق اور حاضر و ناظر ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس بات کی ضمانت دیں کہ جن کے پاس دولت نہیں وہ بھی ضرورت مند نہ رہیں۔ دولتمندوں کے لئے یہ بھی زندگی کا ایک امتحان ہے۔

معاشرتی بہبود کے طریقہ کو زیادہ تفصیل سے سمجھنے کے لئے تین طرح کے وسائل کو جاننا ضروری ہے۔ جن کی نشاندہی الغزالی اور الشاطبی جیسے علما نے کی ہے۔ کسی حد تک ان کے طریقہ کی عکاسی مغرب کے معاشی نظریات بھی کرتے ہیں۔ مثلاً میسلو (Maslow) کا نظام ضرورت۔ اسلامی نظام میں ضروریات وہ ہیں جو زندگی کی پانچ بنیادوں کو برقرار رکھنے کے لئے لازمی ہیں۔ وہ پانچ بنیادیں ہیں: مذہب، زندگی، عقل، عزت اور دولت۔ حاجات وہ ہیں جو انسانی زندگی کے بوجھ ہلکے کرتی ہیں لیکن وہ اگر میسر نہ بھی ہوں تو گزارہ ہو جاتا ہے۔ دیگر لوازمات زندگی کے اندر باقی تمام اشیاء و خدمات آ جاتی ہیں جو زندگی کا بوجھ تو ہلکا نہیں کرتیں صرف زندگی کو چمکاتی اور خوبصورتی بخشتی ہیں۔ اس لئے انہیں سامانِ تعیش کہہ سکتے ہیں۔

اب ضرورت اور چاہت میں فرق سامنے آتا ہے۔ ایک ماہر معاشیات فہیم خان کہتا ہے کہ انسانی چاہتیں لامحدود ہیں جب کہ انسانی ضرورتیں لامحدود نہیں ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے:

”چاہت نظریہ منفعت کے تابع ہے جب کہ ضرورت اسلام میں نظریہ مصلحت و بہبود کے تابع ہے۔ شریعت کا مقصد لوگوں کی بہبود ہے۔..... مریدین کار کی منفعت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ذاتی معیار کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔..... مثلاً یہ کہ دکھانے کے لئے یہ کار اچھی ہے یا اس کا ڈیزائن اچھا ہے یا یہ اپنے ملک یا کسی پسندیدہ ملک میں تیار ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کسی چیز کی منفعت کا فیصلہ کرنے کے لئے بے شمار معیار ہو سکتے ہیں۔ مصالح و بہبود کا معاملہ ایسا نہیں۔ یہاں معیار صرف ایک ہوگا اور وہ سب کے لئے ہوگا۔ منفعت کے مقابلہ میں مصالح و بہبود کی یہ خصوصیت معاشی پالیسی کے جواز کو دوبا لا کرتی ہے کیونکہ فیصلہ کرنے کے لئے معیار پہلے ہی معلوم ہوتا ہے۔“

(Khan, F., "Essays on Islamic Economics", 1985, P. 36)

مسلم علماء کہتے ہیں کہ حکومت کی معاشی پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ دونوں سرکاری اور نجی وسائل کی تقسیم میں پہلی ترجیح ضروریات کو ملے پھر حاجات کو اور پھر ان کی نفاست کو۔ اگر اسے اپنے طور پر چھوڑ دیا جائے تو مارکیٹ کا طریقہ کار ہی ایسا ہے کہ عملی طور پر کام کے بدلے میں دولت ملتی ہے۔ مگر یہ تقسیم ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ امیر لوگوں کی پر تعیش رہائش گاہیں جو غریب اکثریت کے درمیان واقع ہوں مذکورہ بالا اصولوں کی واضح طور پر نفی کرتی ہیں۔ وسائل کی ایسی تقسیم معاشرتی بہبود کو تو نہیں بڑھاتی بلکہ غریبوں میں رنجیدگی پیدا کر کے اسے کم ہی کرتی ہے۔ اس لئے حکومت کی وسائل کی تقسیم میں دخل اندازی کا جواز نکلتا ہے۔

مالٹھس (Malthus) والا جنون اسلام میں نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی، فضائی ماحول اور آبادی نے قدرتی طور پر معیشت کی تخلیق دولت کی استعداد پر حد قائم کر رکھی ہے۔ مگر قدرتی وسائل کے محدود عطیہ کے باعث جو پابندیاں عائد ہونی چاہئیں وہ بہت کم منظر پر آتی ہیں۔ وسائل کے خاتمہ کی ہولناک پیشگوئیاں کئی دہائیوں سے ہو رہی ہیں۔ کرسٹوفر بوکر (Christopher Booker) 29 مئی 1994ء کے سنڈے ٹیلیگراف میں لکھتا ہے:

”مثلاً 19 اپریل کے دن ہاؤس آف کامنز (House of Commons) کو اطلاع دی گئی کہ 1992ء کے دوران تازہ ترین

اعداد و شمار کے مطابق ہم نے 40,503 ٹن گوبھی، 49,370 ٹن ٹماٹر، 154,943 ٹن مائے اور 336,992 ٹن آڑو اگانے اور انہیں پھر ضائع کرنے پر پیسے خرچ کئے۔ اس کا مطلب ہے 4 ارب آڑو ضائع کئے گئے۔ یعنی سال کے ہر دن میں تقریباً

1000 ٹن زیادہ تر یونان کی زمین میں جا کر دفن کئے گئے۔ چنانچہ اس کے متعلق سرکاری وزیر مائیکل جیک (Michael Jack) نے پارلیمنٹ کے اراکین کو یقین دہانی کرائی کہ سرکار شدت کے ساتھ اس کی مذمت کرتی ہے اور یورپین کمیشن پر پوری شدت کے ساتھ اس کے متعلق بنیادی اصلاحات لانے کا دباؤ ڈال رہی ہے۔ مگر سیاستدان کئی دہائیوں سے ایسے بیانات تو دے ہی رہے ہیں اور اس دفعہ بھی کچھ نہیں ہوگا۔“

آج کل سنتے ہیں کہ غریب ملکوں کو زیادہ آبادی سے نجات حاصل کرنے کے طریقے بتلائے جا رہے ہیں کیونکہ بہت زیادہ لوگ ہونے کے باعث وسائل کم میسر ہیں اور ضرورت زیادہ ہے۔ مگر افریقہ کے صحرا کے اوسط درجہ کے رہائشی کے مقابلہ میں صنعتی ملکوں کا اوسط درجہ کا شہری دس گنا توانائی اور سات گنا گوشت صرف کرتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کو کم بچے پیدا کرنے چاہئیں؟

صنعتی ممالک

افریقہ کا صحرا

77.36

گوشت کا اخلاف (سالانہ پونڈ فی کس) 11.2

4596

توانائی کا اخلاف (سالانہ پونڈ OE فی کس) 450

1995ء میں اخلاف کا موازنہ

UNDP, "Human Development Report" 1997/1999: Lbs OE "Lbs of Oil
Equivalent as of 1994 (1000 Lbs. = 1Ton)

ماخذ:

معاشیات کی کوئی بھی ابتدائی نصابی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے محدود وسائل کے تعاقب میں لامحدود طلب کا ہونا ہی اصل معاشی مسئلہ ہے۔ مگر آج کل کا مسئلہ تو قابل تکمیل ضروریات کی عدم تکمیل ہے۔ زائد وسائل جہاں ہوتے ہیں وہاں تاریک سوچ کا مالک نظر ہی نہیں ڈالتا (بے روزگار لوگ کیا وسائل میں شمار نہیں ہوتے؟) مزید برآں خواہشات تو لامحدود ہیں مگر ضروریات نہیں ہیں۔ 1930ء کی دہائی میں یہی خیال رابرٹ ڈواین (Robert Doane) کے ذہن میں بھی تھا۔ اس نے افسوس سے کہا ہے کہ جہاں لاکھوں میل لمبی سڑکیں ہوں اور لاکھوں ایکڑ کاشتکاری کی زمین اور جنگل ہوں ایسے ملک میں ضرورت مندوں کا ہونا کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتنے کافی وسائل کے ساتھ نوازا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے یوم حساب تک میسر رہیں گے۔ ہم نے دیکھا کہ اسلام کے مطابق ضرورت

اس بات کی ہے کہ اس دولت کو ایسے تقسیم کیا جائے کہ کسی کی ضرورت باقی نہ رہ جائے۔ نجی دولت کو اسلام میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا مگر جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے ان پر کچھ شرائط بھی عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً اسلامی حکومت میں اگر کوئی شخص تین سال تک زمین کو بغیر کاشت کئے چھوڑ دیتا ہے تو وہ یہ خطرہ مول لیتا ہے کہ کہیں اس کی زمین ایسے لوگوں کے حق میں ضبط نہ کر لی جائے جو اس میں پیداوار کا انتظام کر سکیں۔ بالعموم دولت کے مالک کے لئے حکم ہے کہ وہ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے بغیر کسی قسم کی فضول خرچی کئے اور بغیر منع کردہ اشیاء و خدمات کی پیداوار پر خرچ کئے اس کو عوام کی بھلائی کے لئے استعمال کریں۔ چنانچہ دولت کے نجی مالک کو اپنی دولت کے تصرف پر ہر طرح کی کھلی چھٹی نہیں۔

تقسیم کے اسلامی نظریہ میں غالباً زکوٰۃ (لغوی طور پر پاکیزگی یا پاکیزہ کرنا) کا نظام بہت اہم ہے۔ یہ دولت پرنیکس ہے جو صرف مسلمانوں پہ عائد ہوتا ہے۔ اس کی شرح اثاثے کی نوعیت کے مطابق اڑھائی فیصد (ذاتی دولت مثلاً سونا چاندی وغیرہ) سے لے کر بیس فیصد (مثلاً کسی قیمتی خزانے کے لئے جو اچانک دریافت ہو جائے) تک ہے۔ عوامی بہبود کی ادائیگیوں کے لئے اسلامی نظام میں اس طرح کے محاصل ایک اچھا خاصا ذریعہ ہیں۔

ایک مخصوص نصاب سے زائد دولت جس کسی کے پاس بھی ہو اس کے لئے دولت کے لحاظ سے مختلف شکلوں کی زکوٰۃ دینا فرض ہوتی ہے۔ نصاب مقرر کرنے پر کچھ اختلاف ہے کہ کیا اس کی مقدار ایک ہی رہے گی یا معاشی حالات کے مطابق حکومت اسے تبدیل کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کے گزر اوقات کے حالات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ابتدائی اسلامی حکومت کے دور میں ذرائع آمدن کے معائنہ کا نظام رائج تھا۔

زکوٰۃ کے محاصل آٹھ قسم کے لوگوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ دیگر قسم کے محاصل بھی ان پر تقسیم ہو سکتے ہیں۔ دیگر قسم کے محاصل میں رضا کارانہ خیرات (صدقات) ارضی نیکس (خراج) اور سالانہ نیکس (جزیہ) شامل ہیں۔ ابتدائی اسلامی دور میں جزیہ صرف تندرست غیر مسلم مردوں سے وصول کیا جاتا تھا اور وہ فوج میں جانے سے مستثنیٰ ہوتے تھے اور ان کی حفاظت اسلامی فوج کے ذمہ ہوتی تھی۔

یہ صرف زکوٰۃ ہی تھی جو ابتدائی دور میں بہبود کے نفاذ اور اخراجات کے لئے آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

”صدقات غرباء اور ضرورت مندوں کے لئے ہیں اور ان کے لئے جو صدقات وصول کر کے اسے آگے پہنچانے والے ہوں اور نو مسلموں کے تالیف قلوب کے لئے اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے لئے اور قرضداروں کے لئے اور اللہ کے راستے میں خرچ کے لئے اور مسافروں کے لئے۔“ (التوبہ 60:9)

بہبودی نظام اس حقیقت کے مد نظر قائم کئے جاتے ہیں کہ آخر غریبوں اور امیروں کی خوشیاں کوئی علیحدہ تو نہیں ہوتیں جبکہ روایتی دولت کے حامی جن افکار پہ زور دیتے ہیں وہ ہیں مجرم کو سزا دینا، آزاد تجارتی منڈی بچانے، توانا اور کمزوروں کے مٹ جانے کے نظریات مگر دیکھا جائے تو غریبوں کے لئے سزا سے ڈرانے اور محنت کر کے آگے بڑھنے کی ترغیب دینے کی باتیں بے معنی ہیں جب تک کہ انہیں اُمید کے مواقع میسر نہ ہوں۔

بہبود کے اخراجات کے لئے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس سب سے بڑے ذرائع ہیں مگر ٹیکس کے بڑھتے ہوئے بوجھ کے باوجود دولت کی تقسیم تو پوری ڈھٹائی کے ساتھ صرف چند لوگوں کے حق میں ہی رہتی ہے۔ برطانیہ میں ”دی اکا نومسٹ“ (The Economist) کے مطابق 1994ء میں تقریباً 5 فیصد لوگ 50 فیصد ملکی دولت کے مالک تھے۔ اس وقت ملک کے 20 فیصد غریب ترین لوگوں کے پاس صرف 5 فیصد دولت تھی۔ عالمی سطح پہ صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہے۔ اقوام متحدہ (UN) کے ترقیاتی منصوبے (Development Program) کی 1996ء کی ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ (Human Development Report) کے مطابق تمام دنیا میں 2.5 ارب غریب لوگوں کے مقابلہ میں 358 امیر ترین لوگوں کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے جو مالی طور پر قابل پیمائش ہے۔

امیروں سے غریبوں کی طرف انتقال دولت کے لئے قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر چند لوگوں کی چاہتوں اور تعیش کی قربانی بے شمار لوگوں کی ضروریات پوری کرے گی۔ یہی بات ایک بہت اچھی دلیل ہے کہ صحیح دولت کی تقسیم کے لئے قدری تخمینے انسانی پارلیمنٹ کے بجائے قادر مطلق سے آنے چاہئیں۔ ملک میں امیروں پر ٹیکس لگانے سے دولت کی عدم مساوات کو دور کرنے کا حل نظریاتی طور پر تو ہو سکتا ہے مگر عملی طور پر کیا اس نظریاتی حل کے مطابق قانون وضع ہو جائیں گے جب

کہ قانون دان بذات خود امیر لوگ ہی تو ہیں؟

اسلام کو بطور معاشی اور معاشرتی ایک مکمل نظام کے دیکھنا لازمی ہے۔ اس کا نفاذ محض قانون سازی سے ممکن نہیں جب تک کہ عوام کی حمایت حاصل نہ ہو۔ اسلامی قوانین کا اطلاق علیحدہ علیحدہ طور پر کیا جائے تو پالیسیاں ناکام ہو جائیں گی۔ محض سزا کے زور پر ایک انسان کو چوری کرنے سے نہیں روکا جاسکتا اگر اس کا دوسرا متبادل بھوک کی وجہ سے موت ہو۔ چنانچہ حکومت اگر بھوکے لوگوں کے لئے کوئی صحیح حل مہیا نہ کرے تو چوری کی سزا بالکل غلط ہوگی۔



تجارت یا سود (Trade or Interest)

یہاں تجارت اور سرمایہ کاری کا اسلامی طریقہ کار متعارف کرایا گیا ہے۔ سود کی حرمت بیان کی گئی ہے اور غرر اور میسر کے تصورات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف قسم کے اسلامی عقود جو خصوصاً معاشیات سے تعلق رکھتے ہیں اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور انہیں مبادلہ عقد، خیراتی عقد اور سرمایہ کاری کے عقود میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جدید دنیا کی اسلامی سرمایہ کاری میں جس طرح یہ عقود عمل میں لائے جاتے ہیں اس کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص توجہ سود اور مرابحہ کے موازنہ پر دی گئی ہے۔ بعد میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اسلامی عقود کے قوانین عملی جامہ پہن سکتے ہیں تاکہ گزشتہ ابواب میں بیان کی گئی معاشیات کی برائیوں کا سد باب ہو سکے۔

سود کیا ہے؟ (What is Interest)

اسلام دیانت داری اور ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ شراکت کے معاملات کی عام حوصلہ افزائی سے بھی بڑھ کر رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ بہبود کی پالیسی کے موضوع پر پوری تشریح کے ساتھ رہنمائی ملتی ہے جس میں مسلمانوں کے لئے مخصوص اشیاء پر مخصوص شرح کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کے احکامات ہیں۔ اسی طرح لوگوں کو جب حکم دیا جاتا ہے کہ دوسروں کی دولت میں غلط طریقے سے تصرف نہ کریں تو اس مقصد کے حصول کے لئے طریقے بھی بتلائے گئے ہیں۔ یہاں سود جو اور غرر کے متعلق احکامات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عربی لفظ ربو کا لغوی مطلب زیادتی یا اضافہ یا نمو ہے جس کو عام طور پر سود کہتے ہیں جیسا کہ ذیل میں بتلایا جائے گا قرض پر کچھ زائد حاصل کرنے کو ہی صرف سود نہ سمجھ لیا جائے۔

ربو کے عناصر کی تعریف

| | |
|---------------|------------------------|
| ربو الفضل | ربو النسیہ |
| (زائد کا سود) | (دیر یا انتظار کا سود) |

سود کے زیر عمل دو طریقے

| | |
|--------------|----------------|
| ربو القروض | ربو البیوع |
| (قرض کا سود) | (تجارت کا سود) |

ربو کو بیان کرنے کے کئی اسلوب ہیں۔ یہاں ربو کی تعریف کے لئے دو عناصر ربو الفضل اور ربو النسیہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور دو قسم کے لین دین ربو القروض اور ربو البیوع بیان کئے گئے ہیں جن میں یہ عناصر شامل کئے جاتے ہیں۔ اگر ایک ہی جنس کی دو اشیاء کا بیک وقت تبادلہ کیا جائے جن کی مقدار یا معیار (Quality) برابر نہ ہو تو یہ ربو الفضل کہلاتا ہے۔ ربو النسیہ یعنی انتظار کا سود وہ ہے جس میں دو اشیاء کا تبادلہ جن کی مقدار اور معیار ایک ہی ہوں بیک وقت نہیں بلکہ کچھ وقفہ سے کیا جاتا ہے اس میں کچھ بھی زائد نہیں ہوتا صرف اوقات تبادلہ میں فرق ہوتا ہے۔

اس لئے اگر کوئی شخص آج کسی کو 100 گرام سونا دیتا ہے اور کل اس سے 100 گرام سونا واپس لیتا ہے تو اسے ربو النسیہ کہیں گے۔ اگر آج کوئی شخص کسی کو 100 گرام سونا دے کر اس سے 110 گرام سونا آج ہی وصول کرتا ہے تو اسے ربو الفضل کہیں گے۔

اکثر اوقات ربو القروض میں ربو الفضل اور ربو النسیہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ چونکہ ایسے لین دین میں تاخیر بھی ہوتی ہے اور کچھ کچھ اضافہ بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ جدید سودی قرضے ہیں جن میں دائن مدیون سے قرض کی رقم سے کچھ زائد وصول کرتا ہے۔ یہ ربو کی دو بڑی اقسام میں سے

ایک ہے۔ اصل قرض دو بنیادوں پر لیا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ زر قرض لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ادھار پر کوئی شے خریدی جائے۔ دونوں صورتوں میں قرض خواہ عقد کرتا ہے کہ وہ دائن کو قرض کی واپسی میں تاخیر کے باعث شروع سے ہی ایک طے شدہ رقم اصل زر کے علاوہ ادا کرے گا۔ بعض اوقات ربو النسیہ کی اصطلاح ربو القروض کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مگر اس کتاب میں مذکورہ بالا تعریف کے مطابق ہی یہ اصطلاحات استعمال کی جائیں گی۔

ماضی کے کچھ علماء نے کہا ہے کہ ربو القروض کا اتنا ہی حکم صرف بہت زیادہ سود لینے کے متعلق ہے اور اس کا اطلاق ہر قسم کے سود پر نہیں ہوتا۔ دوسرے علماء مثلاً ڈاکٹر طنطاوی (قاہرہ کے شیخ الازہر) کا کہنا ہے کہ بینک سے سود لینا دراصل بینک کے منافع سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے اس لئے اس کی اجازت ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب ملغی قریب میں یا تو اپنی رائے سے رجوع کر لیا ہے یا ان کے متعلق دوسروں کی ماضی کی غلط فہمی کو انہوں نے درست کر دیا ہے۔ بہر حال یہ نظریہ ہر طرف سے رد کیا جا چکا ہے۔

وہ نظریات بھی رد کئے جا چکے ہیں جن کے مطابق مقرر کردہ سودی شرح تو حرام ہے مگر متغیر سودی شرح حلال ہے۔ کبھی کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ اگر سودی شرح متغیر ہو تو اس کی اجازت ہے چونکہ ایسے نفع کو ابتدا میں مقرر نہیں کیا گیا۔ مگر یہ سود کے طریقہ کار کے متعلق بالکل غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ سود کی ادائیگی میں نہیں بلکہ سود کا صرف حساب لگانے کے طریقہ میں تغیر ہے۔ اس طریقہ کار میں سود تو یقیناً وصول کیا جاتا ہے مگر اس کا حساب قرض کی پوری مدت کو چھوٹے چھوٹے دورانیوں میں تقسیم کر کے ہر دورانیے کے شروع میں لگایا جاتا ہے۔

سود کی دوسری بڑی قسم ربو البیوع یعنی تجارتی سود ہے۔ جس میں ربو الفضل اور ربو النسیہ کے دونوں عناصر شامل ہو سکتے ہیں۔ ربو البیوع سے بچنے کے لئے زیر تبادلہ اشیاء کی مقدار اور معیار دونوں ایک ہونی چاہیے۔ اور تبادلہ بیک وقت ہونا چاہیے۔ اس لئے اگر کھجوروں کے بدلے کھجوریں لینی ہیں تو دونوں کھجوروں کی مقدار اور کوالٹی ایک ہی ہونی چاہیے اور تبادلہ موقع پہ ہونا چاہیے۔ مگر ایسا تبادلہ بھلا کوئی کیونکر کرے گا؟ محمود الجہال جب ہیوسٹن میں رائس یونیورسٹی میں تھے تو انہوں نے نشاندہی کی

تھی کہ اس کی ضرورت تب ہوتی ہے جب اشیاء کو نقدی کے بدلے بیچنا ہوتا کہ مشتری اور بائع کے لئے مارکیٹ کی درست قیمت معلوم ہو جائے۔ اسے وہ استواء بازار (Marking to Market) کا نام دیتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی اشیاء پر سود کا امتناعی حکم لاگو ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں رباوی اشیاء کونسی ہیں۔

”سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، جو کے بدلے جو، کھجوروں کے بدلے کھجوریں، نمک کے بدلے نمک، مثل کے بدلے مثل، مقدار برابر ادائیگی بیک وقت ہونی چاہیے۔ اگر اشیاء کی انواع مختلف ہوں تو جیسے چا ہوان کو بیچ سکتے ہو۔ بشرطیکہ ادائیگی بیک وقت ہو۔“ (حدیث نبوی۔ مسلم)

ابن رشد نے ہدایت المجتہد میں تحریر کیا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک ربو کا اطلاق مذکورہ بالا چھ اشیاء کے علاوہ اور اشیاء پر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ایک اونس تانبے کے بدلے دو اونس تانبے کا موقع پر تبادلہ ربو کے تحت آئے گا اگرچہ تانبے کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر نہیں کیا گیا۔ ذہن میں رہے کہ مذکورہ بالا چھ اشیاء میں ایک ہی نوع کی چیز کا تبادلہ (مثلاً کھجور کے بدلے کھجور) یا دو مختلف نوع کی اشیاء (مثلاً کھجوروں کے بدلے گندم) کے تبادلے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

100 پونڈ کے کاغذی زر کی ادائیگی اگر اب کی جائے اور واپسی میں 110 پونڈ کا کاغذی زر کچھ عرصہ بعد لیا جائے تو ایسا لین دین بھی ناجائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاغذ زر کا کام کرتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں سونا اور چاندی سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جو زر کی خصوصیت رکھتی ہیں یعنی اشیائے ثمنیہ ہیں۔ اس معاملہ میں علما کے نزدیک علت کے بارے میں اختلاف ہے۔ مثلاً اضافہ (ربو الفضل) کے متعلق امام مالکؒ کے نزدیک علت یہ ہے کہ خوراک کی طرح یہ قابل ذخیرہ ہو یا یہ کہ دونوں ایک ہی نوع کی چیزیں ہوں اور ایک زر کی نمائندگی کرتی ہو۔ انتظار کے سود (ربو النسیہ) کے متعلق امام مالکؒ کے نزدیک مذکورہ حدیث میں چار کھانے کی چیزوں میں علت یہ ہے کہ وہ ذاتقہ کی خصوصیت رکھتی ہوں اور قابل ذخیرہ ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تمام چھ مذکورہ اشیاء میں علت یہ ہے کہ ایسی اشیاء جن کی پیمائش عموماً وزن یا حجم کے لحاظ سے کی جاتی ہو۔ ظاہر یہ کہ نزدیک صرف اور صرف مذکورہ چھ اشیاء

ی رباوی ہیں۔ ان کے نزدیک اگر فریقین رضا مند ہوں تو ایک اونس تا نبادو اونس تانبے کے عوض قابل تبادلہ ہے۔ بہر حال ربو البیوع سے بچنے کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ چیز کو موقع پر زر کے بدلے بیچ دیا جائے۔

”ابوسعہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس بلالؓ کچھ بای کجوریں لائے۔ جب رسول کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کجوریں کیسے حاصل کی گئیں تو بلالؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس کچھ کم درجہ کی کجوریں تھیں جو میں نے دو صاع دے کر یہ ایک صاع کجوریں لے لیں۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہ تو بالکل سود ہے۔ یہ تو بالکل سود ہے۔ ایسے نہ کرنا اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو اپنی کجوریں علیحدہ طور پر بیچ دو اور پھر اس قیمت کے بدلے دوسری کجوریں خریدو۔“ (حدیث نبوی: مسلم)

اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ زر کے بدلے اشیاء کے لین دین میں ربو البیوع واقع نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی زر کے بدلے اشیاء کے لین دین میں ربو القروض واقع ہوتا ہے کیونکہ قرض کی ادائیگی مختلف جنس میں ہوتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہ ایک نہایت اہم کلیہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر ایک شخص A کوئی چیز شخص B سے زر کے عوض خریدتا ہے تو کوئی ربو نہیں۔ یہ سوال کہ اگر شخص A سے ادائیگی کی تا جیل کی صورت میں موجودہ قیمت سے زیادہ قیمت کا مطالبہ کیا جائے تو پھر بھی کیا ربو واقع ہوگا یا نہیں۔ ہم اس موضوع کی طرف بعد میں رجوع کریں گے۔

کچھ مصنف کہتے ہیں کہ ربو الجاہلیہ یعنی جاہلیت کے دور کا ایسا ربو ہی صرف ربو تھا جو رسول کریم ﷺ کے دور میں معلوم تھا۔ (یہ ربو ایسے تھا کہ جب کوئی شخص قرض پر کوئی چیز خریدتا اور قرض کی مدت ختم ہونے پر بائع قرض کی مدت بڑھانے کے لئے کچھ زائد رقم کا مطالبہ کرتا تھا) مگر جمہور کے نزدیک ربو القروض اور ربو البیوع دونوں رسول کریم ﷺ کے دور سے پہلے کفار عرب میں پوری طرح رائج ہو چکے ہوئے تھے۔ اور آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تنبیہ کر دی تھی کہ ربو کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اگر ربو کی دو بڑی صورتوں کے متعلق ہمیں عمومی قاعدہ کلیہ بنانا پڑے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں صورتیں تب واقع ہوتی ہیں جب فریقین کے درمیان کسی عقد کے تحت دو مقابل قدروں (Countervalue) کا منصفانہ تبادلہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر ربو القروض میں قرض دار کو ایک ایسی قیمت (سود) دائن کو ادا کرنی پڑتی ہے جس کے عوض اسے دائن سے کوئی مقابل قیمت حاصل نہیں ہوتی۔ اور ربو البیوع میں ایک پیانہ غلہ کے مقابلہ میں جب دو غلے کے پیمانوں کا تبادلہ ہو تو واضح طور

پر ایک فریق کو دوسرے سے زیادہ قیمت وصول ہوتی ہے۔

راقم الحروف (مصنف) کو معلوم ہوا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے زر کا تبادلہ کرنے والوں کو یروشلم کے معبد سے اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ ایک قسم کا سود وصول کرتے تھے جو ربو الفضل کی طرح تھا۔ یہودی حجاج جو یروشلم میں معبد کا خراج (Temple Tax) ادا کرنے آتے تھے وہ چاہتے تھے کہ آدھے شیکل (Shekel) کے سکے کے ذریعہ یہ خراج ادا ہو کیونکہ چاندی کا یہی ایک سکہ تھا جس پر مشرک رومی بادشاہ کے سر کی شکل کندہ نہیں ہوتی تھی۔ معبد کے سود خوروں نے یہ ایک کاروبار بنالیا ہوا تھا کہ حقیر سمجھے جانے والے دوسرے چاندی کے سکے لے کر ان کے عوض آدھے شیکل کے سکوں کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ تبادلہ تو بیک وقت ہوتا مگر حجاج سے وہ سود خور چاندی کے زیادہ وزن کے سکے لے کر کم وزن کے سکے نہیں دیتے تھے۔ اس طرح وہ دست بدست غیر مساوی چاندی کے وزن کا تبادلہ کرتے جو کہ ربو الفضل تھا۔ اس طریقہ میں اور حکمرانوں کے اپنی کرنسی کی حقیقی قدر میں کمی کر لینے کے طریقہ سے مشابہت واضح ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ دیر کے بجائے جلدی زر کا استعمال کر لینا بذات خود ہی سود کی مقابل قدر ہے۔ جلدی خرچ کر لینے کے فائدے کے خلاف باب نمبر 1 میں بحث ہو چکی ہے۔ کچھ غور کرنے سے ربو النسیہ کے غیر منصفانہ لین دین کی مثالیں مل جائیں گی۔ یہاں قاری کے لئے باب نمبر 1 میں اینٹراپی کی بحث کا دوبارہ مطالعہ موزوں ہوگا۔ اگر شخص A، شخص B کو آج اس معاہدے کے تحت غلہ دیتا ہے کہ شخص B ایک سال بعد اتنا ہی غلہ A کو واپس کرے گا تو شخص B درحقیقت سال بھر بغیر کسی معاوضہ کے A کے لئے یا تو غلہ ذخیرہ کر کے اس کی حفاظت کرے گا یا اسے غلہ خرید کر دے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وصولی اور ادائیگی کے وقت غلے کی قیمتوں میں فرق ہو۔ اگر A کے لئے کٹائی کے وقت B کو غلہ دینا آسان ہو تو B کے لئے A کو غلہ دوسرے وقت میں دینا مشکل ہو سکتا ہے۔

قرآن کی کئی آیات میں ربو کا ذکر ہے (البقرہ 275-279، آل عمران 130:3، النساء 161:4، الروم 39:30) اور اس کا موازنہ خیرات سے کیا گیا ہے۔ قانونی تصنیفات میں اس کو دوسروں کی دولت ہڑپ کرنے کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ یہ مقررہ سود پر سرمایہ کاری کے طریقے سے تعلق رکھتا ہے جس کا

انحصار زیادہ تر انتقالِ دولت پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں رہن ضبط ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ تخلیق زر کے نظام کا نتیجہ بھی دوسروں کی دولت ہڑپ ہی کرنا ہے کیونکہ افراطِ زر سے ان کی بچت کی قدر کم کی جاتی ہے۔

کچھ مصنف بعض کم مشہور احادیث کے حوالے سے ربو کے زمرہ میں اور قسم کے تجارتی کام بھی شامل کرتے ہیں۔ مثلاً نیلام کے دوران مصنوعی طور پر قیمتیں بڑھانا، دلالوں کو کمیشن دینا اور زمین کرایہ پر دینا مگر جمہور کی رائے میں ربو کی تعریف اتنی وسیع نہیں ہے۔ وہ زر کی صنعتکاری اور نیلام میں دھاندلی کو دغا اور دھوکہ بازی کہتے ہیں۔

ربو کا دائرہ کار کیسا بھی ہو رسول کریم محمد ﷺ کی احادیث ان سب کی مذمت کرتی ہیں جو سود لیتے یا دیتے ہیں یا اس کا معاہدہ تحریر کرتے ہیں یا اس میں گواہ بنتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہے اللہ تعالیٰ نے عرب کے مسلمانوں کو مکمل طور پر سود چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا۔

”اے مومنو! اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو سود چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ (البقرہ: 278-279)

ربو کے اس مختصر تعارف کے بعد عام غلط فہمیوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ سود مضمون یعنی ضمانت شدہ نفع ہوتا ہے۔ زندگی میں کوئی شے مضمون نہیں ہے حتیٰ کہ اس کی بھی ضمانت نہیں ہوتی کہ بینک کو اپنے دیئے ہوئے قرض پر سود ضرور ہی وصول ہو جائے گا۔ وقتاً فوقتاً قرض دار ادائیگیاں نہیں کر پاتے۔ یہ بھی درست نہیں کہ سود تب جائز ہوتا ہے جب قرض سے کوئی پیداواری اثاثہ خریدا جائے۔ اسلام میں پیداواری مقصد کے علاوہ اور بھی کئی مقاصد کے لئے سود سے آزاد قرض جائز ہیں جب کہ سودی قرضے بہر حال منع ہیں۔ دراصل قرض دینے سے پیشتر نفع کا تعین کر لینا سود کی تعریف ہے۔ اسی تعریف پر اسلامی بینکاری کے تجزیہ کے دوران مزید بحث کی جائے گی۔

اسلام کے اندر چوری کی مانند جو ابھی دوسروں کی دولت میں غیر منصفانہ تصرف ہے اس لئے ربو کے نظریہ کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ جوئے کا عمل یعنی القمار یا المیسر جس کو المبراہنہ بھی کہتے ہیں یا مستقبل کے کسی واقعہ کے ہو جانے کے اوپر شرط لگانا اسلام میں منع ہے اور جوئے کے ذریعہ حاصل شدہ

دولت کے اصراف پر کوئی اجر بھی نہیں۔

”وہ آپ سے منشیات اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدہ بھی لوگوں کے لئے ہے مگر فائدہ سے گناہ زیادہ ہے۔“ (البقرہ 219:25)

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اگر کوئی شخص گناہ کے ذریعہ کمائی کرتا ہے اور پھر اسے خیرات میں یا بھلائی کے کاموں میں لگا تا ہے یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے سب کچھ لے کر اسے جہنم واصل کرے گا۔“ (الغزالی۔ احیاء العلوم۔ حصہ دوم۔ باب 4 صفحہ 77)

کیا کسی کاروباری سرمایہ کاری میں نفع نہ ملنے کا اتنا زیادہ امکان ہو سکتا ہے جتنا جوئے میں ہوتا ہے؟ یا کیا ایسے کاروبار میں سرمایہ کاری غلطی پر ہے؟ اگر آج میں انٹرنیٹ کمپنی شروع کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مارکیٹ میں سخت مقابلہ کے باوجود ہزاروں میں سے میں ہی کامیاب رہوں گا تو یہ کیا جواب ہے یا سرمایہ کاری؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں ذرا کھوج لگانا پڑے گا۔ اگر ہمارے لین دین میں تخلیق دولت نہیں ہو رہی تو یہ ہمارے لین دین کے جواب ہونے کی ٹھوس نشانی ہے۔ یہ خصوصیت وہاں پائی جاتی ہے جہاں سرمایہ کاری اشیاء و خدمات میں تبدیل نہ ہو رہی ہو۔ دوسرے یہ کہ جو ادواں پایا جائے گا جہاں مستقبل کا کوئی واقع انتقال دولت کا سبب ہو اور جس پر کسی کا کنٹرول نہ ہو مثلاً رُولیٹ چکر میں صرف دیکھتے رہنا کہ گیند صحیح جگہ پر جا گرے۔ کسی کاروباری کی اپنی مصنوعات اور طلب پیدا کرنے کی کارروائی جواری سے بالکل مختلف ہے جو اپنی شرط کے نتیجہ کا انتظار کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جوئے میں غیر ضروری خطرہ لیا جاتا ہے۔ ہم کاشتکاری میں ممکنہ خطرات سے گریز نہیں کر سکتے کیونکہ کھانا زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ مگر کل کے فٹ بال کے مقابلہ کی ہارجیت پر زر کے داؤ پہ نہ لگانے کا فیصلہ یقیناً کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا خصوصیات میں دوسری خصوصیت بذات خود اتنی مضبوط نہیں جس کی بنیاد پر جوئے کا حکم لگایا جاسکے۔ مثلاً ایسا سرمایہ کار جس کی رائے کا کاروبار میں دخل نہیں ہوتا اور اس وجہ سے کاروبار کے نفع نقصان پر وہ اثر انداز نہیں ہوتا اس کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جو اکیل رہا ہے۔ یہاں ہم خطرہ اور غیر یقینی میں تمیز کر سکتے ہیں جب کہ کم ہی مسلمان مصنفین ان دو میں تفریق کرتے ہیں۔ روایتی لٹریچر کے مطابق خطرہ (Risk) وہاں پایا جاتا ہے جہاں کسی نظام کے آئندہ حالات کے متعلق

ماضی کے تجربے سے پیشگوئی کی جاسکتی ہو۔ دوسری طرف غیر یقینی اس وقت موجود ہوتی ہے جب پچھلے تجربے کو سامنے رکھ کے مستقبل کی پیشگوئی نہ کی جاسکے۔ کچھ لوگ گرمیوں کے موسم میں تعطیلات لیتے ہیں کیونکہ سردی پڑنے کا خطرہ بہت کم ہوتا ہے۔ مگر انگلستان کے اندر گزشتہ تجربہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتا کہ جون کے دوسرے ہفتہ میں بارش ہوگی یا نہیں۔ جتنا دورانیہ زیادہ مخصوص ہوگا اتنی ہی عدم یقینی زیادہ ہوگی۔

یہی معاملہ حصص کی مارکیٹ کا بھی ہے۔ معیشت کی نمو کے ساتھ کمپنی کے حصص (Shares) کی قیمت اکثر طویل وقفوں کے بعد بڑھا کرتی ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی کمپنی کے حصص کی قیمت کون سے دن بڑھے گی۔ چنانچہ وقت کی جتنی زیادہ تخصیص کی جائے گی اتنی ہی غیر یقینی زیادہ ہوگی۔ اس لئے اگر پوچھا جائے کہ سٹاک کی تجارت کیا جوا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ کونسے دورانیے کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے۔ کسی خاص دن کی تجارت غالباً جوا ہے مگر طویل عرصے مثلاً پانچ سال کے لئے حصص خرید کر بیچنا غالباً جوا نہیں۔

جوئے کی نشاندہی بنیادی طور پر انتقال دولت سے ہی ہوتی ہے۔ اگر شخص A کا فائدہ شخص B کے نقصان کے عوض ہوتا ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جوا ہے۔ کسی باقاعدہ ادارے کے ذریعہ بھی جوئے کی کارروائی بروئے کار لائی جاسکتی ہے جیسے لائری یا بالواسطہ جوا خانہ کے ذریعہ مگر بنیادی خصوصیت جو جوئے کی تعریف کے لئے لازمی ہے وہ انتقال دولت ہی ہے۔ جوا کی خصوصیات غرر سے ملتی جلتی ہیں۔ "Towards an Objective Measure of Gharar in Exchange"

(Islamic Economic Studies, Vol.7 Nos.1&2 Oct.1999, Apr.2000) میں ڈاکٹر سمیع السوایم گیم تھیوری (Game Theory) کا استعمال کر کے دکھاتا ہے کہ غیر یقینی کے تحت غرر کے لین دین میں صرف ایک فریق کے نقصان کے عوض ہی دوسرے فریق کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال بیمہ (انشورنس) سے دی گئی ہے۔ بیمہ شدہ فریق یا تو بیمہ کی اقساط ادا کرتا ہے اور کوئی مقابل قدر وصول نہیں کرتا یا بیمہ دہندہ بیمہ کی وصول شدہ اقساط سے کہیں زیادہ مطالبہ (Claim) ادا کرتا ہے۔

اسلامی شریعت واضح طور پر بتلاتی ہے کہ کسی بھی معاہدے میں غرر کا پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ جدید تصنیفات (Literature) کو پڑھ کر غرر کی جوئے سے تفریق آسان نہیں اور نہ ہی اس کا دائرہ کار

واضح ہوتا ہے۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ کسی شخص کو اس چیز کے فروخت کرنے کی اجازت نہیں جو اس کی ملکیت میں نہ ہو کیونکہ یہ دھوکے کی ایک قسم ہے۔ مگر غرر کو دھوکہ کے بجائے غیر یقینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کسی ایسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں جس کا معیار (Quality) غیر یقینی ہو۔ مثال کے طور پر غیر مولود بچھڑا نہیں بک سکتا۔ چونکہ بائع اور مشتری کو زیر خرید و فروخت شے کے صحیح معیار کا علم نہیں۔

اگر غیر یقینی کا مطلب مستقبل میں کسی کام کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی چیز سے لاعلمی لیا جائے تو ہر انسان کے ہر کام کا نتیجہ ہی غیر یقینی ہے۔ کسی بھی کاروبار سے ہونے والا نفع شروع میں معلوم نہیں ہوتا اور ویسے ہی غیر مولود بچھڑے کا معیار بھی ہے۔ تو کیا اس کا مطلب ہے کہ شریعت میں کاروبار کرنا ہی منع ہے؟ صاف عیاں ہے کہ ایسا نہیں۔ سرمایہ کاری کے عقد و تو اسلام میں یقیناً جائز ہیں۔ غیر مولود بچھڑے کے معیار کے برعکس سرمایہ کاری کے عقد کے نفع کی لاعلمی سے ایسا عقد اس زمرے میں نہیں آتا۔ مزید برآں ایسے عقد و جن میں غرر صرف معمولی حد تک شامل ہو اور وہ معاہدے جن میں کافی حد تک غرر کا ہی عمل دخل ہو میں تفریق کر کے علما نے اول الذکر کو جائز اور مؤخر الذکر کو ممنوع قرار دیا ہے۔

مذکورہ بالا بچھڑے والی مثال میں ایک معلوم شدہ رقم کا تبادلہ ایک غیر معلوم بچھڑے سے ہو رہا ہے اس لئے غرر کے باعث ناجائز ہے۔ جب کہ سرمایہ کاری کے عقد میں فریقین ایک معلوم شدہ دولت کام پر لگاتے ہیں اور ایک معلوم شدہ تناسب سے نفع کے حق دار بنتے ہیں۔ یہاں نفع نقصان میں خطرہ تو ہے مگر سرمایہ کاری کی مقابل قدر نفع کی اصل مقدار نہیں بلکہ سرمائے کے معلوم تناسب کے مطابق نفع کی تقسیم کا تناسب ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک کاروباری فریق صرف یہ عقد کرتا ہے کہ وہ نفع میں اپنا منصفانہ حصہ لے گا مگر منصفانہ حصے کی یعنی اشتراک نفع کے تناسب کی تخصیص نہیں کرتا تو کہہ سکتے ہیں کہ نفع کی تقسیم میں غرر واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ عقد جائز نہیں ہے۔

اسلامی قوانین دھوکہ اور غیر یقینی سے مشتری کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیونکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ فروخت کی جانے والی شے کا زیادہ علم بائع کو ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم زیر فروخت چیز کی قیمت کا تعین کسی آئندہ واقع پر مبنی ہو تو ایسے عقد میں غیر یقینی شامل ہو جاتی ہے اور وہ غیر یقینی بائع یا مشتری یا دونوں کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایسا عقد بھی غلط ہے کیونکہ صرف مشتری ہی کی حفاظت درست نہیں۔

اسلام میں عقود کی شکلیں (Forms of Contract in Islam)

الغزالی احیاء العلوم میں اور الشافعی کتاب الامم میں لکھتے ہیں کہ العقد ایسے فریقین کے مابین ہونا چاہیے جو اس کے نتائج کو سمجھتے ہوں یعنی ممیز اور عاقل ہوں (بہت ہی بیمار اور نشہ کے تحت عقد جائز نہیں) اور اگر اندھے ہوں تو کوئی بیٹا شخص ان کی نمائندگی کرنے والا ہو یا اگر خود معاہدہ نہ کر سکتے ہوں تو ان کی طرف سے نمائندے مقرر ہوں۔ کاروبار منصفانہ لین دین کے لئے یہ چند شرائط ہیں جو مذکورہ علماء کی نظر میں ان کے دور میں ضروری تھیں۔

ہر عقد کو کچھ بنیادی شرائط پوری کرنی چاہئیں اور وہ یہ ہیں کہ عقد کی شرائط صاف اور واضح ہوں، ان کا نفاذ رضامندی سے ہو جو یا تو لکھی گئی (بالکتاب) ہوں یا زبانی (بالکلام) ہوں۔ عقد ایسا ہو جو قابل نفاذ ہو رضامندی کسی جبر کے تحت نہ ہو اور یہ جائز نہیں ہوگا اگر مقابل قدروں میں کوئی حرام شے یا فعل شامل ہو۔ ان میں بیشتر شرائط آج کل کی ترقی یافتہ دنیا میں مانی جاتی ہیں۔

مسلم مصنفین میں بالعموم یہ تصور پایا جاتا ہے کہ زندگی کے دنیوی معاملات میں جب تک تخصیص کے ساتھ کوئی کام منع نہ ہو تمام کام جائز سمجھے جائیں گے۔ (جب کہ عبادات میں جب تک کوئی کام تخصیص کے ساتھ جائز نہ ہو سب کام ممنوع سمجھے جائیں گے۔) یہاں بھی اس کا اطلاق لین دین کے معاملہ میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ اس شرط کو پورا کرے کہ:

”ان تمام شرائط کو مانا جائے گا جن پر مسلمان متفق ہو جائیں سوائے اس شرط کے جو اس چیز کو جائز کہے جس سے منع کیا گیا کسی

ایسی چیز سے منع کرے جس کو جائز کیا گیا۔“ (حدیث: ضعیف)

ایسے فریق سے بھی عقود کی اجازت ہے جن کے عقائد اسلام کے مطابق نہ ہوں بشرطیکہ مذکورہ بالا شرائط کے تحت ہوں۔

”حضرت ابن مسعود سے کسی نے پوچھا کیا میں ایسے شخص سے قرض لے سکتا ہوں جس کو میں جانتا ہوں کہ وہ برا آدمی ہے؟

ابن مسعود نے فرمایا ہاں ابن مسعود سے کسی اور نے پوچھا کہ کیا اس شخص کی دعوت قبول کر سکتا ہوں جو سوہلہ لیتا ہے؟ ابن مسعود نے

فرمایا ہاں۔“ (احیاء العلوم، جلد دوم صفحہ 94)

بیشتر اسلامی تجارتی عقود تین زمروں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ 1۔ مبادلی معاہدے جن میں فریقین میں سے ہر ایک مقابل قدر یا قیمت وصول کرتا ہے، 2۔ خیراتی عقود جن میں عطیہ دینے والا کوئی مقابل قدر یا قیمت وصول نہیں کرتا اور 3۔ سرمایہ کاری کے معاہدے جن میں نفع کی شراکت کی بنیاد پر کسی منصوبے میں سرمایہ یا محنت لگائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی معاہدے ہیں (مثلاً ضمانت کا عقد) جو بے شمار معاشی کاروائیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اگرچہ ریو میسر اور غرر کے متعلق احکامات عمومی حیثیت رکھتے ہیں پھر بھی احادیث کی روشنی میں تجارت کے موضوع پر تحقیق کرنے سے کچھ مخصوص حالات کے متعلق تجارتی معاہدوں کے لئے چک حاصل کی جاسکتی ہے۔ مثلاً کسی شے کو آئندہ تسلیم (Delivery) کے لئے بیچنے کی اجازت ہے۔ ایسا نہ کرنے سے کاشتکار پر یہ الزام عائد ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی پیداوار جو ابھی اگائی نہیں گئی یا جس کا وہ مالک ہی نہیں اسے بیچ رہا ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ نے کچھ مخصوص شرائط کے تحت ایسے طریق کار کی اجازت دی ہے یہ بیع السلم کا عقد کہلاتا ہے۔

مبادلی عقود

(Contract of Exchange)

عربی کا لفظ بیع ہر اس لین دین کے لئے بولا جاتا ہے جس میں زر کے عوض یا مقایضہ (Barter) کے تحت بائع اور مشتری کے درمیان کسی اثاثے کی ملکیت کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ابن رشد نے مطلق فروخت کی نوممکن صورتیں نکالی ہیں اور عمومی طور پر دو واجبات کے تبادلہ کو ممنوع قرار دیا ہے۔

”دو اشخاص کے درمیان لین دین کے معاملہ کو تبادلہ کہتے ہیں۔ خواہ وہ تبادلہ مادی جائیداد (Corporeal Property) کا مادی جائیداد سے ہو یا مادی جائیداد کا اس کے مساوی واجب الادا (Liability) سے ہو۔ یا واجب الادا کا کسی اور واجب الادا سے ہو۔ پھر ان میں ہر ایک صورت کی آگے تین صورتیں ہیں یعنی فریقین کے درمیان فوری تبادلہ یا دونوں کے درمیان مستقبل کے کسی وقت پر تبادلہ یا ایک کی فوری اور دوسرے کی آئندہ وقت میں ادائیگی۔ اس طرح نو قسمیں بنتی ہیں۔ اس پر اجماع ہے کہ مادی جائیداد یا واجبات میں دونوں ہی فریقین کی طرف سے تبادلے کا التوا ممنوع ہے۔ چونکہ یہ قرض سے قرض کے تبادلے کی شکل ہے۔“

(Ibn-e-Rushd, "Bidayat al- Mujtahid," 1996, P.154)

ابن رشد مزید تین صورتوں کا بھی جائزہ لیتا ہے جو مارکیٹ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جب اشیاء اور زر

موجود ہوں۔

”.....جب دو سامان تجارت کا تبادلہ کیا جائے تو ایک کرنسی کا کام دے سکتی ہے۔ اور دوسری قیمت والی شے سمجھی جاسکتی ہے۔ یادوں کو ہی کرنسی سمجھا جاسکتا ہے۔ جب کرنسی کا کرنسی سے تبادلہ کیا جائے تو ایسی فروخت کو صرف کہتے ہیں جب کرنسی کا تبادلہ قیمت والی شے سے کیا جائے تو ایسے لین دین کو خاص مع کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک قیمت والی چیز کا تبادلہ دوسری قیمت والی چیز سے کیا جائے اسے معاوضہ (Barter) کہتے ہیں.....“

(Ibn-e-Rushd, "Bidayat al- Mujtahid," 1996, P. 154)

لیکن دین کا تبادلہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور مؤجل (Deferred) بھی۔ مگر مؤجل تبادلہ کے معاہدہ کی شہادت کے لئے تحریر پسند کی گئی ہے۔

”اے ایمان والو جب تم آپس میں آئندہ کی کسی میعاد معین کے لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔“ (البقرہ 282)

فوری یعنی موقع پر لین دین کو لکھنے کی ضرورت نہیں مگر شہادتیں پسند کی گئی ہیں۔

”.....مکملین دین جو تم کر رہے ہو اگر تمہارے درمیان موقع پر ہو۔۔۔۔۔ تو اسے نہ لکھو تو تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں مگر تجارتی معاہدوں میں شہادتیں غنیمت الیا کرو۔“ (البقرۃ: 282)

فقہائے سلف کے نزدیک زیر فروخت شے بیچنے کے وقت بائع کی ملکیت اور قبضہ میں ہونی چاہئے۔

”اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے مجھے وہ چیز فروخت کرنے سے منع کیا جو میری ملکیت نہیں۔“ (حدیث: ترمذی)

”اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے مجھے وہ چیز فروخت کرنے سے منع کیا جو میری ملکیت نہیں یا وہ چیز جو واضح نہیں یا واضح طور پر دیکھی نہیں جاسکتی۔“ (حدیث: بخاری)

مبادلہ عقد کے تحت زیر تبادلہ اشیاء کی کوئی نہ کوئی قیمت ہونی چاہیے۔ شافعیؒ اور حنبلیؒ مسالک کے مطابق کسی اثاثے سے لیا گیا فائدہ بھی اثاثہ تصور ہوگا اور لین دین میں شمار ہوگا مگر حنفیؒ اور مالکی مسالک اس نظریے سے متفق نہیں۔ بین الاقوامی اسلامی جامعہ (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی) کو الہ پور کے پروفیسر ہاشم کمالی کے مطابق ماضی قریب کے علما کا اس معاملہ میں شافعی اور حنبلی مسالک کی طرف رجحان ہے۔ عام نیلامی جس میں اشیاء زیادہ بولی دینے والوں کو فروخت کی جاتی ہیں بعض فقہاء کے نزدیک ممنوع ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ اندرون خانہ کا علم رکھنے والے چند لوگ نیلامی میں دھاندلی کر سکتے ہیں۔ دوسرے فقہاء اس طریقہ کار میں کوئی نقصان محسوس نہیں کرتے۔

”انس سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ایک رومال اور پیالہ خریدا اور پھر فرمایا کون یہ رومال اور پیالہ خریدے گا؟ ایک شخص نے کہا میں ایک درہم میں ان کو خریدتا ہوں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کون مجھے ایک درہم سے زیادہ دے گا۔ ایک شخص نے دو درہم دے کر ان سے وہ خرید لئے۔“

(Hadith: Tirmidhi, M.A. Mannan in Islamic Research and Training Institute "Developing a System of Financial Instruments", 1990, P. 82)

بہر حال عام نیلامی سے یہ مانع نہیں۔

”شریعت عام نیلامی کی اجازت دیتی ہے جس میں قبولیت کی معاہدہ مقرر ہو جو بولی دینے والے نے مقرر کی ہو اور وہ اس کا پابند ہو۔“

(Hussein Hasan in Islamic Research and Training Institute, "Developing a System of Financial Instruments", 1990, P. 40)

بہت سے فقہاء کے مطابق ایک عقد صرف ایک لین دین کے لئے ہونا چاہیے۔ چنانچہ مختلف قسم کے علیحدہ علیحدہ لین دین کے لئے ایک ہی عقد کرنے کے بجائے ہر علیحدہ لین دین کے لئے علیحدہ عقد ہونا چاہیے۔ یہ ایک اہم شرط ہے۔ اگر اس کی سختی سے پابندی کی جائے تو کئی سودی معاہدے رک جاتے ہیں جن کو ایسے علیحدہ علیحدہ معاہدوں کو اکٹھا کر کے کیا جاتا ہے جو انفرادی طور پر بذات خود جائز ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو "Contractum Trinius")۔ ہمیں مندرجہ ذیل حدیث کو ذہن میں رکھنا چاہیے اگرچہ بعض کے نزدیک یہ ضعیف ہے:

”اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ایک فروخت کے معاہدے کے تحت دفر وخت منع فرمائیں۔“ (حدیث: ترمذی نسائی)

تبادلے کے لین دین کے عقد کے وقت قیمت متفقہ طور پر مقرر ہو جانی چاہیے اور تسلیم (Delivery) تک ملکیت بائع کی مانی جائے گی۔ معاہدہ طے کرنے کے لئے رسماً بھی کچھ ہونا چاہیے مثلاً دستخط یا مصافحہ۔

فروخت کے اوپر کچھ شرائط بھی عائد کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً صنعتکاری کی کسی چیز پر اس کی نگہداشت کا عقد (Service Contract) یا ناقص مال کی صورت میں ضمانت کا عقد (یعنی ضمان)۔

مشتری اور بائع دونوں کو معاہدے طے کرنے کے بعد کچھ متعین مدت تک معاہدہ توڑنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ حنفی مسلک کے مطابق یہ مدت تین دن ہے جب کہ دوسرے مسالک مدت کی تخصیص نہیں کرتے۔ کچھ علما اس شرط کو جدید اسلامی معاہدوں کے لئے نظریاتی بنیاد سمجھتے ہیں جب کہ دوسرے اس سے مراد ضمانت کی ایک رقم کا جواز نکالتے ہیں جو اس صورت میں قابل ضبطی ہے

اگر مشتری ایک خاص مدت تک مال کی خریداری مکمل نہ کر پائے۔ اگرچہ اس شرط کو تو سب مانتے ہیں مگر ضمانت کی اجازت صرف حنبلی مسلک دیتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہر شخص ہمیشہ نقدی کے ساتھ اشیاء و خدمات کے تبادلہ کے لین دین کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں فوری لین دین نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جہاں دو مقابل قدروں میں سے ایک یا دونوں ہی بیک وقت تبادلہ کے لئے پیش نہ کی جاسکیں تو اس صورت میں کچھ قوانین اور کچھ ان قوانین کی مستثنیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس صورت میں مندرجہ ذیل عقود عام طور پر کئے جاتے ہیں۔

مراہجہ ایسی فروخت ہے جس میں بائع اپنی بضائع (اشیاء) اپنی قیمت خرید کے اوپر ایک مخصوص نفع کی شرح کیساتھ فروخت کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص A دوسرے شخص B کو اپنی قیمت خرید پر 10 فیصد نفع کیساتھ آلو بیچنے پر رضامند ہوتا ہے تو اس کے مطابق اگر شخص A شخص B کو 110 میں آلو فروخت کرتا ہے تو A کی قیمت خرید 100 ہوگی۔ البتہ B کو A پر اعتبار کرنا ہوگا کہ اس نے واقعی آلو 100 میں ہی خریدے تھے۔ اس لئے اس قسم کی فروخت کو اعتباری فروخت (Trust Sale) کہتے ہیں۔

”مراہجہ اس وقت واقع ہوتا ہے جب بائع مشتری کو اپنے مال کی قیمت خرید بٹلا کر اس پر اپنا منافع دینا دوں یا درہموں میں مقرر کر دیتا ہے۔ فقہاء اس پر پوری طرح متفق نہیں جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ بائع اپنی قیمت کے لئے کن چیزوں کا حساب رکھے اور کن چیزوں کا نہ رکھے کیونکہ مال خریدنے کے بعد بھی اس نے اس پر کچھ خرچ کیا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مشتری کو بائع جھوٹ بول کر اپنی قیمت خرید زیادہ بھی بٹلا سکتا ہے یا یہ کہ غلطی سے کم بٹلا کر اسے بعد میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اس نے تو زیادہ قیمت پر مال خریدا تھا۔“

(Ibn-Rushd: " Bidayat al-Muhtahid, 1996, P. 250)

رسول کریم ﷺ کے دور میں مراہجہ اکثر کسی تاجر کے تقرر کے ذریعہ کیا جاتا تھا جو بطور نمائندہ کسی کے لئے مال خرید کر پھر اس مال کو کسی مقررہ مقام پر لا کے اُس کے سپرد (deliver) کرتا تھا۔ تاجر اس خدمت کے لئے کچھ فیس (قیمت خرید پر نفع) لیتا اور لین دین کے سبب خطرات کا ذمہ وار ہوتا تھا۔ یہ خطرات مال کی تسلیم تک اس کی خریداری اور ملکیت کے متعلق ہوتے تھے۔ مثلاً ایک تو تاجر کی ملکیت کے دوران مال کے نقصان کا خطرہ اور دوسرا یہ کہ مشتری کا سپردگی کے بعد قیمت ادا نہ کر سکنے کا خطرہ بھی تاجر کے سر پر ہوتا تھا۔ قیمت کی عدم ادائیگی یا عقد کی پابندی نہ کرتے ہوئے عدم خریداری کی صورت

میں مال ضبط کرنے کے سوا تاجر اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اگر ادائیگی میں دیر ہوتی تو تاجر مزید فیس بھی نہ لے سکتا تھا۔ یہ مراہجہ تبادلے کے عقد کے طور سے دیکھا جاسکتا ہے جس میں تاجر مال کو خریدار تک پہنچانے کے لئے اپنی خدمات کی اجرت لیتا ہے۔

آج کل مراہجہ کو اکثر تمويل بمعہ نفع (Cost-Plus Financing) کہا جاتا ہے اور خام مال خریدنے کے لئے قلیل المدت تجارتی قرض (Short Term Trade Credit) کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثالی طور پر (Typically) تو اسلامی بینک کوئی مال خرید کر نفع کے ساتھ فوری طور پر گاہک کے ہاتھ بیچتا ہے۔ یہ نفع اس لاگت کا کچھ فیصد ہوتا ہے جو بینک کو مراہجہ کی تکمیل کے لئے مال کو خریدنے، محفوظ رکھنے اور گاہک تک پہنچانے پر آتی ہے۔

گاہک عقد میں طے کر سکتا ہے کہ مال کی قیمت تسلیم کے وقت یکمشت ادا کی جائے گی مگر آج کے جدید دور میں مراہجہ کا مقصد ادائیگی میں تاخیر کرنا ہوتا ہے یا بعد کی کئی اقساط میں کرنا ہوتا ہے۔ اس کو بیع مؤجل کہتے ہیں اور ملائیشیا میں اسے بیع بشمن آجل یا BBA بولتے ہیں۔

”مثلاً مراہجہ میں ملکیت کے متعلق تمام خطرات گاہک تک تسلیم سے پیشتر بینک کے ذمہ ہوتے ہیں۔ ورنہ نفع ربا کے زمرے میں آجائے گا۔“

(Islamic Research and Training Institute "Developing a System of Financial Instruments", 1990, P. 6)

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کی سرکار کو دی گئی رپورٹ سے بھی اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے۔

”صرف ناگزیر معاملات تک بیع مؤجل کو محدود کرنے کے لئے کچھ حفاظتی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں نفع کی حد مقرر کرنے کے لئے بھی قانون سازی کی ضرورت ہے تاکہ یہ کسی روپ میں سود ہی نہ بن جائے۔“

(Islamic Research and Training Institute "Developing a System of Financial Instruments", 1990, P. 52)

بیع السلم ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں مال کی پوری قیمت پیشگی ادا کی جاتی ہے اور مستقبل میں تسلیم کی تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے۔ ابتداً اس عقد کا اصل مقصد فصل اگانے اور خام مال تیار کرنے کے لئے سرمایہ کاری تھا۔ اس عقد کے مطابق قیمت کی مکمل پیشگی ادائیگی مطلوب ہوتی ہے جب کہ لین دین کا زیر فروخت مال ابھی موجود نہیں ہوتا۔ دیے جانے والے مال کی مقدار اور معیار متعین ہونے چاہئیں۔

مال کسی امتیازی خصوصیت کا حامل نہ ہو یعنی مثلیات (Fungibles) میں سے ہوتا کہ تسلیم میں مشکل پیش نہ آئے۔ اس لئے نایاب اشیاء یا وہ اشیاء جن کی وضاحت صحیح طرح سے نہیں ہو سکتی بیع المسلم کے تحت نہیں آتیں۔ اگر تسلیم کے وقت مال بتلائی گئی مقدار یا معیار کے مطابق نہ ہو تو مشتری اس سے انکار کا حق رکھتا ہے۔ مشتری مال کا مالک تب بنتا ہے جب اس کی تسلیم ہو جائے۔ مشتری مال کی کارکردگی سے متعلق بائع سے اقرار نامہ لے سکتا ہے۔

”اگر کوئی بیع المسلم کا عقد کرنا چاہے تو اسے مال کا ناپ تول اور تسلیم کا دن مقرر کر لینا چاہیے۔“ (حدیث صحاح ستہ)

”مسلم فیہ“ (یعنی مال جس کی بیع المسلم کی جائے) کی حالت یعنی معاہدے کے وقت اس کا وجود ہے یا نہیں کے متعلق امام مالکؒ امام شافعیؒ احمدؒ اسحاقؒ اور ابو ثورؒ نے کوئی قید نہیں لگائی اور کہا ہے کہ کسی چیز کی بیع المسلم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا موسم بھی نہ ہو (یعنی وجود نہ رکھتی ہو)۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگرد ثوریؒ اور اوزاعیؒ کے مطابق جب تک مسلم فیہ کا موسم نہ ہو (یعنی جب تک وجود نہ رکھتی ہو) اس کی بیع المسلم ممنوع ہے۔ جنہوں نے موسم کی قید نہیں لگائی وہ اپنے ثبوت میں ابن عباسؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ لوگ کھجوروں کی بیع المسلم دو یا تین سال کے لئے کرتے تھے اور اس کی اجازت تھی اسے منع نہیں کیا گیا۔ حنفی اپنا انحصار ابن عمرؓ کی روایت پر کرتے ہیں جس کے مطابق رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کھجوروں کی بیع المسلم نہ کرو جب تک کہ وہ پکنا شروع نہ کر دیں۔

(Ibn-Rushd, "Bidayat al Mujtahid," 1996, P. 244)

”اجارہ“ کسی اثاثہ کی منفعت خرید کر اس منفعت کی قیمت ادا کرنے کو کہتے ہیں جب کہ اثاثے کی ملکیت منتقل نہ کی گئی ہو۔ آج کل کے جدید دور میں اس قسم کے عقد کو فعال اجارہ (Operating Lease) کہتے ہیں۔ اس عقد کے تحت اثاثہ کو کرایہ پر دینے والا یعنی مؤجر (Lessor) اجارہ کی اقساط کی ادائیگیوں سے اجارہ کی مدت کے اختتام تک اثاثہ کی پوری قیمت تو وصول نہیں کر پاتا جب کہ وہ اس اثاثہ کی ملکیت کے باعث اس کے نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جدید اجارہ کی سرمایہ کاری نسبتاً مختلف ہے۔ وہاں اجارہ کی ادائیگیاں یوں وضع کی جاتی ہیں کہ مؤجر کو اس کا اثاثہ کے اوپر لگایا ہوا سرمایہ بھی پورا مل جائے اور اس کے ساتھ پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق نفع بھی ملے۔ اس لئے لیز کی سرمایہ کاری بھی رہن پر مبنی سودی قرضے ہی کی مانند ہے۔ فرق صرف اتنا ہے اس میں رہن بذات خود اثاثہ ہوتا ہے۔ سودی قرضہ اور مذکورہ لیز کی سرمایہ کاری میں کچھ قانونی اور حسابی (Accounting) فرق ہیں جن کی وجہ سے سامان کے ضرورت مند کو اجارہ زیادہ موزوں لگتا ہے۔

مذکورہ بالا اجارہ کے نعم البدل کے طور پر اسلامی اجارہ میں اثاثہ کرایہ پر لینے والا یعنی مستاجر (Lessee) شروع میں ہی اثاثہ کو اجارہ کی مدت کے دوران یا اس کے اختتام پر خرید لینے کا عقد ہے۔ اس طرح اجارہ ایک قسم کا کرایہ جمع خرید کا عقد بن جاتا ہے جس کو اجارہ واقتنا کہتے ہیں۔ کیش کی ترسیل کو اس طرح وضع کیا جاسکتا ہے کہ یہ بھی رہن پر مبنی سودی قرضہ کی مانند ہی لگتی ہے۔

اس زمرے میں ایک اور قسم کا لین دین بھی ہے جس کو استصناع کہتے ہیں۔ ایسا عقد صنعتکاروں کے لئے ہوتا ہے جس میں مال کی قیمت فروخت پیشگی وصول کر کے اس کی تیاری کے لئے سرمایہ مہیا کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تسلیم مستقبل کے کسی دن پر طے کر لی جاتی ہے۔ صنعتکاری شروع کرنے سے پیشتر تیار ہونے والے مال کے متعلق اس کی واضح تفصیلات بائع اور مشتری کے درمیان طے کر لی جاتی ہیں۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ استصناع میں پیشگی ادائیگی لازمی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مقابل قدروں کا تبادلہ مستقبل میں کسی وقت ہو سکتا ہے۔ ابن رشد کے مطابق یہ ممنوع ہے کیونکہ اس میں دو واجبات کا تبادلہ شامل ہے ایک واجب مال کی مستقبل میں تیاری اور دوسرا واجب مستقبل میں اس کی قیمت کی ادائیگی ہے۔

یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ روایتی طور پر ماسوا اس کی ظاہری قیمت (Face Value) کے علماء اسلام نے قرض کی فروخت (بیع الدین) کو منع کیا ہے۔ چنانچہ اگر B کسی شخص A کو 100 پونڈ قرض دیتا ہے تو B کسی شخص C کو یہ قرض 100 پونڈ کے علاوہ کسی اور قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔ (اگر B اسے C کے آگے 90 پونڈ میں بیچتا ہے تو C عملی طور پر 90 پونڈ کے اوپر 10 پونڈ سود کمائے گا)۔

”جہاں تک زر حاصل کرنے کے لئے قرض کو فوری طور پر بیچنے کا تعلق ہے جمہور فقہاء کی رائے میں ایسا تب ہی جائز ہے جب کہ اسے اس کی ظاہری قیمت پر بیچا جائے۔ جہاں قرض کو اس کی ظاہری قیمت کے علاوہ کسی اور قیمت پر بیچا جائے تو ایسا لین دین ربا منیہ کے تحت آئے گا اس لئے ممنوع ہے۔ اسلامک فنانس ایسوسی ایشن نے (جس کا الحاق OIC کے ساتھ ہے) قرض سے متعلقہ عقود کے لئے ایک مفصل فیصلہ جاری کیا ہے اس کے مطابق قرض کا سوائے اپنی ظاہری قیمت کے کسی اور قیمت پر لین دین نہیں ہو سکتا۔ اگر لیا گیا قرض ظاہری قیمت سے کم پر بیچا جائے تو یہ ترسکات کی تخفیف یافتہ لگانے کے مترادف ہے اس لئے ممنوع ہے۔“

(Al-Qardawi, Y., "The Islamic Capital Market Conference, Malaysia," 1996)

ملائیشیا کے کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ انہیں عام طور پر اس معاملہ میں آزاد خیال سمجھا

جاتا ہے۔ مثلاً ابن تیمیہ کے حوالے سے پروفیسر کمالی بیع الدین کا حامی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن اور سنت میں اس کے خلاف کوئی واضح امتناعی حکم موجود نہیں۔ اپنے تحقیقی مقالے

"Regulation and Supervision of Islamic Bank, Jeddah, IRTI Occasional

Paper #3, 2001" میں عمر چھاپرا اور طارق اللہ خان کہتے ہیں کہ اگر پیداواری کام کے متعلق ہو تو

قرض کی تخفیف یا بٹہ لگانا جائز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی صنعتکار کوئی سامان بیچتا ہے جس کی قیمت اگلے سال

100 پونڈ واجب الادا ہو تو وہ یہ قرض آج 90 پونڈ کے عوض فروخت ہو سکتا ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ

چونکہ اس قرض کو خریدنے والا ابتدائی اپنے آپ کو ایک مقررہ نفع کی شرح میں مقید کر دیتا ہے اس لئے

ایسے لین دین کو روکنا کے علاوہ کچھ بھی سمجھنا مشکل ہے)۔

اگرچہ اسلام میں قرض کی خرید و فروخت اکثر و بیشتر منع ہے مگر سرمایہ کاری والی ملکیت کی فروخت

پر کوئی پابندی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک ہوٹل چلانے والا نفع کمانے کے لئے کوئی جائیداد خرید کر

مسافروں کو روزانہ کرائے پر کمرے دیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اگر وہ اپنا کاروبار کسی اور کے ہاتھ فروخت

کرنا چاہے تو اسلامی شریعت میں جائز ہے کیونکہ وہ ایک اثاثہ بیچ رہا ہے کوئی قرض نہیں بیچ رہا۔

"مالی نقد اور کچھ دیگر فقہاء کے نزدیک اثاثے کی ملکیت کی فروخت جائز ہے حتیٰ کہ کچھ شرائط کے تحت گروی (Pawning) کے

ذریعہ قرض بھی بیچا جاسکتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ قرضدار خود قرض کی گروی کا انتظام کرے یا کوئی اور۔"

(Islamic Research and Training Institute, "Developing System of Financial Instruments, 1990, P. 28)

اسلام میں اثاثوں کی تجارت مختلف طریقوں سے جائز ہے۔ مثلاً ہوٹل نقد قیمت پر بھی فروخت

ہو سکتا ہے اور اگر ہوٹل کسی کمپنی کا ہے تو اس کمپنی کے حصص فروخت ہو سکتے ہیں۔ پھر کس قیمت پر یہ شیئرز

آگے ایک دوسرے کو فروخت ہوں گے اس کا انحصار لین دین کرنے والے فریقین پر ہے۔ مارکیٹ کے

حالات کے تحت اثاثے یا ان کی نمائندگی کرنے والی اسناد (Certificates) کی خرید و فروخت سے

اسلام منع نہیں کرتا۔ کاغذات کے ذریعہ فروخت بیع الصکاک کہلاتی ہے۔

خیراتی عقود

(Contracts of Charity)

سرمایہ پر اسلامی تصانیف میں مندرجہ ذیل خیراتی عقود کا ذکر ملتا ہے:

”قرض حسنہ“۔ یہ غیر سودی قرض ہے جو چند اسلامی بینک اپنے سرمایہ کاری کھاتہ داروں کو دیتے ہیں یا دیگر لوگ کم مالی حیثیت والوں کو دیتے ہیں مثلاً طالب علموں یا غرباء کو یا کبھی کبھی چھوٹے کاروبار کی مدد کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ قرض جن پر بینک صرف سروس چارج (Service Charge) یعنی اجرت خدمت یا محنت لیتا ہے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جدہ میں کونسل آف فقہ اکیڈمی نے 1986ء میں سروس چارج کی اجازت اس لئے دی تھی کہ بینک کی لاگت جو قرض لینے دینے پر آتی ہے صرف وہ پوری ہو سکے۔ یہ نفع نہیں جو سود کی صورت میں قرض پر لیا جاتا ہے۔ یہ بینک کی صرف انتظامی لاگت ہے۔ مگر یہ بھی ایک نزاعی معاملہ ہے کیونکہ بینک کہہ سکتا ہے کہ اس کے ملازمین کی تنخواہیں انتظامی لاگت میں آتی ہیں اور اس صورت میں تو قرض دے کر بینک کے ملازمین روزی کھاتے رہیں گے۔ امام ابو حنیفہ کو تو یہ سخت ناگوار گزرے گا جو اس شخص کی دیوار کے سایہ کے نیچے بھی نہیں بیٹھتے تھے جس کو انہوں نے قرض دیا ہوتا تھا مبادیہ معمولی سا فائدہ کہیں سود شمار نہ ہو جائے۔

عبدالغفور نے اپنی تصنیف "Commercial Banking in the Presence of

(Apptec Publications 1998) Inflation" میں لکھا ہے کہ اگر بینک کو ایک ہر کارہ (Courier) تصور کیا جائے جو کھاتہ دار سے سرمایہ لے کر قرض خواہ تک پہنچاتا ہے تو اس صورت میں بینک کچھ فیس لے سکتا ہے۔ یہاں بینک اپنا سرمایہ قرض نہیں دے رہا بلکہ سرمایہ داروں کے وکیل (Agent) کے طور پر کام کرتا ہے جو لوگوں کو غیر سودی قرضہ دینا چاہتے ہیں اور بینک کو بطور وکیل کام کرنے کی فیس بھی دینے کو تیار ہیں۔ نظریاتی طور پر تو یہ آسان ترکیب معلوم ہوتی ہے جس میں نفع کا تجارتی عنصر نظر نہیں آتا۔ سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ غیر سودی قرض دینے کی تمنا دل میں رکھتے ہوں گے؟ شاید کافی ہوں۔ مگر کتنے ہوں گے جو بینک کا نفع بخش کاروبار چلانا چاہیں گے؟ اور اگر دائنہین کے بجائے قرض خواہوں کو فیس ادا کرنی پڑے تو کیا ہم خطرناک کام نہیں کر رہے؟

عیسائیت نے فیس وصول کرنے کے جواز کے لئے جو دلیل اپنائی ہوئی ہے اس سے یہاں گہری مشابہت نظر آتی ہے۔ جان نونن (John Noonan) نے "The Scholastic Inquiry into Usury" میں "Durandus of St Pourcain" کا حوالہ دیا ہے جو کہتا ہے کہ سرکار کو ایک قرض دینے والی ایجنسی کا قیام عمل میں لانا چاہیے تاکہ قرضوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس کے کارندوں کو پھر سود نہیں ان کے کام کی اجرت دی جاسکتی ہے۔

نونن پھر یورپ کے ابتدائی بینکروں کی نقلی اجرت انتقال (Virtual Transportation Charges) کو بیان کرتا ہے۔ بینکروں کی فیس میں نقلی کا عنصر یوں شامل ہوا کہ گاہک بینک کے ذریعہ دوسرے شہر میں سرمایہ ادا کرنے کے لئے صرف تبادلے کا بل (Bill of Exchange) لے لیتے تھے۔ ان حالات میں بیل (Biel) کے مطابق جیسا کہ اس نے "Collectorium" میں لکھا ہے بینکر اجرت انتقال تو وصول کر لیتے تھے اگرچہ سکے حقیقت میں اٹھا کر وہاں لیجانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بعد میں یہ دلیل پیش کی گئی سرمایہ کا انتقال مکانی ہو یا زمانی ہو دونوں ایک ہی جیسے ہیں اس لئے نقل زمانی کے لئے بل کی ظاہری قیمت میں چند فیصد تخفیف ہونی چاہیے۔ اس طرح سے سود کو جائز کر لیا گیا۔

اسلامی ضابطہ کے تحت قرض سرمایہ کاری کی نمائندگی نہیں کرتا۔ قرض ایک قسم کا خیراتی عمل ہے جس کے لئے کوئی بھی مادی فائدہ نہیں لیا جاسکتا۔ اگرچہ کئی علماء کے مطابق قرض کے اختتام پر دائن کو بطور شکرانہ کچھ تحفہ دیا جاسکتا ہے (مگر یہ تحفہ پہلے سے متعین نہیں ہونا چاہیے)۔ لیکن سرمایہ کاری اگر کرنی ہو تو یہ نفع کی شراکت کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ کہ سود کی بنیاد پر۔

جہاں تک ہبہ (تحفہ) کا تعلق ہے تو امام غزالی کے مطابق وہ جائز ہے بشرطیکہ (1) اس کے عوض کوئی اشیاء و خدمات نہ تو وصول کی جائیں اور نہ ہی ایسا کوئی انتظام کیا جائے۔ (2) تحفہ لینے والا کسی قسم کا انتظامی یا حکومتی اختیار نہ رکھتا ہو تاکہ تحفہ رشوت میں شمار نہ ہو۔ (3) اگر تحفہ حرام مال پر مشتمل ہو تو یا تو واپس کر دیا جائے یا ضائع کر دیا جائے یا خیرات کر دیا جائے۔

وقف یا خیراتی عطیہ (Charitable Endowment) تب قرار پاتا ہے جب کوئی شخص کوئی اثاثہ یا جائیداد کسی مخصوص مقصد کے تسلسل کے لئے تحفہ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی تخصیص کر دیتا ہے کہ

اس تحفہ سے پیدا شدہ نفع نہ کہ بذات خود تحفہ اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جس ٹرسٹ (Trust) یعنی تولیتی ادارے کو عطیہ شدہ اثاثہ دیا گیا ہو وہ ٹرسٹ کے پاس برقرار رہنا چاہیے، ٹرسٹ اسے بیچ نہیں سکتا۔ مزید برآں وہ اثاثہ کسی بھی لین دین میں بطور رہن استعمال نہیں ہو سکتا۔ ٹرسٹ کے اثاثہ جات میں کسی قسم کی بد نظمی یا غفلت کا ذمہ دار ٹرسٹ کا مینیجر ہوگا۔

سرمایہ کاری کے عقود

(Contracts of Investment)

مشارکہ کے تحت کسی منصوبے میں تمام فریق نفع میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرتے ہیں اور اس منصوبے میں انتظامی اختیارات کا حق رکھتے ہیں مگر لازماً اسے استعمال کرنے کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ مشارکہ مستقل بنیاد پر (Permanent Musharakah) ہو سکتی ہے جس میں سرمایہ کاری کی رقم قلیل المدت بنیاد پر قابل واپسی نہیں ہوتی یا مشارکہ متناقصہ (Diminishing Musharakah) بھی ہو سکتی ہے جس میں نفع کے مطابق وقت کے ساتھ ساتھ اصل رقم بھی واپس ہوتی رہتی ہے۔ اس معاہدے کی ابتدا میں ہی سب شرائط طے ہو جانی چاہئیں۔ اگر مزید سرمایہ کاری کے لئے کوئی اور فریق شامل کرنا پڑے تو پہلے جتنے بھی فریق ہوں سب سے اجازت لینا ضروری ہے۔ پہلی شراکت ختم ہو جائے گی اور نئی شراکت شروع ہو جائے گی جس میں نئے اور پرانے سب فریق شامل ہوں گے۔ جہاں شراکت کی شرائط میں قرض لینے کی اجازت نہ ہو دوسرے الفاظ میں جہاں تمام خریداری نقد رقم سے ہو وہاں نقصان کی تقسیم ہر فریق کی لگائی ہوئی رقم کی نسبت سے ہوگی مگر کسی ایک فریق کا زیادہ سے زیادہ نقصان اس کی پوری لگائی ہوئی رقم کی حد تک ہوگا۔ تمام فریق لازماً رقم شامل کریں گے اور نفع کی تقسیم باہمی رضامندی کی نسبت سے ہوگی۔

امام ابو حنیفہ کے مطابق مشارکہ میں سرمایہ کا حصہ نقدی کی شکل میں ہونا چاہیے۔ امام مالک کے نزدیک مشارکہ میں حصہ ڈالنے سے پیشتر اگر کسی چیز کی نقد قیمت معلوم ہو سکے تو بطور شرکت کے حصہ کے وہ غیر نقد چیز استعمال ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس چیز کی یا تو نقد قیمت معلوم کی جائے یا اسے بیچ کر نقدی حاصل کر کے مشارکہ میں شرکت کا حصہ متعین کیا جائے۔ مشارکہ میں اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے

کہ جب مختلف قیمتیں یعنی علیحدہ علیحدہ امتیازی خصوصیت کے حامل (Non-Fungibles) اثاثے استعمال کئے جائیں گے تو اثاثے آپس میں مدغم نہ ہو سکیں گے اس لئے شرکت قائم نہ ہوگی۔ امام شافعی کے نزدیک مثلیات (Fungibles) تو بطور غیر نقدی حصہ استعمال ہو سکتی ہیں جب کہ قیمتیں (Non-Fungibles) نہیں ہو سکتیں۔ امام الغزالی کی رائے میں بھی اثاثوں کا مدغم ہونا لازمی ہے اور قیمتیں ممنوع ہیں۔

مذکورہ بالا مشارکہ جس میں ہر شریک سرمایہ لگاتا ہے شراکت کے عقد کی صرف ایک شکل ہے۔ اسے شرکت العنان کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مشارکہ کی اور قسمیں ہیں۔

”فقہاء کے نزدیک مجموعی طور پر شرکت کی چار قسمیں ہیں۔ شرکت العنان شرکت الابدان شرکت المفادہ اور شرکت الوجوہ۔ ان میں سے ایک کے اوپر اجماع ہے جو شرکت العنان ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط پر اختلاف ہے۔ باقی تینوں کے متعلق اختلاف ہے۔ ان میں بھی جو فقہاء ان تینوں پر بالعموم اتفاق بھی کرتے ہیں انہیں بھی ان کی شرائط پر اختلاف ہے۔“

(Ibn-Rushd, "Bidayat al- Mujtahid," 1996, P. 301)

شرکت الابدان کام میں شرکت ہے یعنی ایسی شرکت جس میں شرکاء سرمایہ نہیں بلکہ محنت کا حصہ شامل کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس کو بالعموم جائز کہتے ہیں جب کہ امام شافعی اس سے منع کرتے ہیں۔ شرکت المفادہ میں ہر شریک اپنے پورے سرمائے کے لین دین کے لئے دوسروں کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیتا ہے جو یہ کام اس کی موجودگی یا غیر موجودگی دونوں میں کرتا ہے۔ عموماً امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس کی اجازت دیتے ہیں جبکہ امام شافعی اس سے منع کرتے ہیں۔ شرکت الوجوہ ایسی شرکت ہے جس میں شرکاء شرکت کی مدد کے لئے اپنی قرض لینے کی اہلیت کو بطور حصہ شامل کرتے ہیں تاکہ شرکت کا کام چلتا رہے۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک ایسی شرکت کا عدم ہے۔

ایک اور صورت شرکت کی مضاربہ ہے (اس کو قراض بھی کہتے ہیں) یہ عربی کے لفظ مضارب سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ہے دوسروں کا سرمایہ استعمال کرنے والا۔ مضارب اپنا حصہ کسی پیداواری کاروبار کے انتظامی امور کی تعمیل کی شکل میں ڈالتا ہے جو بذات خود سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے مضارب کو آجر (Entrepreneur) کہتے ہیں۔ مضاربہ کے تحت سرمایہ کار جو رب المال کہلاتا ہے کسی کاروبار میں نفع کی شراکت کی بنیاد پر عقد کر کے سرمایہ پر حق تصرف مضارب کے حوالے کر دیتا ہے۔ رب المال

صرف سرمایہ لگاتا ہے انتظامی امور میں اس کا دخل نہیں ہوتا۔ نفع کی شراکت کا تناسب منصوبہ کے شروع میں ہی طے کر لیا جاتا ہے۔ نقصان کی صورت میں نقصان میں شراکت کا تناسب ہر ایک سرمایہ کار کی سرمایہ کاری کے تناسب کے مطابق ہوتا ہے۔ نقصان کی حد لگائے گئے سرمایہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ رب المال کی اجازت سے مضارب اپنا سرمایہ بھی منصوبے میں لگا سکتا ہے اور دوسروں سے بھی سرمایہ کاری کرا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سوائے نفع کی شرکت کے مضارب کسی قسم کا اور معاوضہ نہیں لے سکتا۔ طے شدہ اجرت کی غیر موجودگی میں اسے کچھ نہیں ملے گا جب تک کہ منصوبہ نفع بخش نہ ہو۔

”قراض کے جواز میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس نظام کا رواج اسلام سے پہلے بھی تھا اور اسلام نے اس کی توثیق کی۔ اتفاق اس بات پہ ہے کہ قراض کسی دوسرے شخص کو کاروبار میں لگانے کے لئے پیسہ دیتا ہے اور سرمایہ استعمال کرنے والا جو عامل کہلاتا ہے کچھ شرائط کے تحت نفع کا ایک متعین حصہ حاصل کرتا ہے۔ مثلاً چوتھائی، تہائی یا نصف۔“

(Ibn-Rushd, "Bidayat al- Muijahid," 1996, P. 284)

عام طور پر اسلامی شراکت کا قانون جدید دور کی محدود الذمہ شراکت (Limited Liability Shareholding) کے ڈھانچے سے ہم آہنگ سمجھا جاتا ہے۔ اور ان میں واقعی کچھ نظریاتی مشابہتیں ہیں۔ مثلاً کسی جدید کارپوریشن میں مشارکت کی طرح ہی شراکت دار نفع میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر بغور جائزہ لینے سے تین اہم اختلاف سامنے آتے ہیں۔ "Islamic Commercial Law: Partnerships, 2000" میں پروفیسر نیازی لکھتے ہیں کہ مغرب کے محدود الذمہ والے ڈھانچے میں کچھ تصورات غیر اسلامی ہیں۔ ان میں ایک تو محدود الذمہ کا اطلاق اور دوسرا نئے شراکت دار کی کارپوریشن میں شمولیت کا طریقہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اسلامی تصور بھی اس میں موجود نہیں کہ جتنا خطرہ برداشت کیا جائے گا مالی نفع نقصان کی شراکت بھی اسی کے متناسب ہوگی۔

پروفیسر نیازی کے مطابق اگر ایک کمپنی قانوناً بذات خود ایک وجود رکھتی ہے جیسا کہ مغربی قانون تصور کرتا ہے تو پھر اس کمپنی کا نفع میں کوئی حصہ نہیں چونکہ تمام نفع شراکت داروں کا حق ہے۔ اگر کمپنی دیوالیہ ہو جاتی ہے تو شراکت داروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ چنانچہ محدود ذمہ داری کے نظریہ کے تحت خطرہ قبول کرنے کے ساتھ نفع نقصان میں شرکت کا کوئی تعلق نہیں۔

حزب التحریر کے بانی شیخ النہانی کے مطابق جب تک پہلے سے موجود سرمایہ کاری کے شراکت دار

اجازت نہ دیں نئے شراکت دار شامل نہیں کئے جاسکتے مگر کارپوریشن کے انتظامی امور میں دخل دینا تو کجا آج کل کے جدید دور کی کارپوریشنوں میں تو لاکھوں شراکت دار (شیر ہولڈر) ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ کوئی بھی صرف ایک شیر خرید کر شراکت دار بن سکتا ہے جس کے لئے پہلے سے موجود شراکت داروں کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ مضاربہ میں کاروبار چلانے کے لئے سرمایہ کار ایک انتظامیہ مقرر کرتے ہیں۔ جب کہ جدید کارپوریشن میں شراکت داروں کا انتظامیہ (بورڈ آف ڈائریکٹرز) سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہوتا جس سے یہ کہہ سکیں کہ انہوں نے انتظامیہ کو مقرر کیا ہے۔

دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ایک چھوٹا مگر بارسوخ اور مربوط قسم کے شراکت داروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے (جو اکثر طور پر کارپوریشنیں خود ہی ہوتی ہیں) یہ گروہ پھر بورڈ آف ڈائریکٹرز کے انتخاب پر اور اس طرح سے کاروبار کے چلنے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ بڑی کارپوریشنوں میں چھوٹے شراکت داروں کی تعداد بہت بڑی ہوتی ہے جو غیر منظم اور غیر مربوط ہوتے ہیں۔ ان کو رائے دہندگی کا موقع دیا جائے تو ان کے ووٹ ایک دوسرے کے خلاف جانے کی بناء پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے اس لئے ان کی رائے کافی عرصہ تک نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے چھوٹے سرمایہ داروں کو نہ تو صحیح معلومات دی جاتی ہیں اور نہ ہی انہیں پتہ ہوتا ہے کہ انتظامی سطح پر کیا ہو رہا ہے۔ انتظامیہ اور شراکت داروں کے درمیان اس فاصلے اور ان کے درمیان تعلقات کے غیر شفاف ہونے سے ایسے سیکنڈل ابھرتے ہیں جن میں 2002ء کے دوران "Enron" ملوث ہوئی۔

”کمپنی ایک کارپوریشن کا وجود رکھتی ہے جو اپنے نام پر عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتی ہے اور ایسے ہی اس کے نام بھی دعویٰ دائر ہو سکتا ہے۔ اس کا اپنا ایڈریس اور شہریت ہوتی ہے (یعنی کس ملک میں ہے اور اس کا ہیڈ آفس کہاں واقع ہے)۔ نہ تو انتظامیہ کا کوئی رکن اور نہ ہی کوئی شراکت دار ذاتی طور پر اس کی جگہ مذداری لے سکتا ہے۔ صرف اس کی نمائندگی وہ شخص کر سکتا ہے جس کو اس کام کا اختیار دیا گیا ہو۔ کسی امر کی تکمیل و اختتام کا حق صرف کمپنی کو ذاتی طور پر ہوتا ہے کسی اور ذات کو نہیں ہوتا۔ یہ حصص کی کمپنی (Stock Company) ہے اور شریعت کی نظر میں ناجائز ہے۔ یہ ایسالیٹن دین ہے جس میں مسلمانوں کو شریک ہونے کی

اجازت نہیں۔“

(An- Nabhani, T., " The Economic System in Islam, 1997, P. 152)

عقود کی دوسری شکلیں

(Other Forms of Contract)

اگر وکالت رہن و دیعہ اور ضمان کا مختصر ذکر نہ کیا جائے تو اسلامی عقود کا ہمارا جائزہ نامکمل رہے گا کیونکہ کاروبار میں ان کا استعمال عام ہے۔

وکالت کا تصور اسلام میں تسلیم شدہ ہے۔ اس لئے معاوضہ یا بغیر معاوضہ کے وکیل مقرر کیا جاسکتا ہے جو مقرر کرنے والے کے نام پر کام کر سکتا ہے۔ وکیل اپنے آجر (Employer) کی طرف سے کام کرتا ہے اور عام حالات میں کسی کام کا ذاتی طور پر ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وکالت کی بھی کچھ حدود ہیں مثلاً وکیل کسی کی طرف سے نماز ادا نہیں کر سکتا۔

رہن حفاظت کا عقد (Pledge) ہے اور یہ عقد ناقابل تنسیخ ہے۔ جو چیز رہن رکھی جائے وہ قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں قابل فروخت ہے اور جس کے قبضہ میں ہو وہ اس کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔ ودیعت کسی چیز کو بطور امانت رکھنے کا عقد ہے۔ امانت کے غیر ارادی طور پر ضائع ہونے کی صورت میں امین ذمہ دار نہیں۔ اگر امانت رکھنے کے لئے امین کوئی اجرت وصول کرے تو پھر وہ اس کے نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ امانت کو امین تک پہنچانے کے اخراجات بذمہ مالک ہوتے ہیں۔ امانت رکھی گئی چیز کا استعمال اگر کوئی تیسرا فریق کرنا چاہے تو اس کے لئے مالک کی اجازت لازمی ہے۔ امانت اور اس کا فائدہ یا نقصان مالک کو ملے گا۔ (یہاں اسلامی بینک کے کرنٹ اکاؤنٹس کا اصول نکلتا ہے اس کو باب 7 میں بیان کیا جائے گا)۔ مالک کی اجازت کے بغیر امانت شدہ چیز کو امین آگے کسی کی حفاظتی تحویل میں نہیں دے سکتا۔ اگر امین کسی بھی طرح مالک کی اجازت کے بغیر امانت کو استعمال میں لاتا ہے تو وہ اس کے ہر قسم کا نقصان پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ عند الطلب امانت کا مالک کو لوٹانا لازمی ہے۔

ضمان کا عقد مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ضمان النقص کا عقد وہ عقد ہے جس کے تحت کسی واجب الاداء میں نقصان ہو تو اسے پورا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اس قسم کا عقد اسلامی بینک اور کھاتہ داروں کے درمیان ہوتا ہے جس میں بینک کھاتہ داروں کو یہ ضمانت دیتا ہے کہ بینک کی طرف سے عقد کی

خلاف ورزی کی صورت میں ان کی جمع شدہ رقم میں نقصان کو پورا کیا جائے گا۔

پیش رفت یا پس رفت

(A Stop Forward or a Step Backward)

ماضی قریب میں اسلامی بینکوں نے مراہجہ استصناع اور بیع مؤجل کو مختلف تجارتی ضروریات پوری کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اگر اسلام میں پیشگی فروخت بالکل منع ہوتی تو کاشتکار کو فصل کے تیار ہونے تک انتظار کرنے میں خاصی تکلیف اٹھانا پڑتی۔ اسی طرح صنعتکار اپنی پیداوار تیار کرنے کے لئے استصناع کا عقد کر لیتا ہے۔ اسلامی سرمایہ کاری کے ایسے عقود کے لئے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں یا ایسے عقود کی جو تاویلیں پیش کی جاتی ہیں ان کے متعلق آج کل بہت گرم بحث چل رہی ہے۔ بحث کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے عقود کے بجائے اب اسلامی سرمایہ کاری مبادلی عقود پر انحصار کرتی ہے۔

سرمایہ کاری کے لئے مبادلی معاہدوں کی حمایت میں اور مخالفت میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ تصنیفات (Literature) میں واضح طور پر بیان نہیں کئے گئے۔ جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے اسلامی علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کاروباری شخص سرمایہ کاری کرنے والے کے ساتھ نفع اور نقصان میں شرکت کر سکتا ہے۔ کاروبار شروع کرنے سے پیشتر سرمایہ کار اور کاروباری آئندہ ملنے والے نفع کی تقسیم کے کسی تناسب پر باہمی رضامندی کر لیتے ہیں۔ مگر کچھ مبصر کہتے ہیں کہ نفع میں شراکت پہنی سرمایہ کاری سے معیشت کی تمام ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی مسلمان مکان خریدنا چاہتا ہے اور اس کا مقصد نفع کمانے کے بجائے اس میں رہائش کرنا ہے تو مکان جو نفع پیدا نہیں کرتا اس کو خریدنے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ اس سوال کا جواب اسلامی بینک یوں دیتے ہیں کہ وہ سرمایہ کاری کے عقد کے بجائے بینک کے ساتھ BBA جیسا مبادلی عقد کرے۔

فرض کیجئے کہ کسی نے کوئی مکان پسند کیا جو وہ تعمیری ٹھیکیدار سے خریدنا چاہتا ہے۔ وہ اسلامی بینک کے پاس جاتا ہے جو تعمیری ٹھیکیدار سے اس کے لئے وہ مکان خریدنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ بینک وہ مکان 100,000 پونڈ میں خریدتا ہے اور اپنا نفع شامل کر کے بیس سال میں واجب الادا

7,500 پونڈ سالانہ قسطوں پر اس شخص کے ہاتھ 150,000 پونڈ میں بیچ دیتا ہے۔ بینک کہتا ہے کہ زائد 50,000 پونڈ اس کا نفع ہے سود نہیں ہے۔ بینک کہتا ہے کہ وہ تاجر ہے جو مکان کو 100,000 پونڈ میں خرید کر 150,000 پونڈ میں بیچ رہا ہے اور اس طرح یہ مبادلہ عقد ہے جو مکان کے خریدار کے لئے کیا گیا ہے۔

عقد جو بینک عموماً کرتا ہے ان میں ایک BBA کا عقد ہے جس کو وعدہ خرید (Promise to Buy) کہتے ہیں۔ بینکر تعمیری ٹھیکیدار سے مکان خریدنے سے پیشتر یہ وعدہ خریدار سے لے لیتا ہے۔ اس کے تحت خریدار بینک سے عقد کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی فلاں تاریخ سے پیشتر بینک سے مکان خرید لے گا۔ یہ عقد تحریری طور پر وصول کرنے کے بعد بینک تعمیری ٹھیکیدار سے مکان خرید کر خریدار کو فوری طور پر دے دیتا ہے۔ بینک قسطوں کی وصولی کی ضمانت کے طور پر مکان کی ضبطی کا حق بھی خریدار سے لے لیتا ہے۔ یہ رہن (Collateral) لینے کا مشہور طریقہ ہے جو پچھلے ابواب میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق قسطوں میں عدم ادائیگی کی صورت میں بینک مکان بیچ کر واجب الادا اقساط وصول کر سکتا ہے۔ عملی طور پر اب تک BBA (یا مراجمہ) اور سودی سرمایہ کاری کے درمیان بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ سودی نظام والا بینک بھی کسی فرضی مکان کی خرید کے لئے 100,000 پونڈ قرض دے کر بیس سال کی 7,500 پونڈ سالانہ اقساط طلب کر سکتا ہے۔

دونوں قسم کی سرمایہ کاری میں ماہیت کے لحاظ سے (Qualitative) کوئی زیادہ فرق نہیں۔ سودی بینک کی طرح اسلامی بینک بھی قرضدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں مکان ضبط کر کے اسے بیچ سکتا ہے۔ اس طرح اسلامی بینک کا نفع بھی بالکل ویسے ہی ضمانت شدہ ہے جس طرح روایتی طریقے سے سودی بینک کا سود ضمانت شدہ ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اسلامی سرمایہ کاری میں 100,000 پونڈ کیشن کے بجائے شروع سے ہی مکان خرید کر قرض دار کی ملکیت میں دے دیا جاتا ہے۔ ظاہری لحاظ سے یہ تو بالکل درست ہے یعنی نقد کی صورت میں قرض تو واقعی نہیں دیا جاتا۔ اسلامی بینک تو تعمیری ٹھیکیدار سے مکان خرید کر مکان خریدنے والے کے آگے بیچتا ہے۔ اس لئے قرض ہی نہیں دیا گیا تو سود کیسا؟ مگر روایتی بینک بھی

تو مکان کے خریدار کو 100,000 پونڈ سودی قرض دینے کے بجائے تعمیری ٹھیکیدار کے کھاتے میں یہ رقم جمع کرا سکتا ہے اور اس طرح سودی بینک ٹھیکیدار کو رقم ادا کر کے قرضخواہ کا وکیل (Agent) سمجھا جاسکتا ہے اگرچہ عقد کے کاغذات میں بینک کی طرف سے مکان کی خرید کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔

نہایت ہی اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کی کارروائیوں کا عملی نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سرمایہ کاری کے لین دین میں جب وہ آغاز سے ہی اپنے سرمایہ کی نمو کے لئے ویسا ہی عقد کر لیتے ہیں جیسا روایتی بینک کرتے ہیں تو صرف معمولی طور پر مختلف قسم کا طریقہ کار اپنانے سے کیا کوئی فرق پڑتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں کیا رو صرف کسی طریقہ کار کو کہتے ہیں یا اس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اسے کہتے ہیں؟ اگر اسلامی بینک قدیم طرز کا مراجعہ کرتے جو مبادلہ معاہدوں کے بیان کے دوران بیان کیا گیا ہے تو بحث کی گنجائش کم تھی۔ لیکن جب ”وعدہ خرید“ کا عقد کر کے یا خریدار پر عقد کے تحت ایسی کوئی شرط عاید کر کے اس قسم کے طریقے اپنائے جائیں جو عام روایتی بینکوں کے عقد و جیسے نتائج پیدا کریں تو کم از کم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی بینک مشکوک کام میں ملوث ہے۔ مذکورہ بالا مکان کی مثال میں حقیقت یہ ہے کہ سرمائے کا سرمائے سے ہی لین دین ہو اور صرف دکھاوے کے لئے اسے دو مراحل میں گزارا گیا یعنی سرمایہ سے مکان اور اس کے بعد ساتھ ہی مکان کا سرمایہ سے لین دین کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ گاہک کو سرمایہ دیتے وقت لین دین کے آغاز میں ہی اسلامی بینک کے نفع کی شرح متعین کر دی جاتی ہے تو بینک پر رو لینے کا الزام آتا ہے اور اگر بینک رو لے رہا ہے تو یقیناً گاہک (جو ایک یا ایک سے زیادہ فریقوں کے مجموعہ پہ مشتمل ہو) رو ادا کر رہا ہے۔

BBA اور مراجعہ کے عقد کے بل بوتے پر اسلامی بینک روایتی بینکوں کے سودی قرضوں سے مقابلے میں پورا اتر سکتے ہیں۔ اس مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مراجعہ کا منافع رائج الوقت سود کی شرح کے مطابق مقرر کر لیا جاتا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف جدید اسلامی بینکوں کی سرمایہ کاری میں ترسیل زر کی مشابہت سودی سرمایہ کاری میں ترسیل زر سے نظر آتی ہے بلکہ اس کی شرح بھی مارکیٹ نرخ کے برابر ہی مقرر کی جاتی ہے۔

مکان کی مثال کو ایک بار پھر لیجئے اور ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ اسلام میں 100,000 پونڈ کا گھر

ٹھیکیدار سے خرید کر اس کا فوری قبضہ لے لینا بالکل جائز ہے۔ بصورت دیگر خریدار ٹھیکیدار کو 100,000 پونڈ نقد ادا کرنے کے بجائے 20 سال کے لئے 5,000 پونڈ سالانہ قسط کی ادائیگی پر رضامند کر کے مکان لے سکتا ہے۔ اس طرح سے ٹھیکیدار کو 100,000 پونڈ وصول تو ہو جائیں گے مگر 20 سال لگیں گے۔ ظاہر ہے اس میں سود شامل نہیں۔ دونوں صورتوں میں مکان کی تعمیری قیمت اور 100,000 پونڈ میں فرق کے برابر نفع ٹھیکیدار کو بھی مل جاتا ہے اور خریدار کو بھی جائز مبادلہ لین دین کے ذریعہ رہنے کا مکان مل جاتا ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ٹھیکیدار نقد تو مکان 100,000 پونڈ میں دیتا ہے مگر ادھار 150,000 پونڈ میں 20 سال کی قسطوں پر دیتا ہے۔ اگر خریدار ادھار کا سود ا کرتا ہے تو 50,000 پونڈ ٹھیکیدار کا سود ہے یا صرف زائد منافع؟ مکان کے خریدار کی نظر میں یہ ویسا ہی ہے جیسے وہ بینک سے سود پر قرض لے کر ٹھیکیدار کو پوری قیمت نقد ادا کر دے۔ اگر ٹھیکیدار سے وہ قسطوں پر مکان لیتا ہے تو وہ ٹھیکیدار کا قرضدار بن جاتا ہے جیسے بینک سے قرض لیا گیا ہو۔ اور جیسے بینک قرض دے کر زیادہ کی طلب کرتا ہے ویسے ہی ٹھیکیدار بھی کر رہا ہے۔ ٹھیکیدار کہہ رہا ہے کہ میرے مکان کی قیمت 100,000 پونڈ ہے۔ ابھی یہ قیمت دے دو اور مکان لے لو اگر بعد میں قیمت دینی ہے تو پھر 150,000 پونڈ دینے ہوں گے۔

امام مالک نے اپنی مؤطا میں زمانہ جاہلیت کی ربو کی ایک شکل یہ بیان کی ہے کہ قرضدار سے قرض کی ادائیگی کا وقت آتا تو قرض دینے والا کہتا کہ مجھے یا تو ابھی واپس کر دو یا اگر بعد میں دینا ہے تو اس کے ساتھ اتنی رقم زائد دینا۔ اگر یہ طریق کار منع ہے تو پھر ٹھیکیدار کے متعلق کیا خیال ہے جو کہتا ہے کہ مجھے مکان کی قیمت ابھی دے دو ورنہ بعد میں اس کے ساتھ اتنی رقم زائد دینا۔؟

”وہ کہتے ہیں کہ تجارت سود کی طرح ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے تجارت حلال کی ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔“ (البقرہ 2:274-275)

شاید وہ لوگ جو BBA یا مراہجہ کی حمایت کرتے ہیں وہی ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ کیا اسلام میں مؤجل یعنی تاخیری (Deferred) ادائیگی کے لئے زائد وصولی کی اجازت ممکن ہے؟ بد قسمتی سے اس میں علما کو اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر امام شافعی کا میلان اس طرف ہے کہ کسی چیز کی قیمت فروخت اگر قسطوں میں وصول کی جائے تو زیادہ قیمت لینا جائز ہے جب کہ امام مالک اس کے

مخالف معلوم ہوتے ہیں۔

”(1353) امام مالک تک یہ روایت پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع کے اندر دو بیوع کو منع فرمایا۔
(پروفیسر رحیم الدین اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: اس کا مطلب ہے جب بائع کہتا ہے کہ میں یہ کپڑا 10 روپے نقد میں دیتا ہوں
یا 15 روپے ادھار میں دیتا ہوں۔)

(1354) امام مالک تک یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ میرے لئے ایک اونٹ نقد قیمت میں خرید لو
اور میں تم سے اسے کسی خاص وقت کے ادھار پر خرید لوں گا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا لین دین غلط تصور کرتے ہوئے
اس سے منع کیا۔

(1355) قاسم بن محمد سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کوئی چیز 10 دینار نقد میں یا 15 دینار کسی خاص وقت کے ادھار پر
خریدی تو انہوں نے اسے غلط کاروبار کہا اور اس سے منع کیا۔“ (امام مالک۔ مؤطا)

چونکہ بہت کم علماء ایسے ہیں جو جدید سودی معیشت میں سرمایہ کاری کی کارروائیوں کی تفصیلات
بے پوری واقفیت رکھتے ہیں اس لئے صاف طور پر اس معاملہ میں اتفاق رائے نہیں ملتا۔ ایسے اجماع کے
نقدان کے باعث جب بھی ضرورت ہو تو اسلام کے نام سے پیدا کئے گئے کسی بھی مالی منصوبے پر تنقید
کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی آسانی سے اسے اختلاف رائے کے نام سے نوازا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر BBA واقعی سود کی ایک صورت ہے تو بہت بڑی تعداد میں دوکانداروں
کو سزا ملنی چاہیے جو اپنے گاہکوں سے اپنے مال پر 50 فیصد بڑھا کر قیمت لے رہے ہیں۔ مگر بات یہ
ہے جدید مراجعہ اور BBA کے عقود میں بینک مال کو خریدنے سے پیشتر ہی اپنے گاہک کے آگے بیچنے
کی رضامندی طے کر لیتا ہے (اور یہی خرید کے عقد کا مقصد ہے) اس کے برعکس ایک عام دوکاندار
مال خریدنے کے بعد ہی گاہک کے آگے بیچتا ہے۔ دوکاندار یہ خطرہ بھی اپنے سر لیتا ہے کہ اس کے
خریدے ہوئے مال کا ہو سکتا ہے کوئی خریدار ہی نہ ہو جب کہ بینک اس قسم کے خطرہ سے آزاد ہے۔

اس بات کو ہر کوئی مانتا ہے کہ مارکیٹ کے حالات کے مطابق تعمیری ٹھیکیدار جتنی چاہے اپنے
مکان کی قیمت مقرر کرے اور وہ یہ قیمت جس انداز سے چاہے وصول کرے چاہے تو قیمت شروع میں
ہی پوری نقد وصول کر لے یا چاہے تو بعد کی قسطوں میں وصول کرے۔ اگر یہ قیمت بہت زیادہ ہو تو
گاہک لانے کے لئے وہ اسے کم بھی کر سکتا ہے۔ اس کی تعمیر کی قیمت اور قیمت فروخت کے درمیان

فرق اس کا نفع ہے۔ جب ایک دفعہ قیمت مقرر ہوگئی تو پھر قیمت کی وصولی میں دیر کی وجہ سے اسے بڑھا دینے کا مطلب ہوگا کہ وہ دیر کی یعنی وقت کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے جو کہ ربا ہے۔

تاخیری معاملے کی صورت میں زیادہ قیمت وصول کرنے کے متعلق اس مشکل سوال کے سلسلہ میں اتفاق رائے آج کل یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ٹھیکیدار اثاثے کے بدلے زر کا لین دین کر رہا ہے اس لئے اس میں ربا شامل نہیں ہے اور امام مالک کی اس معاملہ میں رائے منفرد ہے۔ اس کے برعکس سودی بینک چونکہ زر کے بدلے زر کا لین دین کرتا ہے جس میں زر کی زیادتی شامل ہے اس لئے وہ حرام ہے۔ اگرچہ ٹھیکیدار ادائیگی کے وقت کے مطابق اپنی مقرر کردہ قیمت میں کمی یا بیشی کر سکتا ہے مگر بینک کو ربا وصول کرنے کی اجازت نہیں۔ اشیاء کا بیچنے والا مؤجل ادائیگی کی صورت میں جتنی چاہے نقد قیمت سے زیادہ یا کم قیمت وصول کر لے۔

اس معاملے کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر مؤجل ادائیگی کی صورت میں قیمت بڑھانے کی اجازت نہیں تو قیمت کم کرنے کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا A شخص B شخص کو کہہ سکتا ہے کہ میرے مال کی قیمت 100,000 پونڈ ہے اور اگر تم نقد پوری قیمت ادا کرو تو 10,000 پونڈ کی تخفیف (Discount) کروں گا؟ اگر یہ جائز ہے تو تعمیری ٹھیکیدار کہے گا میرے مکان کی قیمت تو 150,000 پونڈ ہے اور اگر پوری قیمت کوئی نقد ادا کر سکے تو 50,000 پونڈ کی تخفیف کر دی جائے گی۔

مذکورہ بالا آراء کے متعلق میری رائے جو امید ہے تعمیری پہلو رکھتی ہے یوں ہے کہ مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ اسلام میں مؤجل ادائیگی کی اجازت ہے۔ مگر جب تک کہ کوئی ٹھوس دلیل اس کے برعکس نہ مل جائے آج کل کے مالی حالات میں جہاں زر اور اشیاء کے درمیان دو عدد لین دین کا آپس میں تعلق پیدا کرنے کے لئے خرید کا عہد اور ایسے دوسرے عقود استعمال کئے جائیں تو نفع کے ساتھ مؤجل ادائیگی سے اسلامی کاروبار میں سودی بینکاری کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور درحقیقت بیچ میں مکان وغیرہ ڈال کر زر سے زر کا کاروبار ہی ہوگا۔

پہلے باب میں مازکیٹ کی مؤجل قیمتوں کے مختصر بیان میں واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ مسلم حقیقت ہے کہ روایتی مالیاتی دنیا میں کسی چیز کی مؤجل قیمت دئے گئے دورانہ کی سود کی شرح کے مطابق متعین

کی جاتی ہے۔ یاد ہوگا کہ سالانہ 5 فیصد سود کی شرح اور سالانہ ایک ڈالر فی اونس محفوظ رکھنے کی لاگت سے سونے کی 400 ڈالر فی اونس نقد قیمت سے اس کی ایک سال بعد کی مؤجل قیمت 421 ڈالر فی اونس بنتی ہے۔ اور اگر سود کی شرح 10 فیصد ہو تو اس کی ایک سال بعد کی مؤجل قیمت 441 ڈالر فی اونس بنتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محض سود کی موجودگی کی وجہ سے مؤجل قیمتیں کیسے متاثر ہوتی ہیں اور زیادہ تر اسلامی بینکاری کی صنعت کا انحصار ہی نقد اور مؤجل قیمتوں کے فرق کے وجود پر ہے۔ جب یہ فرق ہے ہی سود کی وجہ سے ہے تو اس لحاظ سے اسلامی بینکوں کے طریق کار کا انحصار ویسا ہی سود کے وجود پر ہوا جیسا کہ روایتی بینکوں کا ہے۔

اس لئے اسلامی بینک اگرچہ حقیقت میں سودی کام نہ بھی کر رہے ہوں مگر ان کی باتوں سے شک ہوتا ہے کہ وہ بھی یہی کام کر رہے ہیں راقم (مصنف) اور اس کے ساتھیوں نے ملائیشیا کے ایک اسلامی بینک سے 1997ء میں یوں کہتے سنا کہ بینک کو 9 فیصد سالانہ شرح پر اسلامی قرض کے تحت سرمایہ کاری کرنے میں خوشی ہوگی۔ ظاہر ہے یہ تو دائن کی سودی زبان ہے۔ اس زبان کو جدید بینک لیز کرنے والی کمپنیاں اور سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیاں خوب سمجھتی ہیں۔

نفع کے ساتھ مؤجل ادائیگیوں کی بحث اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ معاشرہ جس زر کو استعمال کرنے پر مجبور ہے وہ سود کی وجہ سے بینکوں نے تخلیق کیا ہوا ہے۔ اس بحث کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اصل مسئلہ زر کے نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی سرمایہ کاری ممکن ہی کب ہے جب کہ زر کا وجود ہی سود پر ہو۔ سود پہنی زر کے نظام کو ختم کر دیں تو مؤجل قیمت کا نفع خود بخود غائب ہو جائے گا۔ اصلی اشیاء و خدمات کے کاروبار کے اوپر سود کا سایہ نہیں پڑے گا۔

مؤجل ادائیگیوں کے نفع کا موضوع قدرتی طور پر اسلام میں قرض کی خرید و فروخت (بیع الدین) کے قابل قبول ہونے کی بحث کو جنم دیتا ہے خاص کر اس لئے بھی کہ دونوں کا تعلق زر کی قدر و وقت (Time Value of Money) کے ساتھ ہے۔ پہلے باب میں زر کی قدر و وقت کی نظریاتی بنیاد کا ذکر ہو چکا ہے یہاں جدید اسلامی مالیاتی مارکیٹ میں اس نظریے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

پچھلی چند صدیوں سے سرمایہ کاری کے لئے بڑے پیمانہ کے قرض خواہوں کی طرف سے دائنین

کو بانڈ جاری کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ بانڈ اس بات کی شہادت ہے کہ اتنی مقدار میں زر قرض لیا گیا۔ بانڈ کے اوپر قرض کی مدت کے اختتام پر واپسی کی ادائیگی کی رقم کی مقدار درج ہوتی تھی اس کو ظاہری قیمت (Face Value) کہتے ہیں۔ بانڈ کے کاغذ کے ایک حصہ میں سوراخ کر کے اس کے کئی حصے کئے ہوتے تھے۔ ہر حصہ کو کوپن (Coupon) کہتے تھے۔ جب سود کی ادائیگی واجب الادا ہوتی تھی تو بانڈ کا مالک اس کا متعلق حصہ پھاڑتا تھا اور جاری کرنے والے کے پاس لیجا کر ادائیگی طلب کرتا تھا۔ آخر یہ ہوا کہ کوپن کا لفظ سود کی شرح کے اظہار کے لئے استعمال ہونے لگا جو کہ ظاہری قیمت کے کچھ فیصد کے برابر ہوتی تھی۔

بانڈ کی مدت انتہا تک مالک کو اگر کوئی کوپن (یعنی سود کی قسط) واجب الادا نہ ہو تو ایسے بانڈ کو صفر کوپن کا بانڈ (Zero Coupon Bond) بولتے ہیں۔ سرمایہ کار صفر کے کوپن بانڈ کو اس کی ظاہری قیمت سے کم پر خریدتے ہیں۔ جب بانڈ کی مدت پوری ہوتی ہے تو ظاہری قیمت جوتی ہے اور جس قیمت پر بانڈ خریدا گیا دونوں میں فرق انتظاری نفع (Gain of Waiting) سمجھا جاتا ہے۔ بانڈ جاری کرنے والا اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ بانڈ کی مدت کے اختتام پر اس کی ظاہری قیمت اس کے مالک کو ادا کرے گا اور عدم ادائیگی کی صورت میں بانڈ کا مالک رہن (Collateral) ضبط کرنے کا حقدار ہوگا۔

اسلامی بینکوں کے ابتدائی سالوں میں معلومات کے فقدان کے باعث کچھ مبصر کہا کرتے تھے کہ صفر کوپن بانڈ اسلام کے مطابق ہیں چونکہ ان کی پوری مدت کے دوران کوئی سود ادا نہیں کیا جاتا۔ مگر حقیقت میں سود تو ادا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بانڈ کی مدت کے دوران اقساط میں ادا کرنے کے بجائے اس کے اختتام پر یکمشت ادا کیا جاتا ہے۔

اب فرض کیجئے BBA کے تحت ہر قسط بانڈ میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔ مثلاً تعمیری ٹھیکیدار کو واجب الادا ہر قسط 7,500 پونڈ ظاہری قیمت کے صفر کوپن بانڈ میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔ اب اس بانڈ کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ اگر ٹھیکیدار بانڈ بیچنا چاہتا ہے تو وہ مکان کے خریدار کا قرض بیچے گا۔ اور اگر کوئی سرمایہ کار اس بانڈ کو ظاہری قیمت سے کم پر خریدتا ہے تو یہ انتظاری نفع کمانے کا سودا ہے۔ اس طرح خریدار کی ایک سال بعد واجب الادا قسط ایک سال کے صفر کوپن بانڈ میں تبدیل ہو سکتی ہے

جس کی ظاہر قیمت 7,500 پونڈ ہوگی۔ اگر سال کے شروع میں کوئی سرمایہ کار اسے 6,818 پونڈ میں خریدتا ہے تو اسے ایک سال کا 682 پونڈ انتظاری نفع حاصل ہوگا۔ سرمایہ کار دو سال کا صفر کوپن بانڈ سال کے شروع میں 6200 پونڈ میں خرید سکتا ہے جس سے اس کا دو سال کا انتظاری نفع 1300 پونڈ ہوگا۔

ملائیشیا میں کچھ اسلامی سرمایہ کاری مذکورہ بالا بنیاد پر کی جا رہی ہے۔ اس طرح سرمایہ کاری کیے جانے والے منصوبوں میں ایک منصوبہ کولا لمپور انٹرنیشنل ایئر پورٹ (KLIA) کی تعمیر تھی۔ اس میں سرمایہ کار نے "KLIA" کے پہلے سے موجود اثاثے جن میں ایک اثاثہ زمین تھی اور اس کے ساتھ ہی مستقبل کے محاصل جو ایئر پورٹ سے آنے تھے ان کے حقوق خرید لئے اور ادائیگی نقد کر دی گئی۔ اس طرح تعمیری پروگرام کے لئے "KLIA" کو مطلوبہ رقم حاصل ہو گئی۔ یہ اثاثے خریدنے کے بعد سرمایہ کار نے فوری طور پر انہیں "KLIA" کو بیس سال کی اقساط پر واپس فروخت کر دیا۔ آخر میں وہی اقساط کئی عدد صفر کوپن بانڈ میں تبدیل کر کے وہ بانڈ ظاہری قیمت سے کم پر دوسرے سرمایہ کاروں کے آگے بیچ دیئے گئے۔

”..... ملائیشیا کا آج تک یہ سب سے بڑا منصوبہ تھا۔ نوٹوں کا اجراء، مل ادائیگی (بیج ٹمن آمل) پہنی ہے جس کے مطابق خریدار "KLIA" کے اثاثے ایک متفقہ قیمت پر خریدے گا۔ پھر وہ اثاثے واپس ایک متفقہ قیمت پر "KLIA" کو فروخت کر دے گا۔ یہ قیمت خرید پہلے سے متعین نفع کے اضافہ کے ساتھ ہوگی۔ قیمت کی ادائیگی کے لئے اسلامی نوٹ جاری کئے جائیں گے جن کا نام "Certificate of Debt" (یعنی قرضہ سرٹیفکیٹ) ہے۔ اس منصوبے سے ملائیشیا میں غیر سودی مارکیٹ کے لئے قرض کے اسلامی آلات (Islamic Instruments) جاری کرنے والوں کے اعتماد کو تقویت ملے گی۔“
(Islamic Banker Magazine, London, March 1996)

آج کل ملائیشیا کی مالیاتی کمپنیاں اس اسلامی سرمایہ کاری کی نفع بخش مہم میں نفع کمانے کے لیے تیزی سے شامل ہو رہی ہیں مگر یہ مہم اکثر اوقات ان اسلامی بینکوں کے لئے پریشانی کا باعث بنتی ہے جن سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ سودی سرمایہ کاری اور اس کے ملائیشی اسلامی نعم البدل میں کیا فرق ہے؟
1996ء کے دوران ملائیشیا کی ایجادات میں اسلامی قلیل المدت بیع اور اسلامی قرض کی ڈسکاؤنٹنگ یعنی تخفیف یا پٹہ لگانا شامل ہیں۔ کچھ لوگ ان اختراعی مالیاتی مصنوعات کی حوصلہ افزائی

اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے سودی شعبے کے مقابلہ میں اسلامی سرمایہ کاری کو پنپنے کا موقع ملے گا۔ مگر اسلامی طریقہ کار میں اس دلیل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ سود خور کا مقابلہ اسی کے طریقہ پہ چل کر کیا جائے اور نہ ہی یہ تعلیم دیتا ہے کہ مقصد متعین کر کے اس کے حصول کے لئے غلط یا درست ہر ممکن طریقہ اپنایا جائے۔ اس کے بجائے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ طریقہ ہر طرح سے جائز اور درست ہونا چاہیے اور نتیجہ اللہ کے اوپر چھوڑنا چاہیے۔ زنا کاری کی طرح سود کبھی بھی کسی طرح جائز نہ ہوگا خواہ اس کے لئے کوئی بھی نام یا جواز تلاش کر لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جان بوجھ کر لیا گیا سود کا ایک درہم چھتیس مرتبہ زنا کاری سے زیادہ برا ہے۔“ (حدیث ترمذی: 2825)

اسلامی بینکاری میں لچک والے رویے کو ایسے مسلمان تاجروں سے تقویت ملتی ہے جن کا انداز غیر نظریاتی ہوتا ہے۔ کچھ تو اسلامی سرمایہ کاری کے قوانین سے ہی ناواقف ہوتے ہیں اس لئے جب انہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو مزاحمت نہیں کرتے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ وہ اسلامی نعم البدل کو قائم کرنے کے پابند تو ہیں مگر مغربی مالیاتی تعلیم نے ان کا ذہن پکا کر دیا ہے۔ جہاں تک غیر مسلموں کا اسلامی مالیاتی شعبے میں کام کرنے کا تعلق ہے تو ان سے مسلمانوں کی جگہ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کی توقع کرنا نا انصافی ہے۔

کاروباری دنیا میں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے چونکہ بد قسمتی سے نظریات اسی کی پیروی سے جنم لیتے ہیں اس لئے خطرہ اس بات کا ہے کہ سود کی تعریف بھی بینکوں کی عمل کاریوں پر ہی منحصر ہوگی۔ تعلیمی اداروں میں پہلے ہی ایسا ہو رہا ہے۔ وہاں ترقی پسند ماہرین معاشیات اسلامی بینکاری اور سرمایہ کاری میں ”کیا ہونا چاہیے“ کے بجائے ”کیا ہے“ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تقریباً چار دہائیوں کے بحث و مباحثہ کے بعد بھی کوئی معیاری نظریہ یا طریقہ کار نہیں اپنایا جاسکا چونکہ بیشتر صنعت کاری کی اساس ہی تضاد اور بنیادی مسائل میں مسلسل ہیرا پھیری پر رکھی گئی ہے۔

روایتی بینکاری کے صرف لیبل تبدیل کر کے یعنی صرف علامتی تبدیلی کر کے اسلام کے نام سے ویسی ہی صنعت تعمیر کرنے کے بجائے اگر حقیقی معنوں میں اسلامی بینکاری اور سرمایہ کاری کو فروغ دینا

ہے تو مسلمان بینکاروں کو پہلے مغربی بینکاری کی تاریخ کا مطالعہ کرنا اور اسے سمجھنا ہوگا۔ سرمایہ کاری اور تجارتی لین دین سے متعلق اسلامی شریعت میں بہت بڑی حکمت پنہاں ہے جو محض منافع کی شراکت کے عام طریقوں کے بیان تک محدود نہیں بلکہ اس کا اثر زری نظام کی گہرائیوں تک جاتا ہے۔ روایتی نظام کا مقابلہ کرنے کے لئے اسی کی نقل کر لینا اسلامی بینکاروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ یہ طریق کار سود سے مصالحت کی طرف لے جائے گا اور انجام عیسائیت جیسا ہوگا۔

قوتِ قرض یعنی لیوریج کی غیر موجودگی میں (In the Absence of Leverage)

عقود کی اقسام کے مختصر تعارف سے ظاہر ہے کہ اسلامی تجارت اپنی کاروباری ضروریات کے لئے مختلف طریقوں سے اثاثے حاصل کر سکتی ہے۔ مثلاً وہ مضاربہ یا مشارکہ کے تحت سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے۔ اجارہ کے تحت وہ اپنی پیداواری ضروریات پوری کرنے کے لئے مشینیں کرایہ پر لے سکتا ہے۔ وہ خرید کے عقد کے تحت اشیاء خرید سکتا ہے جن کی ادائیگی مؤجل اقساط میں ہو سکتی ہے جب پیسہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ اپنے کاروبار کو قائم کرنے کے لئے مبادلہ عقد کر کے کسی تاجر کے لئے اپنے نفع میں کسی کو شریک کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اسلامی کاروبار کو اجازت ہے کہ وہ نفع کمانے کے لئے مبادلہ عقد کے تحت مقررہ اجرت پر مزدور کام پہ لگائے۔ سود کی غیر موجودگی میں تجارتی کارروائیوں کو تیزی سے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

”ان ماہرین معاشیات کی سرزنش کی گئی جنہوں نے کہا کہ اسلامی معیشت منصفانہ شراکت پر مبنی ہے۔ اس سے یہ غلط تاثر ملتا تھا کہ تمام اسلامی کارروائیاں صرف منصفانہ شراکت سے ہی ہو سکتی ہیں۔ اس بات کو منظر پر لایا گیا کہ قرآن ربو کو حرام قرار دیتا ہے اور تجارت کو حلال کہتا ہے اور یہ کہ مؤخر الذکر کو ہمیشہ منصفانہ شراکت پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوگا کہ اسلامی معیشت نفع پر مبنی ہے۔“

(Islamic Research and Training Institute, "Developing a System of Financial Investment," 1990, P. 11)

چونکہ اسلامی معاہدوں کا قانون تقریباً یقین کے ساتھ دو واجبات (Liabilities) کے تبادلے پہ مبنی مبادلہ لین دین سے منع کرتا ہے اس لئے مالی قیاس آرائی پر مبنی خرید تب ہی ممکن ہوگی جب کم از کم

ایک تجارتی فریق پوری مقابل قدر کے نقد تبادلے پر رضا مند ہو۔ چونکہ کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اپنی مقابل قدر کی شے نقد ادا کر کے مالی قیاس آرائی کریں اس لئے مالی قیاس آرائی پر مبنی تجارت مقدار اور تعداد دونوں لحاظ سے کم ہو جائے گی۔

مثلاً یہ ممکن نہیں کہ اسلامی مارکیٹ میں 10 پونڈ نقد ادا کر کے 100 پونڈ کا سونا 90 پونڈ کی مؤجل ادائیگی پر خریدا جاسکے۔ یہ ایک مثالی (Typical) طرز کا ہامشی لین دین ہے جس میں روایتی طرز کا مالی قیاس آرائی کرنے والا یہ اُمید کرتا ہے کہ وہ بقایا 90 پونڈ کی ادائیگی کی مدت ختم ہونے سے پیشتر ہی نفع پر سونا بیچ لے گا۔ یعنی ادائیگی کی مدت سے پیشتر اگر سونے کی قیمت 10 فیصد بڑھ جائے تو 10 پونڈ سرمایہ کاری سے 100 فیصد نفع مل جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کی لیوریج اور قلیل المدت فروخت کا امتناع اسلامی مالیاتی مارکیٹ اور حقیقی معیشت کے درمیان گرہ بندی کا کام کرے گا۔

لیوریج یعنی قوت قرض کی بیخ کنی جو کہ صحیح طریقہ سے مرتب کئے گئے اسلامی مالیاتی نظام سے صاف طور پر عیاں ہے روایتی کارپوریٹ سرمایہ کاری کے نظریہ کو کالعدم کر دیتی ہے۔ باب نمبر 4 میں واضح کیا گیا تھا کہ قرض کی سرمایہ کاری سے ایک مثالی (Typical) جدید کارپوریشن کیسے اپنے ہی کاروبار میں لگائے گئے سرمایہ سے اپنے نفع کی شرح میں اضافہ کی کوشش کرتی ہے۔ وہاں مثال سے دکھایا گیا تھا کہ 10 فیصد شرح سے قرض لے کر اس کو ایسے اثاثوں میں لگانا جن سے 20 فیصد نفع حاصل ہو سکتا تھا لیوریج کی وجہ سے اپنی ہی سرمایہ کاری کے ذریعہ کمپنی کے مالک کے لئے 110 فیصد نفع حاصل کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ (قاری کے لئے اس ضمن میں چوتھے باب میں دی گئی مثال کا دوبارہ مطالعہ مفید ہوگا۔)

مذکورہ لیوریج کو (جس کی مثال چوتھے باب میں دی گئی تھی) اکثر سرعت انگیزی (Gearing) کہتے ہیں جو جدید حالات میں بہت گہرائی تک جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں روایتی بینکاری میں زر کی صنعت کاری کے بعد معاشی بے انصافی کی یہ ایک بہت بڑی جڑ ہے۔ سرعت انگیزی کے طریقے سے قرض لینے والا سود ادا کرنے کے بعد جتنا بھی نفع باقی بچے اس کا مالک بن جاتا ہے۔ چنانچہ کاروبار کو دیئے گئے سرمایہ کے تناسب سے سود پر قرض دینے والا کمپنی کے نفع کا حصہ حاصل نہیں کر پاتا۔

چوتھے باب میں دی گئی مذکورہ مثال میں قرض دینے والے نے قرض لینے والے کے کاروبار میں 90 فیصد سرمایہ لگایا مگر سود کی شکل میں صرف 45 فیصد نفع حاصل کیا۔ ادھر قرض لینے والے نے صرف 10 فیصد سرمایہ لگایا اور اثاثوں کی نمو کی شکل میں 55 فیصد نفع کمایا۔

عام آدمی کو تو یوں لگے گا کہ منصفانہ شراکت کا مالک (Equity Holder) سودی دانتین سے بے انصافی کی چال چل رہا ہے مگر پیشہ ور سرمایہ کار فوراً کہے گا کہ دائن منصفانہ شراکت کے مالک کے مقابلہ میں خطرہ (Risk) بھی تو کم لے رہا ہے۔ اب ہم اس دلیل کا جائزہ لیتے ہیں۔

خطرے والی دلیل اس حقیقت پر مبنی ہے کہ جدید قانون کے مطابق نفع تقسیم کرنے سے پہلے سود ادا ہوتا ہے۔ اس لئے دائن کو سود کے مل جانے کا امکان منصفانہ شراکت کے سرمایہ دار کو نفع ملنے کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ چنانچہ مفکرین کہتے ہیں کہ اول الذکر اپنے سرمایہ پر مؤخر الذکر سے کم نفع لینے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ امکان یہ بھی ہے کہ کارپوریشن اتنا نفع ہی حاصل نہ کر سکے جو صرف سود ہی ادا کرنے کے لئے ہی کافی ہو۔ مگر پوری مارکیٹ کو سامنے رکھا جائے تو ایسے مواقع کم دورانیے کے لئے ہوتے ہیں (اگر زیادہ عرصہ کے لئے ایسا ہو تو پھر تو ہر کارپوریشن دیوالیہ ہی ہو جائے۔) بہر حال ہم نے دیکھ لیا کہ دانتین اس طرح کا خطرہ کم کرنے کے لئے جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ممکن ہو رہن (Collateral) شروع میں ہی لے لیتے ہیں۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ کاروبار صرف اتنا ہی نفع کمائے جو صرف سود ادا کرنے کے لئے تو کافی ہو منصفانہ شراکت کے مالک کو کچھ دینے کے لئے ناکافی ہو۔ اس صورت میں دائن تو اپنے سرمایہ پر نفع حاصل کر لے گا مگر منصفانہ شراکت کے مالک کو کچھ بھی نہ ملے گا۔ تو اس صورت میں بھی دائن کو منصفانہ شراکت کے مالک کے مقابلہ میں خطرہ کم ہوا۔

مگر کم نفع ملنے کے مذکورہ بالا جواز پیش کرنے والے سودی دانتین ایک تیسرے امکان کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو کہ بڑی بڑی کمپنیوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لمبے عرصہ میں سودی معیشت کے اندر اکثر دورانیوں میں بڑی کمپنیاں اپنے اثاثوں پر سود سے زیادہ نفع پیدا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد لمبے عرصہ کے دوران پھیلی ہوئی متنوع (Diversified) سودی سرمایہ کاریوں سے حاصل شدہ نفع کے مقابلہ میں پھیلی ہوئی متنوع منصفانہ شراکت والی سرمایہ کاری

سے حاصل شدہ نفع مسلسل زیادہ رہا ہے۔ اور یوں ہی تقریباً ہر بڑی معیشت کے اندر تقریباً ہر دورانیے میں ہوتا ہے۔ چونکہ کارپوریشنوں کے شعبے میں ایسا مشاہدہ ایک حقیقت ہے اس لئے سودی قرضوں پر کم نفع کے جواز کے لئے علمی ماہرین جو خطرے کی بات کرتے ہیں وہ صرف قلیل المدتی ہے۔

لمبے دورانیوں میں اگر منصفانہ شراکت کے مالک سودی دائنین کی نسبت زیادہ نفع حاصل کرتے ہوں تو پھر کہنا چاہیے کہ سودی دائنین کا ہی خطرہ سب سے زیادہ ہے۔ چونکہ لمبے دورانیوں کے تجربے سے یہ تو ثابت ہے کہ ان کی سرمایہ کاری کا نفع منصفانہ شراکت والی سرمایہ کاری کے نفع کی نسبت کم ہوگا۔

سودی نظام کی ریت یہ ہے کہ سرمایہ کاری کا انعام جزوی طور پر خطرہ (Risk) کی سطح سے تعلق رکھتا ہے جب کہ اسلامی نقطہ نگاہ میں سرمایہ کاری کا انعام اس کی فائدہ مندی کی نسبت سے ہوتا ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق سرمایہ پر نفع ایسے استعمال سے پہلے ہی متوقع خطرہ کے بجائے اس کے استعمال کی فائدہ مندی کے مطابق ہوتا ہے۔

اسلام میں سرعت انگیزی ممکن نہیں جب تک دائن غیر سودی قرض دینے کو تیار نہ ہو۔ مگر مسلمان سرمایہ کار بھی نفع بخش کارپوریشن کو بڑے پیمانہ پر بھلا غیر سودی قرض کیونکر دیں گے جب تک کہ کوئی خیراتی منصوبہ نہ ہو بلکہ وہ تو اپنا سرمایہ نفع میں شراکت کی بنیاد پر لگائیں گے۔ چونکہ نفع کمانے والی کارپوریشن کو غیر سودی قرض نہ مل پائے گا کیونکہ اسلام میں سودی قرض بالکل حرام ہیں اس لئے اسلامی معیشت میں سرعت انگیزی کے مواقع ختم ہو جائیں گے۔

روایتی سرمایہ کاری کے طریقہ کار کے تحت منصفانہ شراکت کے تناسب کا انتخاب زیر تجویز کاروبار کے اعتماد پر منحصر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ تاجر کاروبار میں لگائے گئے سرمایہ پر 20 فیصد سالانہ نفع کمانے پر یقین رکھتا ہے تو 10 فیصد سالانہ پر قرض لینا اس کے لئے نفع میں شراکت کی نسبت زیادہ پرکشش ہوگا۔ بھلا جب 10 فیصد سالانہ پر قرض مل سکتا ہے تو 20 فیصد نفع میں شراکت کیوں کی جائے؟ مگر تاجر جب غیر یقینی کاروبار کرتا ہے تو اس صورت میں قرض لینا منصفانہ شراکت کی نسبت کم قابل ترجیح ہوگا۔ سیف الراسلی (Saiful Rosly) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے جو اس نے (Dual Banking Conference, Kuala Lumpur, 1995) میں پیش کیا۔

”اس طرح قرض کے استعمال سے لیوریج کمپنی کے کاروبار کے خطرے کو اس کے حصص کے مالکوں پر مرکوز کر دیتی ہے۔
..... کیا آج کل مضاربیت اور مشارکت سرمایہ کاری کے لئے قابل عمل ہوں گے؟ ملائیشیا میں تو یقیناً نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے
کہ جب منصوبے زیادہ خطرے والے ہوں تو کمپنیاں منصفانہ شراکت کا انتخاب کریں گی اور جب صرف سرمایہ کا مسئلہ ہو تو قرض
لینے کو ترجیح دیں گی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ٹیکس کے قانون بھی کاروبار کو مضاربیت اور مشارکت کے بجائے قرض اور منصفانہ
شراکت کا انتخاب کرنے کی ہی ترغیب دیتے ہیں۔“

راسلی ہمیں یہ بھی یادلاتا ہے کہ جدید معیشت میں سودی سرمایہ کاری کے لئے ٹیکس کے فوائد کا
اطلاق منصفانہ شراکت کی سرمایہ کاری پر نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت اور اس کے ساتھ دوسری حقیقت کہ عام
حالات میں قرض دینے والوں کو کمپنی کی پالیسی پر رائے دینے کا حق نہیں ہوتا دونوں مل کر کارپوریشن کی
سرمایہ کاری کے لئے قرض لینے کو اور بھی پرکشش بنا دیتی ہیں۔ فہیم خان کہتا ہے:

”..... اگر نفع کی شراکت کا نظام سودی نظام سے بہتر ہے تو یہ سودی نظام پر غالب کیوں نہیں آ جاتا اور اسے دھکیل کر باہر کیوں نہیں
پھینک دیتا..... اگر سودی انتخاب کی اجازت ہو تو سرمایہ کی طلب زیادہ تر ان منصوبوں کے لئے ہوگی جو زیادہ خطرہ والے یا کم نفع
والے ہوں جب کہ کم خطرہ اور زیادہ فائدہ والے منصوبوں میں کاروباری تو قرض کے بجائے اپنا ہی سرمایہ لگائے گا۔ سرمایہ کاران
باتوں کو جان کر زیادہ نفع والا کاروبار ڈھونڈنے کی نسبت سود لینا زیادہ آسان سمجھے گا۔ صرف اسی وقت ہی نفع پر مبنی نظام کی
خوبیاں جو کمپنیوں میں درج ہیں سامنے آئیں گی جب سودی سرمایہ کاری مکمل طور پر ختم کر دی جائے۔“

(Fahim Khan: Essays in Islamic Economics, 1995, P. 177)

سرعت انگیزی کا رواج تجارتی کارروائیوں میں تعصب پیدا کرتا ہے۔ "The End of
Economics" میں عمر وڈیلو اسے کاروباری تکبیر (Business Gigantism) کا نام دیتا ہے۔
چونکہ زیادہ سرعت انگیزی سے کاروباری کے اپنے سرمائے پر نفع بڑھ جاتا ہے چنانچہ کمپنیوں کو اپنی
کارروائیاں مزید بڑھانے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ معیشتوں میں چھوٹی کمپنیاں اپنی حریف بڑی
کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ مزید برآں بڑی کمپنیوں کے پاس چھوٹی کمپنیوں کی نسبت قرض لینے کی
زیادہ قوت ہوتی ہے اس لئے صنعت کے شعبہ میں مقابلے کا گلا گھونٹ کر وہ اپنا غلبہ جما سکتی ہیں۔
آہستہ آہستہ علاقے کے جانے پہچانے چھوٹے کاروبار کو علاقہ سے غیر آشنا بلکہ تباہ کن قسم کے بڑے
بڑے کاروبار ہڑپ کر لیتے ہیں۔ مالک اور شاگرد والا روایتی رشتہ رکھنے والے چھوٹے کاروبار کے
مقابلہ میں آجراور اجیر کا رشتہ رکھنے والے بڑے بڑے وسیع قسم کے نظام تسلط حاصل کر لیتے ہیں۔

نانبائی جو کبھی گاؤں میں اپنی بکری چلایا کرتا تھا اب گاؤں سے باہر ایک وسیع و عریض عمارت کے اندر ایک سپر مارکیٹ میں عدم دلچسپی کے ساتھ ملازمت کرتا ہے۔ چھوٹا تعمیراتی ٹھیکیدار جو کبھی انفرادی شکل کے متمیز مکانات تعمیر کیا کرتا تھا اب ایک بہت بڑی تعمیراتی کمپنی کے ساتھ ایک ماتحت ٹھیکیدار (Sub-Contractor) کے طور پر کام کرتا ہے۔ اور اب قطار کی مانند ایک جیسی شکل والے غیر متمیز مکان کھڑے کرتا ہے۔ ان تمام اقسام کے عدم دلچسپی والے ملازمین کے اوپر اب قوانین و ضوابط کا راج چلتا ہے۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ کام میں دلچسپی نہیں رکھتے ان کی نگرانی کی جاتی ہے انہیں کام کے اہداف دیئے جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں معمولی معمولی کاموں کے لئے بھی رہنمائی کتابچے تھمائے جاتے ہیں۔

ایسے نظام پر عمل درآمد کے نتیجے میں معاشرے کو جو متوقع فوائد حاصل ہوتے ہیں ان پر بھی شدید تنقید سے انگلی اٹھائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مال جو ہمیں آج کل مل رہا ہے وہ ماضی کے مقابلہ میں بہت ہی گھٹیا کوالٹی کا ہے۔ جیسا کہ مائیکل راؤ باٹھم (Rowbotham) بیان کرتا ہے:

”ہم میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ گھریلو اشیاء (Household Appliances) جو ہمارے والدین نے خریدی تھیں کتنی دیر چلتی تھیں۔ کئی تو اب تک ہمارے پاس ہیں۔ آج گھاس کاٹنے والی مشین الارم کھاک یا کیتلی جو آپ خریدتے ہیں وہ کتنی دیر چلتی ہے۔ ترقی کے نتیجے میں اشیاء کی کوالٹی بہتر ہونی چاہیے مگر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کل کی طرح کی کوالٹی پیدا کرنا بہت مہنگا ہے تو پھر اکثر ہمیں یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ سوسائٹی دو ٹنڈ ہوتی جا رہی ہے۔“

اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ آج کل ہر چیز میں انتخاب کے مواقع زیادہ ہیں مگر قریبی جائزے پر یہ خیال بھی غلط نکل آتا ہے۔ ذرا برٹش ہائی سٹریٹ کے اندر موبائل ٹیلی فون کی تلاش میں گھوم کر دیکھیں۔ وہاں بہت سی دوکانیں ہیں جہاں آپ انتخاب کر سکتے ہیں۔ 2003ء کے شروع میں وہاں "Currys"، "Dixon's PC World" اور "The Link" کے نام کی دوکانیں تھیں جہاں سے مقامی طور پر موبائل ٹیلی فون دستیاب تھے۔ کیسا ہی صحتمند مقابلہ تھا! مگر بالکل نہیں کیونکہ یہ سب دوکانیں ایک ہی کمپنی کی شاخیں تھیں۔ ورلڈ بینک کے ان ترقیاتی ماہرین معاشیات کو شاید کوئی بتا سکے کہ ان کے اپنے ہی پچھواڑے میں مقابلہ پرور (Competitive) مارکیٹ کا کوئی نام و نشان نہیں۔

آج سودی اداروں نے اپنے نظریات پر بے مغربی معاشرے میں پھیلا رکھے ہیں۔ اس سے

ٹیکس کے فوائد حاصل ہوتے ہیں (نفع کے اوپر ٹیکس لگتا ہے جب کہ سود پر نہیں لگتا) غیر معمولی قانونی قوت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعہ قرضدار کے اثاثوں کی ضبطی ہو سکتی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں (اشتہارات پر اکثر خوب خرچ کرنے کے ذریعے) رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے (تجارتی بینکوں کے مسلسل قرضوں کے بغیر کئی حکومتیں زندہ ہی نہیں رہ پاتیں)۔ جدید بینکاری کے ہاتھوں سب سے بڑی برائی تعلیمی اداروں میں جدید بینکاری کی بیماری کو ذہنوں میں ڈالنا ہے۔ اسی کی وجہ سے تخلیق زر کی بحث کو جنم دیا گیا ہے جب کہ سرے سے ہی یہ قابل بحث نہیں۔ لیوریج کے عمل سے بینکی زر کی بہت زیادہ طلب پیدا ہوئی اور اچھی سرمایہ کاری کی حکمت عملی کے لئے اسے ایک لازمی جزو کے طور پر فروغ دیا گیا جس کی آج کل ہر کالج یونیورسٹی میں تعلیم دی جاتی ہے۔

موجودہ انتظامات کی حمایت میں جھوٹی شہرت کی بوچھاڑ سے ہمارے بچے بھی محفوظ نہیں۔ اس کا سلسلہ بالواسطہ مثلاً 1990ء کی دہائی کے دوران برطانوی سکولوں میں نیشنل ویسٹ منسٹر بینک کے قیام سے لے کر بلا واسطہ طور پر بینکاری کی حمایت کی ترغیب تک چلتا ہے جیسا کہ ذیل میں درج ہے۔

”1997ء میں اس کے باقاعدہ افتتاح کے بعد برٹش میوزیم میں ”HSBC“ کی مٹی گیلری کو دیکھنے لاکھوں لوگ آئے۔ طالب علموں کو زر کی تاریخ اور قدر سکھانے کے لئے اور نمچرز کے واسطے وسائل کے مجموعے پر معلومات تیار کی گئیں مزید برآں دور دراز کی تعلیم کے لئے جو گیلری پر حاضر نہ ہو سکے ایک سی ڈی روم (CD-Rom) جو ورلڈ آف مٹی کے نام سے ہوگی جون 1998ء میں جاری کی جائے گی۔ ”مٹی“ (Money) نامی کتاب ’کوریہ‘ ’جاپان‘ ’فرانس‘ اور جرمنی میں جلد ہی دستیاب ہوگی۔ ڈنمارک کی زبان میں کاغذی جلد کے اندر ”دی سٹوری آف مٹی“ (The Story of Money) نامی بچوں کی کتاب دوبارہ جاری کی جا رہی ہے۔“

(1997 HSBC Group Annual Report)

کسی نامی گرامی چور کو گھر کی حفاظت کے لئے تربیتی کتاب لکھنے پر مامور کر دینے کا کوئی ہوشمند انسان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا مگر افسوس! ہماری حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بینکوں کو زر کی تاریخ لکھنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اگر فاتحین کے لئے تاریخ لکھنا درست ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بینکروں نے دنیا کو فتح کر لیا ہے۔



اسلام کے تحت بینکاری اور زر (Banking and Money Under Islam)

اسلامی بینکاری کے ڈھانچے (Banking Structure) کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظام کا انحصار نفع میں شراکت کرنے پر اور اس کے ساتھ ساتھ جزوی زیر محفوظ کی بینکاری کے خاتمہ پر ہے۔ یہ نظام جدید دور کے مطالبات پورے کرنے کے لئے اسلامی قوانین کے مطابق سرمایہ کاری اور دوسری مالیاتی عمل کاریوں کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے تحت زری پالیسی کی حیثیت تقریباً فالتو (Redundant) سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس باب کے آخر میں اسلامی نقطہ نظر سے زر کے متعلق مختصر بحث کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ کرنسی کے لئے قیمتی دھاتوں کے معیار کے ساتھ اسلامی بینکاری ایسی معیشت کی بنیاد پیدا کرے گی جس میں جائز اور مستحکم تخلیق زر ہو۔

اسلامی تجارتی بینکاری کا ایک نظام (An Islamic Commercial Banking Structure)

باب نمبر 2 کی بحث سے اسلامی بینکاری کا نظام ظہور میں آتا ہے جو موجودہ نظام سے بہت مختلف ہے۔ اس کے مطابق جاری کھاتہ (Current Account) ودیعت کی بنیاد پر کام کرے گا جس میں جمع کرائی گئی رقوم (Deposited Funds) فوری طور پر نکلوائی جاسکیں گی۔ اس قسم کے کھاتہ پر 100 فیصد زر محفوظ کے تناسب (100% Reserve Ratio) کا اطلاق ہوگا۔ رقم جمع کرنے کے انتظامی اخراجات کے معاوضہ کے لئے ایسے کھاتوں پر اجرت خدمت (Service Charge) لاگو ہو سکتی ہے۔ ایسے کھاتے رقوم نکلوانے اور منتقل کرنے کی سہولتیں مہیا کریں گے اور ادائیگی کا بہتر نظام

چلانے کے لئے رقوم جمع کرنے والوں (Deposit Takers) یعنی بینکوں کے درمیان اجرت خدمت اور معیار کے لئے مقابلہ ہوگا۔ "Monzer Kahf" نے "The Islamic Economy, 1978" میں اور ایس ایم یوسف نے "Economic Justice in Islam, 1971" میں سود ختم کرنے کے ساتھ یہ طریقے اپنانے کی تائید کی ہے۔

کچھ مصنف کہتے ہیں کہ جاری کھاتے میں جمع شدہ رقوم سے بینک آگے غیر سودی قرض تو دے سکتا ہے مگر ودیعت کے احکامات کے تحت یہ صرف جمع کرانے والے کی اجازت سے ہو سکے گا اور دعدد شرائط کے تحت ہوگا۔ پہلی یہ کہ اس سے جمع شدہ رقوم عند الطلب فوری طور پر تب ہی نکلائی جاسکیں گی جب سیولت میسر ہو۔ دوسری یہ کہ آگے قرض دی گئی رقوم کے خطرے کا ذمہ دار رقوم جمع کرانے والا (Depositor) ہوگا۔

سرمایہ کاری کے کھاتے مختلف طرز پر کام کریں گے۔ یہاں رقوم جمع کرانے والے کے لئے بینک بطور وکیل اور مشیر سرمایہ کاری کام کرے گا جس کے لئے وہ اپنے مشورے اور وکالت کی خدمات کے لئے یکساں طور پر مقررہ فیس (Flat Fee) لے سکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ بطور مضارب کام کر سکتا ہے اور ایسے کھاتے کی رقوم سے سرمایہ کاری کر کے نفع سے حصہ لے سکتا ہے۔ مثلاً وہ سرمایہ کاری پر 80 فیصد منافع رقوم جمع کرانے والے کو دے کر 20 فیصد خود اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ بینک اور رقوم جمع کرانے والے کے درمیان نفع کی تقسیم کا تناسب رقوم جمع کرانے سے پیشتر طے کر لیا جائے گا۔

نجات اللہ صدیقی نے اپنی کتاب غیر سودی بینکاری (1988)ء (میں سرمایہ کاری کھاتوں کا طریقہ کار "دو-درجہ" (Two - Tier) کی بنیاد پر تجویز کیا ہے۔ پہلا درجہ (Tier) رقوم جمع کرانے والے اور بینک کے درمیان میں تعلق کا ہے اور دوسرا درجہ بینک اور کاروبار کے درمیان میں تعلق کا ہے۔ دونوں مدارج کے اندر مضاربیت اور مشارکت کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ کاری کی دوسری صورتوں میں مثلاً اجارہ کے تحت بینک کو کئی ایسے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں جن سے وہ سرمایہ کاری کھاتے پر کئی اقسام کا نفع کما سکتا ہے۔

وقت کے ساتھ بینکوں کو سرمایہ کاری پر مختلف لحاظ کی نفع پذیری حاصل ہوگی۔ وہ کارکردگی کا ایسا

تسلل قائم کریں گے جس کو دیکھ کر گاہک کو ایک بینک سے دوسرا بینک زیادہ پرکشش لگے گا۔ رقوم جمع کرانے والوں میں شہرت حاصل کرنے کے لئے ہر بینک کی سرمایہ کاری کرنے میں مہارت ناگزیر ہوگی جس سے وہ سرمایہ کاری کے کھاتوں کی رقوم کی آگے سرمایہ کاری کر سکتا ہو اور ہر بینک کا دوسرے بینک کے ساتھ اس لحاظ سے مقابلہ ہو کہ وہ رقوم جمع کرانے والوں اور قرض خواہوں کو کتنا پرکشش نفع میں حصہ دے سکتا ہے۔ سرمایہ کاری کھاتے کی شرائط کے تحت بینک جمع شدہ رقوم سے سرمایہ کاری کرنے کے لئے آزاد ہوگا اور قدرتی طور پر زیادہ سے زیادہ نفع بخش سرمایہ کاری کے مواقع تلاش کرے گا۔ سرمایہ کو استعمال کرنے والے گاہکوں کی نفع مندی کے پیش نظر بینک ان کے ساتھ گہرا کاروباری تعلق برقرار رکھے گا۔

سرمایہ کاری کھاتوں میں جمع شدہ رقوم کے لئے ضمانتیں مذکورہ بالا نظام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ جو رقوم سرمایہ کاری میں استعمال ہو چکی ہوں ان کو 100 فیصد واپس کرنے کی ضمانت دینا مضاربہ اور مشارکہ کے اصولوں کے منافی ہے اس لئے سرمایہ کاری کرنے والا بینک تو نقصان کا ذمہ وار ہو ہی نہیں سکتا اگرچہ اس نے رقوم کی نفع بخش طریقے سے سرمایہ کاری نہ ہی کی ہو۔ البتہ جاری کھاتے میں جہاں فیس لی جاتی ہے رقوم لے کر جمع کرنے والا یعنی بینک ان رقوم کا ذمہ وار ہوتا ہے۔ ان جاری کھاتوں میں رقوم کی ضمانت لینا اسلامی قانون کی دسترس سے باہر نہیں لگتا اگر اس کا نفاذ موزوں طریقہ سے کیا جائے مثلاً خیراتی بنیاد پر پوری صنعت کے باہمی تکافل (Insurance) کے عقد سے ہو۔ محمد صدیقی، ارشاد احمد اور احمد نجار سب ان جاری کھاتوں میں جمع رقوم کی تکافل سکیم کی حمایت کرتے ہیں جو مرکزی بینک کی سرپرستی میں چل رہے ہوں۔ البتہ جہاں 100 فیصد زرمحفوظ کے نظام پر عملدرآمد ہو وہاں شاید چوری یا آگ کے نقصان کے علاوہ اور ایسی کوئی صورت حال نظر آئی مشکل ہے جس میں تکافل کو کوئی بڑی رقم ادا کرنی پڑے۔

بصورت دیگر ہمارے گزشتہ دلائل ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جمع کی گئی رقوم کا تکافل جزوی زرمحفوظ بینکاری ہی کی ایک ضمنی شکل ہو جائے گی۔ جب رقوم جمع کرانے والوں کو بتلایا جائے کہ ان کی رقوم قلیل المدت بنیاد پر نکلوانے کے لئے دستیاب ہیں مگر وہی رقوم طویل المدت قرضوں پر

دے دی گئی ہوں تو سیولت کا واضح مسئلہ شروع ہو سکتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس سیونگز اینڈ لون (United States Savings and Loan) کا بحران اس کی ایک مثال ہے۔ ایلن اور گیل (Alan & Gale) اس کی نشاندہی یوں کرتے ہیں:

”1980ء کا سیونگز اینڈ لونز (S & L's) کا بحران امریکہ کے مالی نظام کی کمزوریوں کو واضح کرتا ہے جن کی وجہ سے خطرہ (Risk) کو نسلوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایس اینڈ ایل (S & L's) نے کم سود کی شرح پر طویل المدت قرضے دے رکھے تھے جن کی سرمایہ کاری قلیل المدت جمع شدہ رقوم سے کی گئی تھی۔ جب مارکیٹ میں سود کی شرح بڑھی تو رقوم جمع کرانے والوں نے رقوم نکالوا کر انہیں منی مارکیٹ اور میوچل فنڈ (Money Market and Mutual Fund) جیسے مالی آلات میں لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایس اینڈ ایل اراٹیکوں کے قابل نہ رہے۔ حکومت کو ان کا بچاؤ کرنا پڑا اور ٹیکس ادا کرنے والوں سے جو سرمایہ منتقل کرنے کی ضرورت پڑی وہ آئندہ نسل سے منتقل کرنے کی شکل میں تھی چونکہ وہ سرمایہ سرکاری قرض سے حاصل کیا گیا تھا جو آئندہ نسلوں نے ادا کرنا تھا۔ اس لئے بینک میں جمع شدہ رقوم کا سرکاری کنفل نسلوں کے درمیان خطرہ کو تقسیم کر دینے کے مترادف ہے۔“

(Alan & Gale, "The London School of Economics Discussion Paper No. 191" July 1994)

روایتی نظام میں جب بڑے پیمانے پر بینکوں کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے تو جمع شدہ رقوم کے کنفل کو جس پیمانے کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے ماضی قریب میں جاپانی بینکاری نے بڑی اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔ جدید معیشت میں جس پیمانہ پر بینکی زر سرکاری زر سے زیادہ ہے اس کے مد نظر بڑے پیمانے پر بینکوں کی ناکامی کے وقت رقوم نکالوانے کی طلب کو کوئی بھی نجی کنفل پورا نہیں کر سکتا۔ اگست 1995ء کے "Independent" میں ہیلن ڈن (Helen Dunne) اور رابرٹ گیسٹ (Robert Guest) لکھتے ہیں:

”اؤتیسویں بڑے بینک "Hyogo Bank" کی ترتیب نو کے لئے بینک کا کام معطل کرنے کی خبر شائع ہونے کے بعد ملے جاپان کے اندر خوفزدگی کے عالم میں رقوم جمع کرنے والے ملک کی سب سے بڑی کریڈٹ یونین (Kizu Shinyo Kumiai) کی طرف 100 بلین یین (650 ملین پونڈ) نکالوانے کے لئے بھاگے۔“

"Kizu" بینک کا ڈوبنا سال کی چوتھی ناکامی تھی۔ اس کے 600 ارب یین (3.9 ارب پونڈ) سے زائد ناقابل وصول قرض تھے جو زیادہ تر غیر بار آور جائیداد کے متعلق تھے۔ دریں اثناء "Hyogo" بینک بھی ڈوب چکا تھا جس کے 1.5 ٹریلین یین (تقریباً 10 ارب پونڈ) سے زیادہ ناقابل وصول قرض تھے چنانچہ جاپانی حکومت اس کے مالی تحفظ پر مجبور ہو گئی۔

2001ء کے دوران ارجنٹینا کو یہ مواقع میسر نہیں تھے۔ غیر ملکی دائنیں سے ڈالروں میں قرض لے کر کئی سالوں سے اس نے زری استحکام (Monetary Stability) کی صورت پیدا کر لی ہوئی تھی

تاکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اپنی مبادلہ شرح کو تقویت پہنچا سکے حالانکہ اس کی حقیقی قدر کم تھی۔ جب اس کی کرنسی کا ربط (Currency Peg) ڈالر کے ساتھ مضبوط تھا تو اس وقت کرنسی کی قدروں میں عدم توازن سے فائدہ اٹھانے والے (Arbitrageurs) باہر سے کم سودی ریٹ پر ڈالر قرض لے کر ارجنٹینی پیسو (Peso) میں تبدیل کر کے ارجنٹینا میں قرضوں کو زیادہ سودی شرح پر دے دیتے تھے۔ جب کرنسی کے ڈالر کے ساتھ ربط پر اعتماد کمزور پڑا تو معاملہ الٹ گیا۔ بیشتر اس کے کہ زر مبادلہ میں پیسو کی قدر کم ہو جائے انہی لوگوں نے اپنے پیسو کے قرض واپس امریکی ڈالر میں تبدیل کرنے شروع کر دیے۔ آئی ایم ایف کی طرف سے ارجنٹینی حکومت کو مسلسل قرض دیئے تو جاتے رہے مگر ڈالر سے کرنسی کے ربط کے دفاع کے لئے یا بڑھتے ہوئے بیرونی قرض کے سود کی ادائیگی کے لئے اس طرح قرض لئے ہوئے ڈالر فوراً ہی ختم ہو جاتے تھے۔ اس عملدرآمد کا فائدہ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو ملتا تھا جن کو پیسو کے قرضوں میں کرنسی کے نقصان کی قیمت یا قرضوں کی عدم ادائیگی کی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے بہت سے لوگوں نے آئی ایم ایف کے قرضوں کو مالیاتی طبقے (Financial Community) کے لئے ایک ناقص قسم کا راہ نجات سمجھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس راہ نجات کی قیمت تو آخر کار ارجنٹینا کے عوام کو ہی ادا کرنی پڑے گی جن کو اب بہت ہی بڑا ڈالروں کا قرض معاشی مندی اور معاشرتی ابتری کی حالت میں ادا کرنا ہے۔ (مہاتیران چندر ہنماؤں میں سے ہیں جو اس صورت حال میں نہیں پھنسے۔)

یہ بات اسلام کی روح کے خلاف ہے کہ لوگ ایسا خطرہ اپنے سر لیں جس سے وہ کبھی فائدہ حاصل نہ کر سکیں۔ ایلن اور گیل (Alan & Gale) زری بیماری کے علاج کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آئندہ نسلیں ایک ناکام نظام کے بجائے ایک مستحکم مالیاتی نظام وراثت میں حاصل کرنے کے لئے قیمت ادا کرنے پر رضامند ہوں گی۔ صرف ایک الٹا منطق ہی ایسے خود غرض نتیجہ کو پیش کر سکتا ہے۔ کیا ہمیں واقعی امید کرنی چاہیے کہ ہمارے بچے ہماری ناکامیوں کی قیمت ادا کریں؟

اسلامی بینکاری کے نظام میں جاری کھاتے کے اندر رقوم جمع کرانے والوں کو جو نہیں وہ نکلوانا چاہیں مرکزی بینک یا رقوم کے تکافل کی سکیم (Deposit Insurance Scheme) کی مدد کے بغیر

فوری طور پر پوری ادائیگی ہونی چاہیے اور انہیں کسی خوف کے تحت بینکوں کی طرف بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ اسلامی سرمایہ کاری والے کھاتوں میں جمع رقوم نفع کی شراکت کے تحت کاروبار میں یا جائیداد کے کرایوں کے عقود میں طے شدہ سود کے بغیر لگائی جائیں گی اور یہ سب کچھ سرمایہ کاروں کے علم میں لایا جائے گا وہ اگر چاہیں تو خطرہ (Risk) لیں یا چھوڑ دیں۔ اس میں پہلے سے طے شدہ کوئی وقت مقرر نہیں کیا جائے گا جس پر رقوم نکلائی جاسکیں کیونکہ یہ بینک کی سرمایہ کاری کی سیولت پر منحصر ہوگا۔ جن کو بینک نے آگے رقوم استعمال کرنے کے لئے دی ہوں اگر وہ بینک کو ایسی رقوم واپس ادا کرنے کی حالت میں نہ ہوں تو بینک بھی رقوم جمع کرانے والوں کو ادا کرے، کی حالت میں نہ ہوگا۔ (اس لئے بعض لوگوں نے اسلامی بینکاری کے شعبہ میں ضمانت شدہ مالیاتی مصنوعات (Securitized Financial Products) کو اہمیت دی ہے۔ قابل فروخت سرمایہ کاری اسناد "Insurance Certificates" اسلامی بینک کے سرمایہ کاری اثاثوں کا اچھا خاصا حصہ ہو سکتی ہیں جن کو ٹاک ایکسچینج میں تیزی سے فروخت کر کے نقدی اکٹھی کی جاسکتی ہے۔ اس طرح سرمایہ کاری کھاتوں میں رقوم جمع کرانے والوں کو رقوم نکلاؤنے کے لئے جلدی سے ادائیگی ہو سکتی ہے)۔

سرمایہ کاری کھاتے ترتیب دینے سے اسلامی بینک وصول شدہ رقوم کے استعمال کا انتظام انہیں اپنے تختہ توازن (Balance Sheet) میں دکھائے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ رقوم بینک کی اپنی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ان کو جمع کرانے والوں کی طرف سے بینک صرف ان کا انتظام کر رہا ہے۔ اس لئے یہ رقوم تختہ توازن میں درج نہیں کی جاتیں۔ انہیں بینک کے اپنے بڑے کھاتوں میں بطور صرف ایک نوٹ کے درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ کاری کھاتوں کے تعلق سے اسلامی بینک کو روایتی بینک کے بجائے سرمایہ کاری کمپنی تصور کرنا زیادہ موزوں ہے۔

بینک آف انگلینڈ کی اسلامی بینکوں کو بینکاری کے لائسنس جاری کرنے میں پس و پیش ایک دم ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسلامی بینک 1987ء کے برطانوی بینکنگ ایکٹ کی یہ شرط پوری نہیں کر سکتا کہ وہ جمع کرائی گئی رقوم کو 100 فیصد یا اس سے زیادہ واپس ادا کرنے کا پابند ہوگا چونکہ وہ ان رقوم کی بیک وقت نفع کی شراکت میں سرمایہ کاری کرتا ہے۔ نفع میں شراکت کا مطلب نقصان میں شراکت بھی ہے

اور نقصان کے خلاف ضمانت دینا سرمایہ کاری کے اسلامی احکامات کے خلاف ہے۔ اور دوسرے مغربی ممالک میں اسلامی بینک کے قیام میں مشکلات کی ایک وجہ موجودہ ضوابط سے یہ اختلاف ہے۔

چونکہ روایتی بینکوں کے اندر جمع کرائی گئی رقم میں کمی واقع ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا اس لئے اسلامی سرمایہ کاری کھاتوں کے لئے رقوم کے حصول کی جب کوششیں کی جائیں تو وہ لوگ جو روایتی بینکوں میں رقوم جمع کرانے کے عادی ہیں ان کو مشکوک نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسلامی جاری کھاتے بھی روایتی بینک کے جاری کھاتوں کے مقابلہ میں فائدہ مند نہیں جن میں سود حاصل ہوتا ہے چونکہ مسلمان جو اپنی رقوم اسلامی بینک کے جاری کھاتوں میں جمع کرائیں گے انہیں بتانا پڑے گا کہ اگر وہ اپنی رقوم کو محض حفاظت کے لیے بینک میں رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کوئی نفع نہیں دیا جاسکے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ بینک بیک وقت ان رقوم کی سرمایہ کاری نہیں کر سکتا۔ جہاں تک روایتی بینک کے جاری کھاتوں کا تعلق ہے تو وہ رقوم جمع کرنے والوں کو بتلاتے ہیں کہ ان کی رقوم بینک میں محفوظ ہیں اور عند الطلب فوری طور پر نکلائی جاسکتی ہیں اور بیک وقت قرض لینے والوں کو بتلاتے ہیں کہ انہیں لوگوں کی جمع کرائی گئی رقوم سے قرض دیے جا رہے ہیں۔ دونوں بیانات ایک ہی وقت میں درست نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف ایک کاروباری ڈھونگ ہے جو صدیوں سے روایتی بینک لوگوں کے آگے رچا رہے ہیں۔

جیسا کہ چھٹے باب میں بتلایا گیا کہ اسلامی بینک "BBA" اور مراہجہ میں سرمایہ کاری کا میلان رکھتے ہیں جس میں سرمایہ کاری کے دورانیے چھوٹے ہوتے ہیں اور نفع طے شدہ اور مارکیٹ کے سود کی شرح کے مقابلہ کا ہوتا ہے۔ مثلاً 1994ء کے کھاتوں میں بحرین کے فیصل اسلامی بینک کے کل اثاثے 4390 لاکھ امریکی ڈالر تھے جن میں سے 2350 لاکھ 3 ماہ کے اندر اور مزید 810 لاکھ اس کے 9 ماہ بعد واجب الادا ہونے والے تھے۔ درحقیقت اس بینک کے مضاربیت اور مشارکت جیسے عقود میں لین دین کا حجم کسی بھی درجہ میں مراہجہ اور "BBA" کے لین دین کے حجم کے برابر نہیں۔ (یعنی مراہجہ اور "BBA" کے حجم سے انتہائی کم ہیں۔)

چوتھے باب میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ داغین متعین سود پہ قرض سے پہلے قرض خواہوں سے اکثر رہن کا سہارا کیوں طلب کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں رہن کی بالکل اجازت تو ہے

مگر پہلے سے متعین ادائیگی کے گوشوارے (Schedule) کی حفاظت کے لئے نہیں۔ اس کے بجائے اگر منصوبے میں نقصان ہو جائے تو سرمایہ کار کے سرمایہ میں تخفیف ہو جائے گی اور صرف اس تخفیف شدہ سرمایہ کو رہن سے حاصل کیا جاسکے گا۔

اب تک بیان کی گئی بینکاری کی ترتیب کو بروئے کار لانے سے سرمایہ کاری کے لئے رہن کی موجودگی کو بنیاد بنانے کی طرف اسلامی بینکوں کا رجحان بہت کم ہوگا۔ سرمایہ کاری کے لئے دی گئی رقوم پر نفع منصوبے کی فائدہ مندی پر منحصر ہوگا اور بینک سرمایہ دینے کے لئے رہن کو بنیاد بنانے پر زور کم ہی دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پہلے ہی متعین تناسب سے نفع نقصان میں شرکت ہو رہی ہو تو رہن کی ضبطی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے اور چوتھے باب میں بیان کی گئی روایتی بینک کی قرض دینے کی پالیسی کے برعکس یہاں قرض دینے کی بنیاد رہن کی مالیت کے بجائے متوقع فائدہ مندی پر زیادہ ہوگی۔ نیز زکوٰۃ کے نفاذ سے اس قسم کی بینکاری کا نظام اس بات کی بہتر ضمانت دے گا کہ دولت صرف معاشرے کے امیروں میں ہی گردش نہ کرتی رہے۔

اسلامی بینکاری کے نظام میں اب تک یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ بینک کے تختہ توازن میں واجب الادا (Liability) کی فہرست سے زر کی قیمت (Cost of Fund) غائب ہو جاتی ہے۔ (اگر اسلامی بینک زر کی قیمت کی بات کریں تو یہ کم وبیش یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے سودی ذہن سے آزادی حاصل نہیں کی)۔ البتہ ماضی میں زر کی قیمت کا حساب کیا جاسکتا ہے جو حسابی نقطہ نظر سے کاروبار کی فائدہ مندی کے برابر ہوگی۔

صدیقی کے خیال میں اسلامی بینکاری میں بھی تخلیق زر (جس کو وہ تخلیق قرض Credit Creation) کی معروف اصطلاح کا نام دیتا ہے) کیا جاسکتا ہے مگر یہ وہ کہتا ہے کہ اسے اچھے مقاصد کے لئے ہونا اور زیر کنٹرول ہونا چاہیے:

”سودی غیر موجودگی میں..... بینک صرف پیداواری کاروبار کے لئے ذریعہ کارے گا۔ قرض کی تخلیق صرف اس حد تک کی جائے گی جہاں تک پیداواری کاروبار کے ذریعہ مزید دولت تخلیق کرنے کے حقیقی امکانات موجود ہوں..... نفع کی شراکت کی بنیاد پر تخلیق کردہ قرض افراط زر پیدا نہیں کرے گا۔ نفع میں شراکت کی طلب قابل حصول وسائل کی حد تک محدود ہوگی اور بینک کی تخلیق قرض کی اہلیت کو عمل میں لانے کی ضرورت اس طلب کی حد تک ہوگی اور یہ اس پابندی کے تحت ہوگی جو بینک کے نفع کی

امید سے پیدا ہوگی۔ اس صورت میں خود رسد اپنی ہی طلب کو تخلیق نہیں کر سکے گی جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔“

(Siddiqi, M.N., " Issues in Islamic Banking," 1983, P. 55)

راقم الحروف (مصنف) کو صدیقی سے اس آخری نکتہ پر اختلاف ہے۔ کوئی بھی جائیداد پر مالی قیاس آرائیاں کرنے والا ابتلا دے گا کہ مارکیٹ میں تیزی (Boom) کے دوران بینک سے قرض لینے کی طلب کی کوئی حد نہیں اور چونکہ بینک بغیر کسی لاگت کے انتہائی بڑی مقداروں میں تخلیق قرض کر سکتے ہیں رسدان کی حد بندی نہیں کر سکتی۔ اگرچہ قرض میں بذات خود کوئی خرابی نہیں مگر مسئلہ دراصل لفظ زر (Money) اور قرض (Credit) کو آپس میں خلط ملط کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ جب کوئی بیوپاری کسی کو کوئی چیز بیچتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی ادائیگی تیس دن کے اندر کر دینا تو اس نے ایک قرض دیا ہے (جو غیر بینکی قرض ہے) مگر اس کا روائی سے تخلیق زر نہیں ہوا۔ اس لئے مصنف کو صدیقی کے تخلیق زر کے نظریہ سے اختلاف ہے۔ مگر مصنف مندرجہ ذیل سے اتفاق کرتا ہے کہ:

”اسلامی ماہرین معاشیات کے نزدیک بینکی قرض اور زر ہدف تفتیش ہیں۔ سلف کے لوگ ان کو اخلاقی طور پر غلط سمجھتے تھے۔ بعض

تو اس کی ضرورت کو ہی مشکوک سمجھتے تھے اور اس کے پھیلاؤ کو بینکوں کے اپنے مفاد کے ساتھ منسوب کرتے تھے۔ ماضی قریب میں

یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ سود فساد کی جڑ ہے۔ سود کے خاتمہ سے بینکوں کے تخلیق قرض کے نقصان وہ پہلو میں کافی حد تک کمی آئے گی۔“

(Siddiqi, M.N., " Issues in Islamic Banking," 1983, P.19)

سود بنڈرنے کی اہلیت نہ ہو تو بینک تخلیق زر سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر پائیں گے۔ مجموعی طور پر نفع اور نقصان میں شراکت سے صرف موجود زر کے مجموعے کی ہی نئی تقسیم ہوتی ہے اس میں نمو نہیں ہوتی۔ یہاں اگر کسی سرمایہ کاری کے دورانیہ کے آغاز میں کسی معیشت میں زر کی مجموعی رسد 500 پونڈ ہو تو اس دورانیہ کے اختتام پر نفع میں شراکت والے سرمایہ کاروں کی ادائیگی کے لئے ضروری نہیں کہ رسد 500 پونڈ سے زائد موجود ہو۔ لیکن جہاں 500 پونڈ کی رسد بینکی زر سے ہو تو 10 فیصد سالانہ سود کے ساتھ قرض کی ادائیگی کے لئے سال بعد 550 پونڈ کا موجود ہونا لازمی ہے۔ آخر کار بات وہی ہے کہ اگر سود نہ ہو تو تخلیق زر کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ آج قرض دینے کے لیے 500 پونڈ کی تخلیق کیوں کی جائے اگر کل کو 500 پونڈ ہی ادائیگی کے لئے حاصل ہوں گے؟ یہی ایک حقیقت اسلامی بینکوں کے مغالطہ کو آشکارا کرتی ہے جو روایتی بینکوں کی طرح بغیر کسی بنیاد کے (عدم سے) تخلیق زر کر کے پھر اس

تخلیق کو نفع کی شراکت پر مبنی ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔

افراط زر اور تفریط زر کا سب سے اہم سبب ہی زر کی رسد میں اتار چڑھاؤ ہے۔ اگرچہ اسلامی اصولوں پر چلنے والی معیشت میں بھی بعض مخصوص اشیاء کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے مگر صرف بعض قیمتوں میں زیادتی ضروری طور پر افراط زر کو ظاہر نہیں کرتی چونکہ افراط زر کا مطلب ہے کہ پوری معیشت میں قیمتیں بڑھ جائیں نہ کہ صرف چند شعبوں میں قیمتوں کی زیادتی ہو۔ مثال کے طور پر ہوائی سفر میں اضافہ کی وجہ سے ہوائی ٹکٹ کی قیمت بڑھ سکتی ہے مگر اس کے ساتھ بس کے سفر میں کمی ہونے سے بس کے ٹکٹ کی قیمت کم بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر قیمتیں مستحکم ہی رہتی ہیں۔ جہاں زر میں پھیلاؤ نہ ہو وہاں پوری معیشت میں اخراجات کی زیادتی نہ ہونے کا رجحان ہوتا ہے (اگرچہ مستحکم زر کی رسد کے باوجود زر کی گردش میں تیزی سے بھی افراط زر ممکن ہے۔) نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ اسلام قیمتوں میں خاص قسم کے اتار چڑھاؤ کے خلاف برسرِ پیکار نہیں۔ درحقیقت قیمتوں میں لچک صحت مند معیشت کے لئے لازمی ہے۔ جہاں اور جب ضرورت ہو طلب کو قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے عمل کے بغیر پورا کرنا آسانی سے ممکن نہیں۔

اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معیشت میں تیزی (Boom) افراط زر اپنے ساتھ لاتی ہے۔ روایتی ماہرین معاشیات اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ معاشی تیزی (Boom) بڑی مقدار میں زر کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں ہی تو آتی ہے۔ مگر اسلامی معیشت میں عموماً زر میں پھیلاؤ کے بغیر ہی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے جس کی حقیقی وجوہات مثال کے طور پر ٹیکنالوجی میں ترقی اور بہتر ہنرمند کارندے ہو سکتے ہیں۔ پیداوار میں اضافہ عموماً بتدریج ہوتا ہے کیونکہ حقیقی انسانی محنت فوری طور پر نتائج پیدا نہیں کرتی اور نہ ہی زر کی فوری صنعتکاری کرتی ہے۔

یہ دلیل کہ زر کی رسد میں نمو تجارت میں اضافہ کے لئے ضروری ہے کسی طرح بھی ثابت نہیں۔ مثلاً رسد میں عدم پھیلاؤ کی موجودگی میں کثرت سے نئے مال کی پیداوار کے نتیجہ میں عموماً قیمتوں میں کمی واقع ہوگی۔ ایسے نتائج کا نمونہ (Model) رابرٹ بارو (Robert Barro) نے اپنے مشہور

مقالے "Money and the Price Level Under the Gold Standard, The"

"Economic Journal, March 1979" میں پیش کیا ہے۔ لمبے عرصہ تک قیمتوں کی کمی کے ساتھ پیداوار میں اضافہ سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ سودی معیشت کے نظریات سے اتنے زیادہ مختلف ہیں کہ ان کے مجموعی طور پر معاشرہ میں نتائج معلوم کرنا مشکل ہے۔ جس معاشرہ میں وقت کے ساتھ قیمتوں میں کمی متوقع ہو وہ موجودہ اصراف کو مستقبل کے اصراف کے مقابلہ میں شاید زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آج کارکیونکر خریدی جائے اگر ایک سال بعد سستی اور بہتر کارمل جائے گی؟ اسلامی معیشت میں صبر کے لئے انعام ہے اور اصراف کی حوصلہ شکنی۔

غیر سودی زر کی رسد

(An Interest-Free Money Supply)

جب بھی یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ معاشرہ کو سونا اور چاندی کو بطور زر استعمال کرنے کی طرف رجوع کرنا چاہیے تو نقد وہی اعتراض شروع کر دیتے ہیں جن کا تیسرے باب میں جائزہ لے کر رد کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ صرف تکنیکی پہلو کے پیش نظر ہی ان کے بہت سے دلائل بیکار ہیں۔ دوسری جانب جب ایک مسلمان الہامی علم کی نظر سے دیکھتا ہے تو ان میں سے ان کے کچھ دلائل اور بھی ناقابل قبول دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلامی احکامات پرانے ہو چکے ہیں اب انہیں کسی طرح جدید بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن پرانا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ موزوں نہیں رہے۔ قرآن اور سنت پرانے ضرور ہیں مگر وہ ہمیشہ کے لئے موزوں ہیں۔ اسی لیے اب مزید وحی کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ مسلمان کو کبھی بھی یہ نہ کہنا چاہیے کہ سونا اور چاندی کو بطور کرنسی استعمال کرنا غلط ہے۔

راقم الحروف (مصنف) کے تصور میں ایک ایسا زرعی نظام ہے جس میں صرف بینکوں اور سرکار کو ہی نہیں بلکہ ہر شخص کو زر تخلیق کرنے کا حق ہے اور یہ بالکل بنیادی بات ہے۔ اس جدید زرعی نظام کے تحت ہر شخص جائے اور زر کو زمین سے کھود نکالے۔ اس طرح زمین سے جتنا سونا نکلے گا اگر وہ اس سونے کی مقدار سے جو زمین سے نکالنے پر خرچ ہوئی ہے سے زیادہ ہوگا تو نیا زر تخلیق ہو جائے گا۔ یہ بالکل آسان سی بات ہے اور زر کی رسد کے لئے مارکیٹ کے طریقہ کے مطابق بھی ہے اور یہی انگلستان کی روایتی معاشیات بھی ہے۔ یہ ایسا نظام ہے جس سے قیمتوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

سود کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی محنت کے بغیر آ مرانہ طور پر تخلیق زر سے۔ اگر کوئی پلاٹینم کو کھود نکالنا چاہے تو وہ بھی ایسا کرنے میں آزاد ہے۔ اس نظام کے تحت حکومت کا کردار صرف وزن اور پیمائشوں کی نگرانی کرنا ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ منظور شدہ معیار اپنائے جائیں۔

جب لوگوں کو زر کے انتخاب میں صحیح آزادی ہوگی، جب قانونی ٹنر (Legal Tender) کا کوئی قانون نہ ہوگا جس سے لوگوں کو زر کے انتخاب پر مجبور کر دیا جائے اور بینکی زر کی مصنوعی طلب کے لئے کوئی سودی نظام نہ ہوگا تو تاریخ بتلاتی ہے کہ زر کے لئے لوگ سونے اور چاندی کا ہی انتخاب کریں گے۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو اشیاء کی محبت انسان کے اندر ودیعت کر رکھی ہے۔

”لوگوں کی محبت کے مرغوبات نفس میں ہیں عورتیں بیٹے سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے خوب پلے ہوئے گھوڑے

اور زمیں۔“ (آل عمران 14:3)

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کسی مقصد کے لئے پیدا کی ہے اور ابن خلدون کہتا ہے کہ سونا اور چاندی زر کا کام دینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے کان سے نکلنے والے دو پتھر سونا اور چاندی مالی ذخیروں کی قدر کے پیمانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ اس دنیا کے باسی اپنے شوق سے سونے اور چاندی کو ہی بطور خزانہ اور جائیداد سمجھتے ہیں۔ اگرچہ کچھ حالات کے تحت کچھ اور اشیاء بھی ذخیرہ کی جاتی ہیں مگر ان کا مقصد بھی آخر کار سونے اور چاندی ہی کا حصول ہوتا ہے۔ تمام دوسری اشیاء پر مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ کا اثر ہوتا ہے مگر سونا اور چاندی مستثنیٰ ہیں۔ وہی نفع، جائیداد اور خزانے کی بنیاد ہیں۔“

(Ibn Khaldun, "The Muqaddimah" 1967, P. 313)

بینکی ماہرین معاشیات ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ زر قریبی زمانہ کی ترقی یافتہ شکل ہے ان کے مطابق جب انسان نے ترقی کی تو اس نے زرعی نظام کی بھی ترقی یافتہ شکل ایجاد کی۔ اب اگر معاشرہ ان کی بات مان لیتا ہے تو پھر بینکوں کے لئے ایسا زرعی نظام ایجاد کرنا بہت ہی آسان ہو جائے گا جو ان کے نفع کی خواہش کو پورا کرے۔ یعنی ایسا نظام جو زر کے لئے صرف علامتی کاغذ کے ٹکڑوں یا کمپیوٹر کے اعداد و شمار پر مبنی ہو۔ السیوطی نے الفتاویٰ الحاوی کی کتاب البیوع میں ابن ابوشیبہ کی تحریر المصنف کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے مطابق یہ آدم علیہ السلام تھے جنہوں نے پہلا طلائی دینار ڈھالا تھا۔ اگر یہ درست ہے تو پھر زر فقط جدید دور کی ایجاد ہی نہیں۔

صحابہ دینار اور درہم لے سین اوزان کو خوب جانتے تھے۔ اس وقت ادائیگیوں کے لئے سکے استعمال ہوتے تھے اور انہیں شمار کرنے کے بجائے تولا جاتا تھا کیونکہ تعداد کے بجائے دھات کا وزن ہی ادائیگی کی قدر و قیمت کا تعین کرتا تھا۔

ہم نے تیسرے باب میں دیکھا کہ کس طرح انگریزی پونڈ کی حقیقی قدر میں کمی (Debasement) کی گئی اور کس طرح لوگوں نے اشیاء و خدمات کے عوض اصلی زر کے بجائے علامتی زر دینا شروع کر دیا۔ زر ایک ایسی مبادلہ شے ہونی چاہیے جس کی حقیقی قدر آزادانہ طور پر متعین ہو سکے مگر اس کی حقیقی قدر میں کمی (Debasement) کے ذریعہ شہنشاہوں نے قانون کی طاقت سے اس زر کو قطعی طور پر ایک علامتی شے میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور جدید بینکاری نے اس تبدیلی کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ بینکروں نے ایک ایسی چیز پیدا کر دی جس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہ تھی یعنی کاغذ کا ایک ٹکڑا جس کا نام پونڈ کہلایا۔ انہوں نے اس ذاتی قدر سے خالی چیز کو استعمال کرنے پر لوگوں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اس چیز کو جس کو انہوں نے تقریباً بلا کسی لاگت پیدا کر لیا تھا آگے سود پر قرض دے کر فوری نفع حاصل کر سکیں۔ لوگ چونکہ ہمیشہ سے کاغذ پر سونے اور چاندی کو ہی ترجیح دیتے آئے ہیں اس لئے بینکروں نے دھات کے سرکاری زر کو ختم کرنے کے لیے اُسے بے قدر کر کے اس کے بجائے اپنا کاغذ چلا دیا۔ آج کل وہ براہ راست ڈیبٹ (Direct Debit) کی ترویج کے لئے لاکھوں خرچ کر رہے ہیں اور اس طرح ہمیں سرکاری زر کے بجائے بینکی زر استعمال کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور زر محفوظ کی سطح کو جو محفوظ بینکاری کے لئے ضروری ہے کم کرتے جا رہے ہیں اور اس طرح زیادہ سے زیادہ نفع بخش ودیعی مضاعمت (Deposit Multiplier) استعمال کرتے جا رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں زیادہ عرصہ ایسا تھا جس کے دوران انگلستان میں عام لوگوں کے لئے سونے کی دھات خریدنا غیر قانونی تھا۔ اسی طرح روز ویلٹ (Roosevelt) کی 1934ء میں ڈالر کی قدر میں کمی کرنے کے بعد امریکہ میں بھی ایسا کرنا غیر قانونی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کی ممانعت اور جو چیزیں حرام کی گئی ہیں ان کی اجازت ایک صاحب علم مسلمان کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ نظام میں کوئی بہت بڑی خرابی واقع ہو چکی ہے۔

نبی پاک محمد ﷺ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں میں زر کے جو معیاری سکے وجود میں آئے ان میں دینار 4.25 گرام سونے کا تھا اور درہم 2.98 گرام چاندی کا تھا۔ اکتوبر 2002ء کے اوائل کی قیمتوں کے مطابق دینار تقریباً 50 امریکی ڈالر اور درہم تقریباً 0.5 امریکی ڈالر کا تھا۔ یہ قدری تعین ایک اہم مگر اکثر طور پر نظر انداز کیا گیا نکتہ منظر پہ لاتا ہے جس کے متعلق حدیث سے روشنی ملتی ہے۔ اگر سونے اور چاندی کو قدر کے پیمانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تو مکہ اور مدینہ کی 1400 سال پیشتر کی قیمتیں آج کی قیمتوں سے زیادہ مختلف نہ ہوتیں۔ مصنف ڈاکٹر یاسین دتن (Dr. Yasin Dutton) کا شکر گزار ہے جس نے مصنف کی نظر سے زر کا موازنہ گزارا جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

”عروہ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے انہیں بھیڑ خریدنے کے لئے ایک دینار دیا۔ عروہ نے ان کے لئے اتنے پیسوں سے دو بھیڑیں خریدیں۔ پھر انہوں نے ایک بھیڑ ایک دینار میں بیچ دی اور ایک دینار اور ایک بھیڑ نبی پاک ﷺ کے پاس لے آئے۔ اس پر نبی پاک ﷺ نے ان کے لئے ان کی تجارت پر اللہ تعالیٰ سے برکت کی دعا کی۔ چنانچہ عروہ ہر سودے میں ہمیشہ ہی نفع کمایا کرتے تھے خواہ وہ سودا مٹی کا ہی کیوں نہ ہو۔“ (حدیث بخاری: 4.836)

برطانیہ میں آج بھی ایک دینار کی مقدار کے برابر سونے سے بھیڑ خریدی جاسکتی ہے اور اگر کوئی تھوڑی زیادہ کوشش کرے تو اس سے دو بھیڑیں بھی خریدی جاسکتی ہیں۔ کاغذی زر کبھی اور کسی بھی صورت میں اپنی قیمت برقرار نہیں رکھ سکا۔ (صفحہ 91 پر اعداد و شمار دو بارہ ملاحظہ ہوں۔)

”ایمن سے مروی ہے“ میں عائشہؓ کے پاس گیا اور وہ ایک کھردار لباس پہنے ہوئے تھیں جس کی قیمت پانچ درہم تھی۔“ (حدیث بخاری: 3.796)

”..... پھر اونٹ باقی اونٹوں سے آگے نکل گیا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا یہ میرے آگے بیچ دو۔ میں نے کہا اے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ یہ آپ کے لئے (ہدیہ) ہے۔ انہوں صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا میرے آگے بیچ دو۔ میں نے کہا میں نے اسے چار دینار میں خریدا ہے آپ مدینہ تک اس پر سواری کر سکتے ہیں۔“ (حدیث بخاری: 3.504)

”..... انصاری کو دو درہم دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا ایک سے کھانا خرید لینا اور اپنے گھروالوں کو دے دینا اور دوسرے سے ایک کھانا خرید کر میرے پاس لے آنا۔“ (حدیث ابوداؤد: 1637)

”..... کچھ لوگوں نے کہا اگر کوئی شخص 20,000 درہموں میں مکان خریدنا چاہے۔“ (حدیث بخاری: 9.109)

ابتدائی دور میں مسلمان چاندی کے ساسانی سکے استعمال کرتے تھے۔ مگر 79ھ میں چاندی کا اپنا ملکی درہم جاری کیا گیا جو اموی دور کے آخر تک چلتا رہا۔ اس سے پہلے 77ھ میں بازنطینی منقار پہنی

طلائی دینار جاری کیا گیا تھا۔ حکومت کا بنیادی فریضہ ڈھلے ہوئے سکوں کے وزن اور ان کے خالص پن کی ضمانت دینا تھا۔

المقریظی (Al-Maqrizi) کے رسالۃ فی النقود الاسلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے کبھی بھی تانبے کے سکے ”فلوس“ کو مبادلہ کا ذریعہ بنانے کی تائید نہیں کی۔ المقریظی کے مطابق تانبے میں زر کی اکائی ہونے کی مطلوبہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ اغاثہ (Ighathah) میں المقریظی تانبے کے سکوں (تعدادی دراہم ”Dirham of Account“) کی گردش میں بے تحاشا اضافہ کو زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ بتلاتا ہے جس کے لئے وہ مصر کے مملوک سلطانوں کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ وہ اس صورت حال کا موازنہ اس سے پہلے دورانیہ میں بڑھی ہوئی قیمتوں سے کرتا ہے جو فصلوں کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئیں (بالفاظ دیگر زر کی وجہ سے نہیں بلکہ حقیقی وجہ سے پیدا ہوئیں)۔ تعدادی دراہم میں بے حد اضافہ ان کے طلائی دینار کے مقابلہ میں مبادلہ کی قدر کی کمی سے صاف ظاہر ہے جو 803ھ میں 38:1 تھی مگر گر کر 808ھ میں 150:1 ہو گئی المقریظی لکھتا ہے:

”اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی خوشی اور مسرت عطا فرمائے جان لو کہ مصر میں کرنسی جو عام طور پر قابل قبول ہے وہ فلوس ہے۔۔۔۔۔ یہ دور جدید کی بدعت اور آفت ہے۔ جو معاشرہ وحی پر مبنی دین پر ایمان رکھتا ہو اس میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں اور نہ ہی اس کے نفاذ کا کوئی قانونی جواز ہے۔ اسلئے اس بدعت کا موجد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ پچھلے لوگوں کی نقل کر رہا ہے اور نہ ہی وہ کسی انسان کے کسی قول کا حوالہ دے سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کا چین اڑ گیا اس کی آرائش تباہ ہو گئی ساری آبادی میں افلاس اور ذلت چھا گئی۔۔۔۔۔ ایک ارداب (Irdab) گندم کی قیمت 450 تعدادی درہم ہو گئی۔۔۔۔۔ موسم میں تربوز 20 تعدادی درہم کا بکنے لگا۔۔۔۔۔ مرغی کا ایک انڈا 20 تعدادی درہم کا ہو گیا۔۔۔۔۔ ایک رطل ناشپاتیاں 50 تعدادی درہم کی ہو گئیں۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص ان قیمتوں کو سونا اور چاندی کی قیمت کی نظر سے دیکھے وہ سمجھے گا کہ قیمتیں تو صرف معمولی سی بڑھی ہیں۔ مگر جب انہیں فلوس کی افراط جس نے لوگوں کو مصیبت میں ڈالا ہے کی نظر سے دیکھے گا تو وہ جان لے گا کہ یہ خوفناک اور شرمناک برائی ہے جو اتنی مکروہ ہے کہ بتلانے کے قابل بھی نہیں۔“

(Al-Maqrizi, Ahmad Ibn Ali, "Ighathah, tr. Adel Allouche, 1994, P. 77-79)

معاشی اور معاشرتی زندگی پر زری بیماری کے اثرات جو المقریظی نے بیان کئے ہیں ان کا اطلاق آج کے دور پر بھی ہوتا ہے۔ آج ویسی ہی زری بیماری ہمارے اوپر ایک مصیبت بنی ہوئی ہے۔ جس قوم کی توجہ ہر وقت قرض اتارنے پر ہی مرکوز ہو اور جو ہر وقت افراط و تفریط زر کی یکے بعد دیگرے

تباہ کاریوں سے بچاؤ پر ہی تمام قوتیں صرف کر رہی ہو اس کے لئے بھلا زندگی کا کونسا لطف باقی رہ گیا ہے۔
 لوگوں کو سونے کے سکوں کے مقابلہ میں تانبے کا فلوس اپنی طرف راغب نہیں کرتا اس لئے سب
 سے اہم شرط جو پوری کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ فلوس کو کوئی علامتی قدر نہ دی جائے اس کے
 بجائے اشیاء و خدمات کے مبادلہ کے ذریعہ مارکیٹ میں اس کی اپنی قدر کا تعین ہونا چاہیے۔ بالفاظ
 دیگر اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے دس اونس تانبے کے عوض ایک مرغی کا تبادلہ کرنے پر رضامند
 ہے تو کوئی طریقہ کار اس مبادلہ لین دین میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ قانونی طور پر تانبے کے ٹکڑے کو
 مبادلہ واسطے کے لئے زر کی اکائی کی حکمی حیثیت یقیناً نہیں دینی چاہیے یہ وہی طریقہ کار ہے جس کے
 ذریعہ چاندی کے انگریزی پونڈ کو کاغذ کے ایک ٹکڑے میں تبدیل کر کے اس پر ایک پونڈ لکھ دیا گیا۔ ابن
 تیمیہ بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ انہیں بھی تشویش تھی کہ فلوس کی گردش میں پھیلاؤ بے انصافی
 ہے۔ وہ بھی اسی بات کے حق میں تھے کہ تانبے کے سکے کو سرکاری دی ہوئی حکمی قدر کے بجائے اس کو
 اپنی جائز حقیقی قدر ملنی چاہیے۔

”انہوں (ابن تیمیہ) نے سلطان کو کہا کہ زر کی قدر میں کمی کو روکا جائے جس کی وجہ سے معیشت میں خلل پیدا ہو رہا ہے۔ وہ سکوں
 کی حقیقی قدر میں کمی (Debasement) اور زیادہ تخلیق زر کے خلاف تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ سونے اور چاندی کے علاوہ جو سکے
 ڈھالے جائیں ان کی مبادلہ قدر ان کی حقیقی قدر کے مطابق ہونی چاہیے تاکہ لوگوں سے بے انصافی نہ ہو۔“

(Islahi, A.A. "Economic Concepts of Ibn-Talmyyah, 1988, P. 141)

ابن خلدون کے مطابق زر ہی دولت ہے اور معاشی کاروائیوں کا زیادہ تر مقصد اشیاء کے بجائے
 سونا اور چاندی اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔ یہ نظریہ تجارت کی بنیادی خصوصیت کے طور پر تاریخ کے بعد کے
 دور میں نمودار ہوا۔ اس تجارتی نظریہ (Mercantilism) کے مطابق اشیاء کی بیرون ملک فروخت کو
 اس لیے اہمیت دی گئی کہ اس سے قیمتی دھات کی دولت زیادہ اکٹھی ہو سکتی تھی۔ اس زمانے میں خیال
 تھا کہ اشیاء کی درآمد معاشی لحاظ سے پسندیدہ نہیں چونکہ اس سے قیمتی دھات کا اندرون ملک ذخیرہ کم
 ہوتا ہے۔ اس کے دور کے لوگوں میں مسلدن (Misselden) اپنی تحریر "Free Trade, or the
 Means to Make Trade Flourish, 1962" اور ٹامس من (Thomas Mun) اپنی تحریر
 "A Discourse of Trade from England to the East Indies, 1621" میں اسی قسم

کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

اگرچہ لوگ سونا اور چاندی کو خزانہ سمجھتے ہیں پھر بھی یہ کہنا کہ معاشی کاروائیوں کا مقصد ہی اس خزانہ کو جمع کرنا ہے ذرا شدت پسند رائے ہے۔ اسے زندگی کا مقصد ہی بنالینا جو کہ آج کل بعض حلقوں میں پایا جاتا ہے اسلامی نظریے سے تو یقیناً مختلف ہے۔ اسلام میں زر بذات خود مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مگر تجارتی بینکوں کی بنیادی کارروائی کی وجہ سے زر میں جو مصنوعی قلت پیدا کی جاتی ہے اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ لوگوں کی توجہ کا ارتکاز ہر وقت صرف پیسہ بنانے پر ہی کیونکر ہے۔ جس معاشرہ میں قرض کی ادائیگی کے لئے زر کی رسد نا کافی ہو وہاں لوگوں کا رد عمل اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟

زر کی حقیقی قدر میں کمی (Debasement) کی غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی گئی ہے اور اس موضوع پر المقریظی اور ابن تیمیہ دونوں گریٹشیم (Gresham) سے پہلے اپنا بیان دے چکے ہیں۔

”مزید برآں اگر سکوں کی حقیقی قدر ان کی ظاہری قدر سے کم ہوگی تو برے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے وہ کم قدر والے سکوں کا زیادہ قدر والے سکوں سے تبادلہ کر کے زیادہ قدر والے سکوں کو دوسرے ملک میں بیجا کر کم قدر والے زیادہ سکے خریدیں گے اور انہیں واپس اس ملک میں لے آئیں گے۔“

(Ibn-Taimiyah, "Majmu Fatawa Sheik-al-Islam" in Economic Concepts of Ibn-Taimiyah, 1989, P. 143)

جعلی کرنسی تو قدرتی طور پر منع ہے:

”جعلی سکے بنانا لوگوں پر ظلم ہے۔ جو شخص جعلی سکے کی ابتدا کرے گا وہ ان تمام لوگوں کے گناہ اپنے سر لے گا جو اسے آگے لوگوں تک پہنچائیں گے۔“

(Al-Ghazali, The Revivification of the Science of Religion, Vol.2, P.63)

دو قیمتی دھاتوں کو مبادلہ واسطہ (Medium of Exchange) کے طور پر استعمال کرنے سے اسلامی حکومت دو دھاتی زر (Bimetallism) سے پیدا شدہ مسائل سے واقف ہو چکی تھی۔ المعز کے دور حکومت میں مقرر کردہ دو دھاتی تناسب کو اختیار کرنے کی غلطی کے نتائج سامنے آ چکے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ایک دفعہ پھر سکوں کی مبادلہ قدر کے تعین کے لئے مارکیٹ کی قوتوں کے بجائے سرکاری ہاتھ حرکت میں آتا ہے۔ سکوں کی حکمی قدر کا نفاذ ہوتا ہے اور معروف مسائل شروع ہو جاتے ہیں۔

اس دور کے حالات جس طرح المقریظی بیان کرتا ہے انہیں عیدت غزالی (Aidit Ghazali) نے یوں لکھا ہے۔

”دینار کے مقابلہ میں درہم کی قدر پھر کم ہو گئی..... اس سے لوگوں میں بالکل پیدا ہوئی۔ اس معاملے پر حکومت نے نئے درہموں کے 20 بھرے ہوئے صندوق بھجوائے۔ حکمتاً جاری کیا گیا کہ پرانے درہموں سے لین دین بند کیا جائے۔ پرانے درہم سرکاری نکال میں واپس لئے گئے جس کے لئے تین دن کی مہلت دی گئی۔ مبادی نرخ پرانے چار درہموں کے برابر ایک نیا درہم قرار دیا گیا اور نئے درہم اور دینار کا نرخ ادینار = 18 درہم متعین کیا گیا۔“

(Ghazali, A, "Islamic Thinkers on Economics, Administration and Translations, 1991)

صدیقی نے زکوٰۃ کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کرنسی کی بحث کا ایک مختلف مگر اہم پہلو بیان کیا ہے:

”سیولت کا فائدہ سود کا سبب نہیں بلکہ اس کا اثر ہے..... ذخیرہ اندوزی کی حوصلہ شکنی کے لئے اور زر کو دوسرے اثاثوں کے برابر لانے کے لئے اس پاس رکھنے کی ایک قیمت ہونی چاہیے جو کہ سود کی حرمت کے سبب سیولت سے محرومی کے علاوہ ہوگی..... اس کا بنیادی حل یہ ہے کہ باقی تمام اشیاء میں وقت کے ساتھ قدرتی قانون کے مطابق قدر میں کمی کی طرح زر کی قدر میں بھی کمی ہونی چاہیے۔ یہ اسلام کا قانون زکوٰۃ ہے۔ جس کے تحت ایک عام مالک کی نظر میں ہر قسم کی نجی دولت کی قدر میں ہر سال 2.5 فیصد کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سے زر کی ذخیرہ اندوزی کی حوصلہ شکنی ہوگی اور زر گردش میں آئے گا۔“

(Siddiqi, M.N, "Issues in Islamic Banking," 1983, P. 16)

صدیقی کی دلیل سلویو گیسل (Silvio Gesell) کو پسند ہوگی جس نے 1920ء کی دہائی میں یہ تجویز دی تھی کہ زر پر اس کے اجرا کی تاریخ کی مہر درج ہونی چاہیے۔ اس کی اس دلیل نے کینز کی توجہ اپنی طرف مبذول کی:

”(گیسل) کہتا ہے کہ سود خالصتاً ایک زر کی عمل ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دولت کو ذخیرہ کرنے کے لئے اس کی ملکیت اس کے مالک پر کسی لاگت کا بوجھ نہیں ڈالتی بلکہ درحقیقت زر کی معیار کے مطابق کچھ نفع ہی لوٹاتی ہے۔..... وہ کہتا ہے کہ حقیقی سرمایہ کی نمو کو زر کی سودی شرح (The Money Rate of Interest) سے بے اثر کر دیا جاسکتا ہے اور اگر یہ بریک ہٹا دی جائے تو جدید دور میں حقیقی سرمایہ کی نمو اتنی تیز ہوگی کہ فوری طور پر نہیں تو کچھ تھوڑے عرصہ بعد سود کی صفر کے برابر شرح کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ زر کی سودی شرح کو کم کیا جائے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ زر کو پاس رکھنے کی ایک قیمت لگائی جائے جس طرح دوسری غیر پیداواری قسم کی اشیاء کو رکھنے پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے زر پر اجرائی تاریخ کی مہر کی تجویز پیش کی جس کی پروفیسر اردنگ فشر نے بھی توثیق کی۔ اس تجویز کے مطابق کرنسی نوٹ کی قیمت تب بے اثر قرار ہے گی جب اس

پر ہر ماہ مہر لگوائی جائے..... مہر ڈاک خانہ سے خریدی جائے گی جس کی سوزوں قیمت کچھ بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔ مہر والے زر کا نظریہ بہت ٹھوس ہے۔ اس کو درمیانے درجہ کی سطح پر اپنانے کے لئے ذرائع بھی حاصل ہو سکتے ہیں مگر بہت سی مشکلات ہیں جن کا گیسل کو سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صرف زر اپنے ساتھ سیولت کا فائدہ ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کی سیولت کا درجہ باقی سب اشیاء سے زیادہ ہے۔ اس لئے اگر مہر لگانے کے ذریعے کرنسی نوٹوں کی سیولت کا فائدہ ختم کر دیا جائے تو بے شمار اور متبادل پیدا ہو جائیں گے جیسے بینکی زر غیر ملکی زر اور قیمتی دھاتیں۔“

(Keynes, J.M. "The General Theory of Employment Interest and Money," 1936, P. 355-358)

چونکہ زر ایک سودی شرح پر قرض دیا جاسکتا ہے اس لئے زر کو پیداواری کام میں لگانے کے بجائے ہمیشہ انتخاب یہی ہوگا کہ زر کو قرض پر دیا جائے جب تک کہ پیداواری کام سے نفع کم از کم سودی شرح کے برابر نہ ہو۔ ایسی سرمایہ کاری سے نفع کی ہامشی شرح (Marginal Rate of Return)، جس کو کینز کا ہامشی استعدادی سرمایہ "Marginal Efficiency Capital" (MEC) کہتے ہیں، قرض کی سودی شرح سے زیادہ ہونی چاہیے تاکہ تاجر نفع حاصل کر سکے۔ جہاں ایسی امید نہ ہو وہاں تاجر کسی بھی ایسے کام میں قرض لیا ہوا ز نہیں لگائے گا۔

حقیقی اشیاء یا پیداواری کام میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے گیسل کے مطابق زر کو پاس رکھنے کی قیمت ادا کرنی چاہیے جو کرنسی پر مذکورہ بالا مہر لگانے کا طریقہ اپنانے سے کی جاسکتی ہے۔ گیسل کی تجویز کردہ تاریخ والی مہر کی شرح زر کی ظاہری قدر کا 5.2 فیصد ہونا چاہیے۔ کینز 5.2 فیصد شرح کو اگرچہ اپنے زمانہ کے حالات میں زیادہ خیال کرتا ہے مگر دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ مصرف میں نہ آنے والے زر پر ٹیکس ضرور لگنا چاہیے اور چونکہ زر کی سرمایہ کاری سے نفع ہوتا ہے اس لئے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ مہر لگانے کی کارروائی سود کے اثر کے خلاف سرمایہ کاری کے لئے ایک محرک ہی نہیں بلکہ یہ سود کی موجودگی یا غیر موجودگی میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہے۔ صدیقی کے مطابق یہ ہماری مالیاتی کارروائیوں کو طبعی دنیا کے زیادہ قریب لاتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔

گیسل کی تجویز کی اپنی مشروط تائید تو کینز بھی کرتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ جب مہر کے حامل کرنسی نوٹوں کو گراں خیال کرتے ہوئے لوگ انہیں اپنے پاس بطور دولت کے ذخیرہ رکھنے سے گریزاں ہوں گے تو اس سے بچنے کے لئے بہت سے اس کے نعم البدل بھی پیدا ہو جائیں گے اور وہ اس پہلو کو نظر انداز

کرنے پر گیسل پہ تنقید کرتا ہے۔ کینز کہتا ہے کہ دوسری ہر شکل کی دولت پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے مثلاً بینک میں جمع شدہ رقوم، زیورات اور قیمتی دھاتیں بھی زیر ٹیکس ہوں۔ پھر کینز بھلا زکوٰۃ کے متعلق کیا کہے گا؟ چونکہ زکوٰۃ تو نہ صرف زر بلکہ زر جیسی ہر قسم کی دولت پر خواہ کسی بھی شکل میں ہو 2.5 فیصد شرح سے لاگو ہوتی ہے کیا اس سے بعینہ وہی نتائج حاصل نہ ہوں گے جن کی گیسل اور فشر حمایت کرتے ہیں؟

بیان کئے گئے اسلامی بینکاری اور زرری نظام کے تحت زر کی رسد اور قرض کے درمیان حسابی امتیاز (Accounting Identity) ختم ہو جائے گا چونکہ سودی قرضوں والے نئے تخلیق شدہ زر سے سرمایہ کاری کے بجائے موجودہ زر ہی نفع اور نقصان کی بنیاد پر سرمایہ کاری کے لئے استعمال ہوگا اور زر کی رسد کو پہلے سے متعین سودی شرح کے مطابق نمونہ پر ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ زر کے مذکورہ دو متبادل یعنی اسلامی اور سودی نظاموں کی کارکردگی کے درمیان ابھی تک اس بنیادی فرق کو وسیع پیمانے پر تسلیم نہیں کیا گیا۔

اسلامی نظام میں سرکار کا کام یہ ہے کہ وہ حقیقی زر (Intrinsic Money) پیدا کرنے والوں پر درست معیار قائم رکھنے کی تحقیق اور توثیق کرے۔ یہ وہ زر ہوگا جس کی قدر قانون کی طاقت کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ لوگوں کے آزاد انتخاب کے مطابق ہوگی۔ یہ زر کسی ایک شے کی شکل میں ہو سکتا ہے یا مختلف اشیاء کے مجموعہ کی شکل میں ہو سکتا ہے جس کو اختیار کرنے کے دو اہم اصول ہیں یعنی سود کی عدم موجودگی اور قدر معلوم کرنے کی آزادی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قانونی اور عملی رکاوٹیں دور کی جائیں مثلاً قانونی زر کے پھیلاؤ کے لئے سودی ادائیگی کی ٹیکس سے آزادی جس کی بدولت بینکاری کے اداروں نے اپنا نظام معاشرے پر مسلط کر رکھا ہے۔ اگر ہم اپنے دور کے قرض اور زرری بحرانوں سے نکلنے کے لئے انہی اداروں کی طرف رجوع کریں تو وہ تو ہمیں ایسے حل بتلائیں گے جو یقیناً علاج ہیں ہی نہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے سگریٹ بنانے والا سگریٹ پینے والے کو سگریٹ چھوڑنے کے بجائے کھانسی کا شربت پینے کی ہدایت کرے۔ ان اداروں سے ہمیں بہت خوبصورت اعلانات تو ملیں گے جیسے زرری اتحاد نئی ابتدا اور ایسے اور بے شمار نعرے، مگر ہم حقیقی تبدیلی کبھی نہ دیکھ سکیں گے جس کے لئے ہمیں ایک بالکل ہی

مختلف ڈاکٹر کی ضرورت ہے جو خود بیماری میں مبتلا نہ ہو اور سودی ترغیب دینے والوں کے اعلانیہ عناد کے مقابلے میں ہمیں اس کی ہدایات کو سننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے اس پر اعتماد کی ضرورت ہے۔



حاصلِ کلام (In Conclusion)

اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ تجارتی بینکاری کی نمو کا حقیقی اور سب سے بڑا سبب وہ نفع تھا جو سود پر قرض دینے کے لئے تخلیق زر کی کارروائی کے نتیجہ میں ملتا تھا۔ بینکاری ایک صنعت تھی جس کی پیداوار زر تھا۔ آج کے جدید دور میں بھی بینکاری کا وہی محرک بڑے نفاست سے مصروف عمل ہے۔ اپنے گھر میں کوئی شخص اگر تخلیق زر کرے (کرسی چھاپے) تو وہ گرفتار کیا جاسکتا ہے مگر تجارتی بینکاری کے نظام کو وہی کام کرنے کا مکمل قانونی تحفظ ملتا ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں!

قومی قرض کے سود کی ادائیگی کے لئے امریکی سرکار ہر سال سینکڑوں ہزاروں لاکھوں ڈالر خرچ کرتی ہے۔ دوسری امیر قومیں بھی اسی طرح اپنے قومی قرض کے سود کی ادائیگی پر انتہائی بڑی رقوم صرف کر رہی ہیں۔ اولاً تو اس قرض کا وجود ہی نہیں ہونا چاہیے اور اس پر سود کی ادائیگی تو بالکل ہی غیر ضروری ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک (Third World Countries) تو اس میں جکڑے ہی جا چکے ہیں جس کے بدنتائج تو بالکل عیاں ہیں۔ وہ اس سے آزاد ہونے کے لئے مغربی دنیا کے زر کی بے بنیاد صنعتکاری نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس اپنی معاشی بقا کے لئے ترقی یافتہ دنیا کو ایک وسیع پیمانے پر اپنے وسائل برآمد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ورنہ وہ مزید قرض میں ڈوبتے ہی جائیں گے۔

اپنی موجودہ شکل میں تجارتی بینکاری کا نظام پورے معاشرے پر ایک قیمت مسلط کرتا ہے یہاں تک کہ ایسے لوگ جن کے سرمائے کا بینکاری کی دنیا اور قرض سے واسطہ نہ بھی ہو وہ بھی اس سے نہیں بچ سکتے۔ جزوی زر محفوظ کی بینکاری ہی جدید دور کے افراط زر کی بڑی وجہ ہے اور قرض دینے کے جو معیار مستعمل ہیں وہ مالی قیاس آرائی پٹنی معیشت میں تیزی کی حوصلہ افزائی اور دولت میں بڑی سطح پر عدم مساوات پیدا کرتے ہیں۔

خطرات ہمیشہ سے ہی معاشرے کے ساتھ رہے ہیں جو اس کی دولت کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہوں اور معاشرہ ان سے بچنے کے لئے ایسی ترکیبیں اختیار کرتا رہا ہے جن سے یہ خطرات کم سے کم ہوں۔ مگر جہاں تک ہمارے زرعی انتظامات کا تعلق ہے ہم ایک ایسے نظام میں جکڑے جا چکے ہیں جو استوار ہی غیر مستحکم بنیاد پر ہوا ہے اور معاشرے کو مزید خطرات میں دھکیلتا ہے۔ اس سقیم زرعی نظام پر عمل درآمد سے حقیقی دنیا پہ بُرے اثرات وسیع پیمانہ پر بڑھ سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ نظام بذاتِ خود ہی معاشرے کے لئے خطرے کا سبب بن گیا ہے۔

جدید بینکاری اور سرمایہ کاری کے اندر جو خطرات پنہاں ہیں ان کو جاننے کے باوجود بھی سیاستدان اس کے استحکام کی جنگ لڑنے پر مجبور ہیں۔ وہ اس جنگ کو زرعی پالیسی (Monetary Policy) کا نام دیتے ہیں۔ یہی تو وہ پالیسی ہے جس کو راقم الحروف (مصنف) تسلیم نہیں کرتا۔ راقم الحروف ایسی کرنسی کی حمایت کرتا ہے جو اپنی حقیقی قدر (Intrinsic Value) کی خود حامل ہو۔ جس کی صنعتکاری بینکوں کی اجارہ داری یا کسی سرکاری خواہش کے حکم سے نہ ہو سکے۔ زر کی قوت خرید کو حقیقی عوامل (Factors) تو تبدیل کر سکیں مگر ایسا کرنے کا اختیار مالی اداروں کو ہرگز نہ ہو۔

کینز نے گیسل کے متعلق کہا ہے کہ سائنسدان کو جتنا زیب دیتا ہے اس نے اس سے زیادہ جذبات کا اظہار کیا۔ سائنسدانوں کے جذبات بھی بڑھ جاتے ہیں جب انہیں جدید معاشیات کی قبیح عدم مناسبت کا سامنا ہو۔ صورت حال یہ ہے کہ جزوی زر محفوظ کی بینکاری تو بغیر کسی چیلنج کے جاری و ساری ہے اور آرمراڈ (Ormerod) ہمیں بتلاتا ہے کہ علمی ادارے جن مباحث میں الجھے پڑے ہیں ان کی مثالیں ہیں ”تسلسل کی حد تک نیم تسلسل کی بالائی سطح“ (Upper Hemicontinuity at the Continuum Limit) اور ”ایجنٹوں کی نسبی خطرہ سے بچاؤ کی شرح قدر کا اکائی سے کم ہونے کا نظریہ“ (The Hypothesis that Agents' Relative Risk Aversion Coefficients are Smaller than one) چنانچہ جدید دور کی پیچیدگیوں کو پیچیدہ فارمولوں سے بیان کرنے کی کوشش نے معاشیات کے مقصد کو ہی غلط فہمی کا شکار کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماہرین معاشیات یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں کہ نظام کس طرح بے انصافی کے طریقے پر عمل پیرا ہے۔ وہ تو صرف اسے مزید آگے بڑھانے کی تجاویز پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمیں تجزیہ کاروں کی مانند کمپیوٹر ماڈل کے

ذریعے دنیا کے مستقبل یا اس کے رخ اور نتائج کی پیشگوئیاں کرنے پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں معیاری طرز پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

آج کے دور میں معاشی نمو کو ہی حکومتوں کا منتہی مقصود سمجھا جاتا ہے اور قرض کے اوپر سود کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش میں مبتلا معاشرے کے سر پر یہ مقصد تھوپا جاتا ہے۔ جب کہ قرض تو سود مرکب کے ذریعہ لامحدود دیت کی طرف بڑھتا ہے مگر طبعی دنیا میں ہر ایک چیز فرسودہ ہو کر صفر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ راقم الحروف (مصنف) کے خیال میں ہم اس مرکب سود کی دوڑ (جس کو ہم جیت ہی نہیں سکتے) کی قیمت ایسی دنیا کی شکل میں ادا کریں گے جو قدرتیجا زیادہ آلودگی اور وسائل کی قلت کا شکار ہوتی چلی جائے گی۔

اگر سود نہ ہو تو ہماری محنت انتقال دولت کے بجائے تخلیق دولت پر صرف ہوگی۔ مطلق سودی شرح کے بجائے باہمی فائدہ کے لئے کاروبار اپنے نفع میں سرمایہ کار کو شریک کرے گا۔ زائد قوت قرض (Leverage) کے استعمال کرنے کا رواج زیادہ تر غائب ہو جائے گا اور ساتھ ہی ہمارے دور کی مالی قیاس آرائی کی ذہنیت بھی ختم ہو جائے گی۔ ماحولیاتی تحفظ کے لئے کاروبار کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ اسے فراموش نہیں کرے گا۔ چھوٹے کاروبار پھلے پھولیں گے اور قرض کے بل بوتے پر تراشے ہوئے بت آہستہ آہستہ مٹ جائیں گے۔

راقم الحروف (مصنف) کا ذاتی خوف یہ ہے کہ ہر شہر کا بڑا بازار بڑے بڑے بینکی اداروں کی گمنام تعمیرات کے علاوہ اور کچھ بھی پیش نہیں کرتا جو جزوی زیر محفوظ کی بینکاری کے نظام کے نفع سے بنائی گئی ہیں۔ شاید یہ اس انجام کی نشاندہی کر رہی ہیں جس کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں اور یہ انسانی صنعت کے مقابلے میں بینکاری کی جیت ہے۔ یہ وہ انجام ہے جس کی کو بیٹ (Cobbett) اور سوڈی (Soddy) نے پیش بینی کی تھی۔ کو بیٹ کو سچائی کے اظہار نے قید خانے میں پہنچا دیا اور سوڈی کے باعزت ذریعہ معاش کا خاتمہ خفت آمیز طریقے سے ہوا۔ ان کے دشمن بہت طاقتور تھے جو اپنے ناجائز فائدے گوانا نہیں چاہتے تھے۔ اب تک دہائیوں پہ پھیلی ان کی گرفت تو اور مضبوط ہو چکی ہے ان کا سیاسی رسوخ گہرا ہو چکا ہے اور ان کی تحریروں کی ہمارے تعلیمی اداروں میں بھر مار ہو چکی ہے۔

معاشی میدان میں اتنی زیادہ تجاویز کی بھرمار ہوتی ہے کہ ان میں سے انتخاب کے لئے سیاستدانوں کے پاس بہترین متبادل کو پہچاننے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ روایتی محکموں کی دوستی میں گھرے ہوئے سیاستدانوں پر روایتی نظریات کی مسلسل بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنی اگلی تقرری سے پیشتر انہی نظریات کو طوطوں کی طرح لوگوں کے سامنے دہراتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے رائج الوقت معاشی نظریات، سودی شرح، زری پالیسی، خود غرض معاشی انسان کے نظریات اور حقیقی قدر سے محروم معاشیات کا تسلسل محفوظ طور سے برقرار رہتا ہے۔

اسلامی سرمایہ کاری ایسی پیداوار (Product) نہیں جو موجودہ مارکیٹ کے کسی جھروکے میں نصب ہو سکے۔ یہ پورے نظام جس کو ہم اسلامی معاشرہ کہتے ہیں کا ایک حصہ ہے ایسا نظام جس کی صحیح کارکردگی کے لئے دوسرے سارے نظام مل کر کام کرتے ہیں۔ اسلامی زری نظام کسی واحد نجی شعبے میں نافذ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے حکومت کو آگے بڑھنا ہے کیونکہ قانونی زر (Legal Tender) کے مطلب کی از سر نو تعریف متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں رائج الوقت زری نظام کو کسی نہ کسی طرح الٹانا چاہیے۔ ہمیں ادائیگی کے ایک ترسیلی نظام، حفاظتی تحویل پیش کرنے والی خدمات اور سرمایہ کاری کے لئے مشاورتی خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ سب چیزیں ضرور ہونی چاہئیں مگر نفع حاصل کرنے کے لئے تخلیق زر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

تمت بالخیر
وماتوفیقی الا باللہ

ڈاکٹر منیر احمد

مترجم کا نوٹ

مندرجہ بالا آخری پیرا گراف میں اسلامی معاشرے اور حکومت کے بارے میں منصف کے ریمارکس نہایت ہی اہم ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اسلامی معیشت کے نفاذ کے لیے اسلامی معاشرے کا قیام بہت ضروری ہے جس میں اسلامی شریعت مکمل طور پر نافذ ہو، جہاں غیر اسلامی افکار و قوانین کی گنجائش نہ ہو، جہاں اخروی بھلائی کو دنیوی مفاد پر مقدم رکھا جائے۔ الہی حکامات پر عمل درآمد ہوگا تو تب ہی سودی قرضوں اور ناجائز حلقہ زر کا خاتمہ ہو سکے گا۔ سوال یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے نظام کیسے قائم کیا جائے؟ اور ایسا نظام کون قائم کرے گا؟ امت مسلمہ پر بالعموم اور اہل فکر حضرات پر بالخصوص اس سوال کا حل تلاش کرنا لازم ہے۔



تعارف کتاب:

یہ کتاب انگریزی تصنیف ”The Problem with Interest“ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں بڑے واضح اور تفصیلی دلائل سے بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے تخلیق کردہ زر کا سودی نظام کائنات پر محیط فطری طبعی قوانین سے کبھی طور پر متصادم ہے۔ اُس غیر فطری سودی نظام کو اپنانے سے معیشت عدم استحکام کا شکار رہتی ہے۔ نتیجتاً انسانی معاشرے کو جو معاشی تکالیف آج درپیش ہیں وہ سود ہی کی بدولت ہیں۔ قدیم طلائی زر سے لے کر آج کل کے کاغذی زر کی مختلف اقسام تک کے ارتقائی مراحل پر سیر حاصل تبصرہ کر کے واضح کیا گیا ہے کہ حقیقی قدر سے خالی رائج الوقت کاغذی زر کی تمام تر قباحتوں کی پشت پر سود ہی کا عنصر کارفرما ہے۔ اُس لائحہ عمل کی نشاندہی کی گئی ہے جس کو اپنا کر معیشت سے سود کا عنصر خارج ہو سکے تاکہ ملکی اور عالمی سطح پر معیشت میں فطری استحکام پیدا ہو اور اُس کے پیدا کردہ مصائب سے انسانی معاشرے کو نجات حاصل ہو جائے۔ کتاب کے آخر میں رائج الوقت اسلامی بینکاری کو زیر بحث لا کر غیر سودی بینکاری کا ایک اجمالی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ کتاب ایک منفرد تحقیقی پیش کش ہے۔

تعارف مصنف:

طارق الدیوانی انگلستان میں ایک مصری مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ وہ یونیورسٹی آف لینکاسٹر (انگلینڈ) سے فارغ التحصیل ہیں اور رائج الوقت معاشیات کے ساتھ ساتھ اسلامی معیشت کا عمیق علم رکھتے ہیں۔ مالیاتی مارکیٹوں میں کئی سال بطور نمائندہ کام کرنے کے علاوہ مالیاتی حسابات پر لیکچر بھی دیتے رہے ہیں۔ 1995ء سے 1998ء تک لندن میں اہم مالیاتی اداروں کے لئے اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق سرمایہ کاری کے منصوبے تیار کرتے رہے۔ بعد میں انہوں نے اپنی ایک علیحدہ مشاورتی کمپنی قائم کی جس کے ذریعے وہ اسلامی سرمایہ کاری اور بینکاری کے متعلق مشورے فراہم کر رہے ہیں اور ان اہم موضوعات پر متعدد کتب تصنیف کر چکے ہیں۔ عالمی سطح پر انہی موضوعات پر لیکچر، سیمینار اور قلیل المدت کورس پیش کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اُن کی مذکورہ بالا انگریزی کتاب سب سے پہلے 1997ء میں برطانیہ میں شائع ہوئی جو ایک نہایت ہی معرکتہ آراء تحقیق ہے۔

تعارف مترجم:

ڈاکٹر منیر احمد 1942ء میں سیالکوٹ پاکستان میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی کی ابتدائی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تعلیم کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ 1973ء میں امریکہ جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ 2001ء میں پنسلوینیا سٹیٹ یونیورسٹی سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوئے اور اب لاہور میں قیام پذیر ہیں۔ سود سے نجات کیسے حاصل کی جائے اور اُس کی عملی شکل کیا ہو یہ اُن کی دلچسپی کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ مذکورہ بالا انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ اُس کا عملی مظہر ہے۔